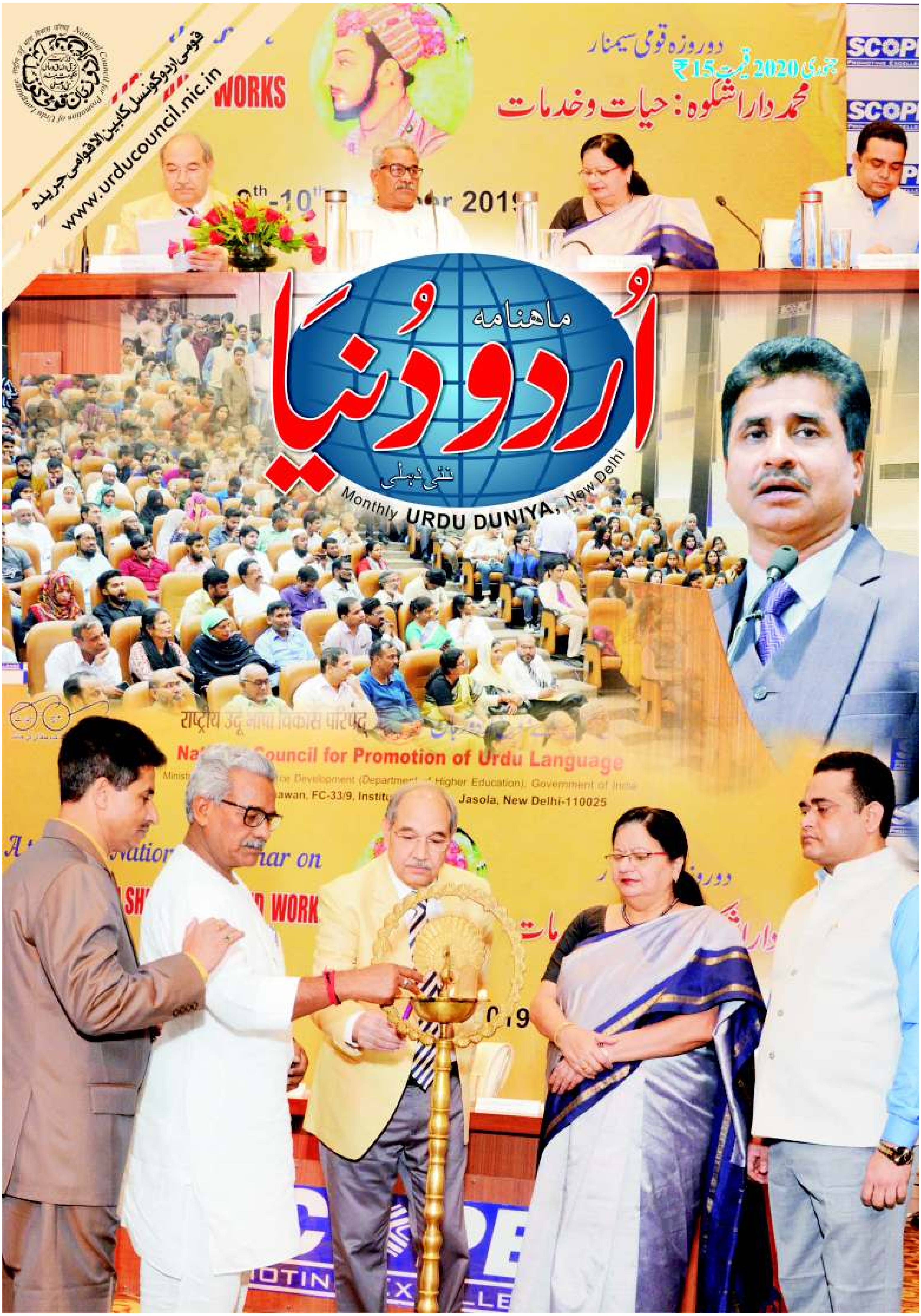
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
جنوری 2020 قیمت 15₹
دوروزہ قومی سیمنار
محمد داراشکوہ: حیات وخدمات
ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
Council for Promotion of Urdu Language
Jasola, New Delhi-110025

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

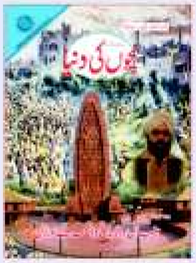

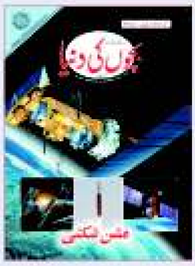

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ **اردو دنیا** نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22، شمارہ:01، جنوری 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

کور اسٹوری:

محمد دارا شکوہ: حیات وخدمات — عبدالرشید اعظمی — 7

نقد و نگاہ

اختر الایمان کی شاعری میں وقت کا حوالہ — مظفر حسین سید — 19

علامہ شبلی کی شعری کائنات در سیاقی تناظر میں — سید یحییٰ نشیط — 22

اردو میں غیر منقوط کتابیں — محمد جمیل اختر جلیلی ندوی — 25

کلیم الدین احمد کا نظریۂ نقد — سہیل انور — 29

شخصیت

اسماعیل آذر — سعید رحمانی — 33

قومی یکجہتی اور نذیر بنارسی — نسیم بن آسی — 36

گوشۂ ترجمہ

ترجمہ میں مداخلت اور ثقافت — محمد طارق — 38

کیا مشینی ترجمہ انسانی ترجمہ کا متبادل ہوسکتا ہے؟ — وسیم احمد علیمی — 42

شرار جستجو

ہے تنگ خلائق وہ جو شاعر

ہونٹوں چور — وکاس گپتا — 45

نیا آسمان نئے ستارے

رپورتاژ 'ایک ہنگامہ' اور 'بمبئی سے بھوپال تک' کا تقابلی مطالعہ — محمد انصر — 48

اردو سائنس میں ہیئت کے تجربے — آیات اللہ آیت — 52

یاد رفتگاں

مسرور جہاں

تہذیبی اقدار کے آئینہ میں — رضیہ خاتون — 54

تہذیبی اقدار کا شاعر: حمایت علی شاعر — محبوب خان اصغر — 57

تہذیب و ثقافت

سیر گل فروشاں — ضیاء الرحمن غوثی — 59

رانچی کے مشاعروں کی تاریخی حیثیت — نصیر افسر — 62

خصوصی گفتگو

عظیم شاعر جمشید مسرور سے ایک پر کیف مصاحبہ — جلیل بازید پوری — 64

کمپیوٹر

تبصرے اور حوالہ جات — 66

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ — 69

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 77

ہماری بات

نیا سال اور یومِ جمہوریہ قارئینِ اردو کو مبارک!

نئے سال کی صبح کے طلوع ہونے کا ہم سب کو انتظار رہتا ہے، اس لیے کہ ہمیں یہ امید ہوتی ہے کہ نیا سال ہماری زندگی میں خوشیاں لائے گا، کچھ نئے کام انجام پائیں گے، کچھ نئے منصوبے مکمل ہوں گے۔ نئے جذبات اور نئی امنگوں کے ساتھ ہم گویا نئے سال پر اپنی زندگی کا پھر سے آغاز کرتے ہیں لیکن ہم میں سے زیادہ تر لوگ دو چار ہفتے یا دو چار مہینے گزرنے کے بعد اپنے نئے منصوبوں سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں، جذبات سرد ہوتے جاتے ہیں اور امنگیں دم توڑتی چلی جاتی ہیں لیکن ہم میں سے کچھ لوگ اپنے جذبات کو زندہ رکھتے ہیں اور اپنے اہداف کو پانے کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے نیا سال واقعی خوشیاں لے کر آتا ہے اور بڑی بڑی کامیابی بھی۔ اس موقعے پر ہم خود سے وعدہ کریں کہ 2020 کے ہر پل کو اپنے منصوبوں کی تکمیل میں صرف کریں گے، وقت کے تقاضوں پر دھیان دیں گے اور نئی نسلوں کے لیے ایسے نقوش چھوڑیں گے جن پر چل کر وہ کامیابی کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتے چلے جائیں۔

دراصل ہم نئے عہد میں سانس لے رہے ہیں، ایک ایسے عہد میں جس پر مادیت کا غلبہ ہے، ہر شے کو مادی تناظر میں دیکھا جارہا ہے۔ صارفیت اور مادیت پر انسانی زندگی کے زیادہ جھکاؤ کے سبب بعض مادی اور تکنیکی شعبوں میں تو ضرور حیرت انگیز تبدیلی رونما ہورہی ہے اور آسائش و زیبائش کے اعتبار سے معیارِ زندگی بلند ہوا ہے۔ مگر مجموعی طور پر زندگی غیر متوازن ہوکر رہ گئی ہے۔ روحانی، اخلاقی قدریں زوال پذیر ہورہی ہیں، تہذیبی و ثقافتی پیمانے بدل رہے ہیں، بولیاں مٹ رہی ہیں اور زبانوں کے دائرے سکڑتے جارہے ہیں۔ ایسے میں نئے تقاضوں پر دھیان دینے کے ساتھ اپنے قدیم تہذیبی و ثقافتی ورثے کا تحفظ اور زبانوں کا فروغ ناگزیر ہے۔

اردو ہمارے ملک کی ایسی زبان ہے جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہے۔ اس نے امن و بھائی چارے اور محبت کے پیغام کو عام کیا ہے، اس لیے اس زبان کی ترقی ہندوستانی تہذیب و کلچر اور امن و بھائی چارے کی ترقی ہے جس کی آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو ضرورت ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو کی مقبولیت کا دائرہ تیزی سے پھیل رہا ہے، اردو کی نئی نئی بستیاں آباد ہورہی ہیں اور دور دور تک اردو کی خوشبو فضاؤں کو معطر کررہی ہے۔ اردو اور غیر اردو والے بلاتفریق مذہب و ملت اور ملک و قوم اردو کے اشعار گنگنا رہے ہیں۔ یہ بھی خوش آئند بات ہے کہ اردو کے راستے ہندوستانی تہذیب و ثقافت بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل رہی ہے، ہندوستانی کلچر کو دور دراز کے ممالک کے لوگ پسند کررہے ہیں اور اپنا رہے ہیں مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کی قدیم بستیوں میں اردو کا اثر بتدریج کم ہورہا ہے، اردو سیکھنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہورہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی پرانی بستیوں میں اردو کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی حتی الوسع جدوجہد کی جائے تو دوسری طرف اردو کو شہر شہر قریہ قریہ پہنچانے کے لیے نئے نئے امکانات تلاش کیے جائیں۔

یومِ جمہوریہ کو بھی ہم پورے جوش و خروش کے ساتھ منائیں۔ اس طرح ہم اپنے اسلاف کی قربانیوں کو یاد بھی رکھ سکیں گے اور اپنے ملک کے لیے قربانی دینے کے جذبے سے سرشار بھی ہوسکیں گے۔ ملک کے لیے مرنے مٹنے کا جذبہ اور ملک کو آگے لے جانے کی دیانت دارانہ جدوجہد دراصل ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ملک کو آزاد کرنے اور اسے ترقی یافتہ بنانے کا جو خواب دیکھا تھا، ہم اسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے پرعزم ہوں اور ہر سطح پر تعمیر کردار ادا کریں۔

نئے سال کے اس شمارے میں ہم محمد داراشکوہ کی حیات و خدمات پر ایک کور اسٹوری شامل اشاعت کررہے ہیں تاکہ ہمارے قارئین داراشکوہ کی وطنی، تہذیبی اور ثقافتی خدمات سے واقف ہوسکیں، درحقیقت داراشکوہ اس شہزادے کا نام ہے جس نے بلاتفریق مذہب و ملت تمام باشندگانِ ہند کو محبت، اخوت اور امن و سلامتی کا درس دیا جس نے کسی بھی طرح کے مذہبی یا نظریاتی بھید بھاؤ سے اوپر اٹھ کر سب کو انسانیت کے آئینے میں دیکھا اور مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ آج داراشکوہ کی خدمات اور تعلیمات کو ساری دنیا میں عام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سارے جہان میں امن و سلامتی کی ہوائیں چلیں اور انسانوں کے درمیان محبت قائم ہو۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

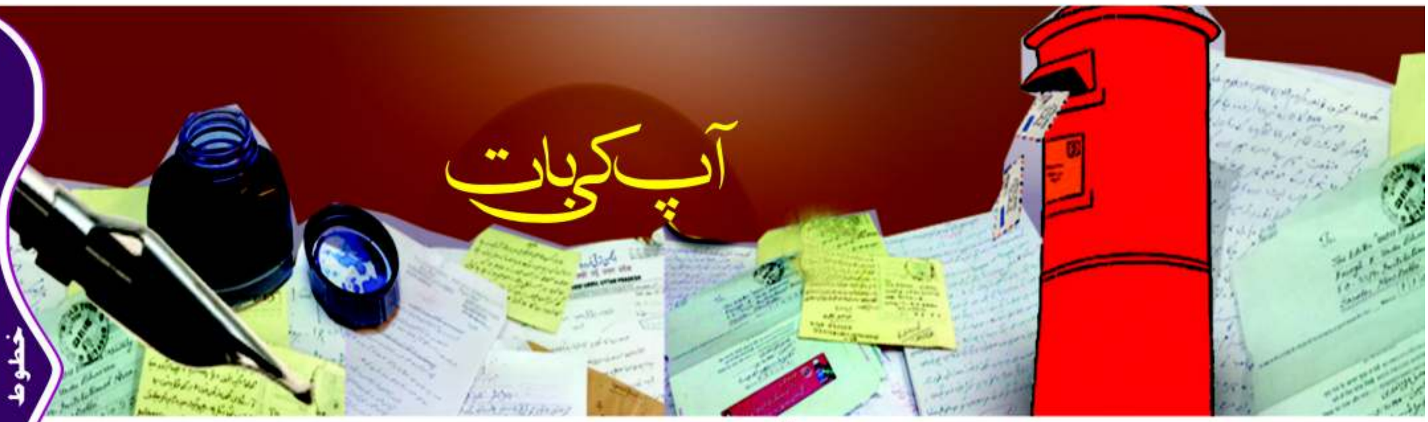

آپ کی بات

✍ 'اردو دنیا' ماہ دسمبر 2019 کا شمارہ موصول ہوا۔ حسب سابق یہ شمارہ بھی وقیع محتویات پر مشتمل ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ تکنیکی نوعیت کے مضامین و مباحث بھی گا ہے گا ہے اس میں شائع ہوتے ہیں۔ اس بار بھی ترجمے کے فن پر شاہ جہاں بیگم کا آرٹیکل شائع ہوا ہے جو معلوماتی اور دلچسپ تو ہے لیکن کئی نقاط پر تشنہ ہے۔ اردو زبان ہی نہیں، ہر زبان کے لیے لسانیات کی حیثیت بیک بون کی سی ہے لہٰذا اتنی ہی اہمیت سے لسانی مضامین کی اشاعت درکار ہے۔ یہ خبر پڑھ کر واقعی مسرت ہوئی کہ اردو املا کے حوالے سے ماہرین

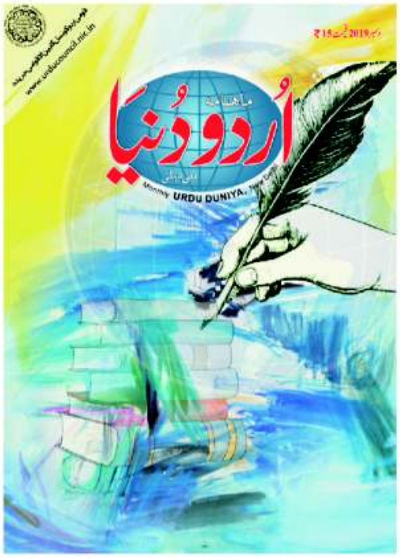

کی ایک نشست قومی اردو کونسل میں ہوئی لیکن ان نشستوں کا جب تک کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہو، یہ بارآور ثابت نہ ہوں گی۔ اردو املا پر کونسل کی زیرنگرانی پہلے بھی کام ہوا ہے لیکن ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔ میری ناقص رائے اس حوالے سے یہ ہوگی کہ اس فن کے ماہرین کو پورے ملک سے تلاش کرکے ایک مضبوط املا کمیٹی کی تشکیل ہو۔ صرف دہلی کے چند افراد کی نشست منعقد کرلینے سے کام نہیں ہونے والا۔ دوسری بات یہ بھی کہ یہ اہم کام قومی کونسل یا مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جیسے باوسائل ادارے ہی کرسکتے ہیں۔

❖ **زبیر احمد بھاگلپوری**: اردو سیکشن، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ 15 (بہار)

✍ ماہنامہ اردو دنیا دسمبر 2019 کا شمارہ ملا۔ جاذب نظر سرورق نے دل موہ لیا۔ مضامین، کتابوں کا تعارف بہترین ہے۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہاں شائع ہونے والا مواد معیاری ہوتا ہے۔ اردو املا پر ہوئی میٹنگ کی رپورٹ پڑھی، پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ادارہ املا کی بے راہروی کو روکنے کے لیے فکرمند ہے۔

پروفیسر نصیر احمد خاں نے بالکل بجا فرمایا ''قومی کونسل اردو کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کی طرف اردو والوں کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں سے شائع ہونے والی چیزوں کو معیاری خیال کیا جاتا ہے۔''

پاکستان کے مشہور ناول نگار اختر رضا سلیمی اور ان کی ٹیم نے اردو املا کی بے راہروی کو روکنے کے لیے ایک سافٹ ویئر بنایا ہے۔ جس کا نام 'حرف کار' ہے۔ یونیکوڈ میں ٹائپ متن کاپی کرکے اس سافٹ ویئر میں پیسٹ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ سافٹ ویئر پہلے تو املا اور رموز واوقاف کی غلطیوں کی نشان دہی کرتا ہے اور پھر اگلا کلک کرنے کے بعد خودکار طریقے سے غلطیوں کو درست بھی کردیتا ہے۔ حرف کار کے دو ایڈیشن جاری کیے گئے ہیں۔ انفرادی ایڈیشن کی قیمت 5000 روپے جبکہ کاروباری ایڈیشن کی قیمت 15000 رکھی گئی ہے۔

اگر ادارہ NCPUL اردو املا پر منحصر اس طرح کا کوئی سافٹ ویئر بناتا ہے تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ کام ادارہ NCPUL ہی کرسکتا ہے۔

❖ **محمد علیم اسماعیل**: ناندورہ، مہاراشٹر

✍ 'اردو دنیا' نومبر 2019 کا بڑا انتظار رہا پھر خرید لیا۔ یہی خط لکھنے میں تاخیر کا سبب ہوا۔ اس کا اداریہ نہایت پُر از فکر ہے جس میں مختلف تہذیبوں، مذاہب و معاشرتوں سے باہم واقفیت، تفہیم اور منزلت کو بڑی نرمی و نزاکت سے بیان کیا گیا ہے بھرتری ہری کے قول کے بموجب: اقبال؎

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر   مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اس مخمصے کا مبدا غالباً ڈوائڈ اینڈ رول لگتا ہے۔ 'اُردو دنیا' میں اب اس صورتِ حال کے فرو کرنے کی کاوش بھی نظر آرہی ہے۔ اقبال؎

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی   نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں سوا کوئی

اداریہ کے علاوہ اس شمارے میں کوئی تیرہ اصناف سخن کے در، وا ہیں۔ 'آپ کی بات' میں کہیں پر حب الوطنی کے عنوان پر شعرا و ادبا کی ایک طویل فہرست درج ہے لیکن تب حالات میں اُبال تھا۔ اب وبال ہے۔ اس لیے تحریر و تقریر کے ساتھ ساتھ اب علم و عمل سے ذہنی آلودگی اور دلوں کی کدورت دور کرنے کی سعی درکار ہے۔ 'زبان اور زمینی صورتِ حال' کے تحت یہ بحث کی گئی ہے کہ زبان کو مٹا کر تہذیب کی سلامتی ممکن نہیں۔ یہ دراصل 'اردو دنیا' میں دیے گئے سوالنامہ کے انٹرویو کا ہی جواب نامہ ہے۔ اگر کہیں زبان کو مٹانے کا قصد ہے تو گویا یہ تہذیب ہی کے قلع قمع کا مقصد ہے۔ 'نقد و نگاہ' میں پہلا مقالہ 'انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں' مقالہ نگار کے تھیسس کا حصہ لگتا ہے۔ اسی لیے اسے بڑی جانفشانی سے لکھا گیا ہے۔ یہ دراصل ریسرچ اسکالرس کے لیے بہت عمدہ مثال ہے لیکن اس میں ایک اضافی مشورہ یہ دیا جاسکتا ہے کہ اس کی شروعات انشائیہ کی تعریف سے کی جاسکتی ہے اور تاریخی ربط و تسلسل ملحوظ رکھا جاسکتا ہے، یعنی پہلے تو اختر اورینوی کا ذکر ہے پھر وزیر آغا اور پھر زمانہ ماسبق یعنی مُلاّ وجہی کا بیان۔ قطع نظر اس کے یہ بڑی محنت سے لکھا ہوا عمدہ مضمون ہے۔ ص 19 پر موجودہ نسل کے تعلق سے نکتہ چینی درج ہے۔ 'یادِ اسماعیل' میں مولانا اسماعیل میرٹھی پر دو اچھے مضامین دیے گئے ہیں۔ 'تہذیب و ثقافت' کے ذیل میں غارہائے اجنتا پر نہایت معلوماتی مضمون شائع کیا ہے۔ مگر اس پر نظر ثانی کرلی جاتی تو بہتر تھا۔ مثلاً اس مضمون کے آخری شعر کا مصرعہ اوّل درست فرمالیں۔ یہ دراصل نظم 'اجنتا' کے آخری بند کا تیسرا مصرعہ ہے۔ بند کچھ اس طرح ہے: سکندر علی وجد؎

جہاں چھوڑا خوشی سے جاویداں پیغام کی خاطر
خوشامد اہل دولت کی نہیں کی نام کی خاطر

نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر
جئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش اُن کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

(یادِ وجد، مرتبہ عنایت علی اورنگ آباد، ڈسمبر 2001، ص 165)

'شخصیات' میں ڈاکٹر ہیرا لال، حسرت جے پوری اور قمر مرادآبادی کی شخصیت، کلام و تغزل کی توصیف درج ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آٹھویں شہ سرخی 'اُردو اور مدارس' میں پہلا مضمون 'اُردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار' کے عنوان سے دیا گیا ہے کہ مدارس اسلامیہ کا بنیادی مقصد فروغ اُردو کے بجائے دین کی اشاعت ہے۔ تاہم طلبہ اُردو میں یاد کی ہوئی تقریریں، نظمیں اور مکالمے پیش کرتے ہیں جن کے لیے انھیں اُردو میں ایسی مشق بہم پہنچائی جاتی ہے کہ وہ بھرے مجمع میں بلا جھجک اُردو میں ادا کرتے ہیں۔ یہ غالباً عربی اور اُردو رسم الخط میں مشابہت کی وجہ سے ہوتا ہوگا۔ بہرکیف کسی طور اُردو کے فروغ میں بالواسطہ سہی مدارس کا کردار ادا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کے مضمون کا بھی اسی تسلسل میں مطالعہ کیجیے۔ 'نیا آسمان، نئے ستارے' کے پہلے مضمون 'مالک رام کا اسلامی شعور' میں بتایا گیا ہے کہ مالک رام اُردو کے نہ صرف عظیم محقق تھے، بلکہ ان کی دلچسپی اور شغف کا میدان اسلامیات بھی ہے۔ انھوں نے بیٹی، بیوی، ماں، مطلقہ اور وارثہ کے عنوان سے اسلام میں عورت کے مقام، مرتبہ اور حقوق کا قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں تعین کیا ہے۔ اس موضوع پر یہ بڑا مفصل اور مدلل مضمون ہے جو آپ کے دینی شعور کو تازہ کرے گا۔ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ یہ مضمون حاصل شمارہ ہے۔ دوسرا مضمون 'خاکہ نگاری' پر لکھا گیا ہے اور بہت خوب لکھا گیا ہے۔ خاکہ پر تمام تفصیلات کا یہ نچوڑ ہے جو 'فکر و تحقیق' اور 'زبان و ادب' میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ 'سائنس' کے ذیل میں دو مضامین دیے گئے ہیں۔ ان میں نظامِ شمسی پر تو نہایت ہی معلوماتی مضمون دیا گیا ہے جبکہ 'فوارہ آبپاشی' سے پانی کے اسراف کے بجائے بچت اور بہتر کاشتکاری کے طریقوں کی جانکاری دی گئی ہے۔ 'کمپیوٹر' میں دستاویز کا ڈیزائن تیار کرنے کا کارآمد طریقہ بتایا گیا ہے۔ مضمون تمام تر ٹکنالوجیکل معلومات سے معمور ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' کے ذیل میں گیارہ کتابوں پر تبصرے درج ہیں۔ انھیں پڑھ کر آپ حسبِ ضرورت کتابوں کو منتخب کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ 'عالمی اُردو نامہ' میں دہلی جشن آزادی سے متعلق مشاعرہ جبکہ قطر میں 'بزم اُردو قطر' کے زیر اہتمام پلاٹینم جوبلی عالمی مشاعرہ کا کیفیہ بیان کیا گیا ہے۔ 'خبرنامہ' کے تحت قومی اُردو کونسل کی غیر معمولی سرگرمیوں کا ذکر ہے جس میں اہم ترین خبر یہ کہ کونسل کے وائس چیئرمین اور ڈائرکٹر صاحب کے ہمراہ 'جائزہ نشست' میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عزت مآب جناب رمیش پوکھریال کا یہ غیر معمولی بیان کہ "اُردو ہندوستان کی بیٹی ہے، اس کی خوشبو پوری دنیا میں پھیلنی چاہیے اور کہ اس کونسل کے لیے فنڈ کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی" ایسے بیان سے بڑی ڈھارس بندھتی ہے اور بڑی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

❖ **مصطفی ندیم خان غوری**: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'اردو دنیا' اکتوبر 2019 کا شمارہ وقت پر ہمدست ہوا۔ سرورق پر نظر ڈالتے ہی اکتوبر ماہ کی معنویت کا اندازہ ہوا۔ گاندھی جی کی تصویر شائع ہوئی۔ گاندھی جی 2 اکتوبر 1869 کو پور بندر میں پیدا ہوئے۔ اسی سال اردو کے شاعر غالب کا انتقال ہوا۔ ایک بڑا آدمی رحلت کر گیا، دوسرا بڑا آدمی پیدا ہوا۔ مدیر محترم نے اردو اور ٹکنالوجی پر دانشمندانہ روشنی ڈالی۔ انٹرنیٹ سے زبانیں لمحوں میں دور دور تک چلی جا رہی ہیں۔ مطلوبہ مواد آسانی سے دستیاب ہو رہا ہے اور اردو بتدریج ٹکنالوجی سے مربوط ہو رہی ہے لیکن مدیر نے سچ کہا ہے کہ اردو کو ہر گھر تک پہنچایا جائے۔ شمس الاسلام فاروقی نے الفاظ کی طاقت میں لفظ کی اہمیت و عظمت کو ظاہر کیا ہے۔ 'اردو کی تدریس میں خرد تدریس کی اہمیت' پر شاذلی حسن خاں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لیکن اکثر یہ دیکھا گیا کہ استاد کے کمرۂ جماعت میں TTc، B.ed، M.ed میں تدریس کے جو اصول بتائے جاتے ہیں اس کو استعمال میں نہیں لاتے بلکہ روایتی انداز سے پڑھانے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ نورالہدیٰ نے 'زبان کی موت انسانی وراثت کا خاتمہ ہے' میں زبانوں کی زندگی اور اس کے مستقبل پر مدلل روشنی ڈالی ہے۔ ممتاز احمد خاں نے 'چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر' کی نشاندہی کی ہے۔ محمد عادل نے 'اردو غزل میں قدرتی آفات کا تصور' مختلف شعرا کے اشعار سے پیش کیا ہے۔ سعود عالم نے 'اردو کی پہلی داستان اور شمالی ہند کی داستانیں' میں تحقیقی بحث کی ہے لیکن سب رس کو پہلی داستان مانا جاتا ہے جو 1635 میں لکھی گئی ہے۔ خان محمد رضوان نے 'اردو مثنوی: تعارف اور تفہیم' میں مثنوی کا فنی لحاظ سے جائزہ لیا ہے۔ اردو ریڈیائی ڈرامے ایک زمانے میں مقبول ہوئے۔ آج کل ریڈیو سننے والے نہ کے برابر ہیں۔ جو سرمایہ ہے اس کی حفاظت کریں۔ شمیم احمد نے 'مہاتما گاندھی اور سماجی برابری کی وجہ میں گاندھی کے نظریات، افکار اور سماجی تصورات' کی ترجمانی کی ہے۔ محمد خالد ظہیر نے 'تعلیمی بیداری اور سرسید احمد خاں' میں سرسید احمد خاں کی تعلیمی جدوجہد اور کاوش کو اجاگر کیا ہے۔ دیگر مضامین و مشمولات منفرد اور اچھوتے انداز لیے ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوگا۔ 100 صفحات کا یہ رسالہ اپنے اندر علمی خزانہ رکھتا ہے۔ اردو کے اسکالر اور طالب علم ضرور اس سے استفادہ کریں۔

نومبر 2019 'اردو دنیا' کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ مدیر نے اداریہ ہماری بات میں مذہب کے کردار کو پیش کا ہے۔ یقیناً مذاہب روشنی عطا کرتے ہیں۔ انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ زبان کو مٹا کر تہذیب کی سلامتی ممکن نہیں زبان سے تہذیب کا فروغ ہوتا ہے۔ انسانیت کی ترقی ہوتی ہے۔ ملک و قوم مضبوط ہوتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے 'مرزا مظہر جانجاناں انسانیت کے علمبردار' شعری حوالوں سے بات کی ہے۔ مرزا مظہر جانجاناں نے تمام عمر سنت نبوی پر سختی سے عمل کیا۔ انسانی دوستی، سچائی اور صداقت ان کا ایمان تھا، ان کی وسعت قلبی اور ذہنی کشادگی نے ان کا مرتبہ صوفیا میں بہت بلند کر دیا۔ بلال احمد ڈار نے 'انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں' مغربی و مشرقی مصنّفین کے حوالے دیے ہیں۔ عاقل زیاد نے 'موجودہ نسل اور اردو تحقیق و تنقید' کے حوالے سے اچھا مضمون لکھا۔ نئی نسل میں تحقیق و تنقید کی صلاحیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ مولانا حالی پر تسنیم بانو نے مضمون لکھا ہے اور ان کی تحریروں میں عورتوں کے مسائل کا ذکر بحسن و خوبی کیا ہے۔ عبید اقبال عاصم نے ماہ نومبر کی مناسبت سے محمد اسماعیل میرٹھی پر مضمون لکھا ہے۔ یہ بچوں کے ادب کے لیے ہی مشہور ہیں۔ دیگر مشمولات بھی معیاری ہیں۔ اکتوبر کے شمارے کے ذیلی عنوانات اداریہ، خطوط، زبان و تعلیم، زبان اور زمینی صورت حال نقد و نگاہ، خراجِ عقیدت، یادیں، سلسلہ، صحافت، تہذیبی، لسانی رشتے، نیا آسماں نئے ستارے، فلم کمپیوٹر، کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ، خبرنامہ نومبر کے شمارے میں چند ذیلی عنوانات مضمون کی نوعیت کے لحاظ تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ بھی اچھا طریقہ ہے جدت و ندرت ہونی چاہیے۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

■

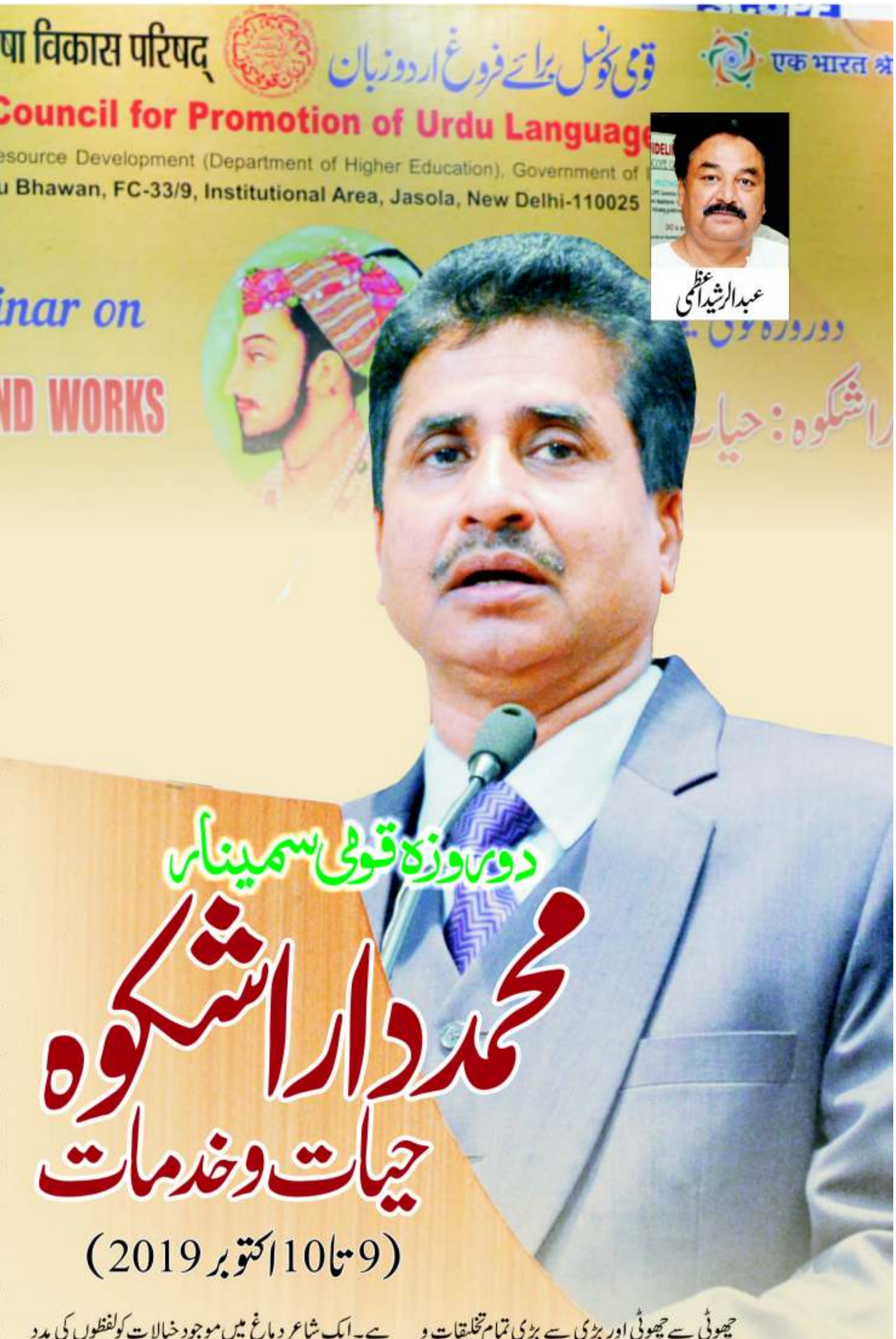

عبدالرشید اعظمی

دو روزہ قومی سمینار
محمد دارا شکوہ حیات و خدمات
(9تا10 اکتوبر 2019)

چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تمام تخلیقات و مصنوعات اپنے تخلیق کار و صانع کا نشاط افزا شاہکار ہیں۔ ایک تخلیق کو جن جن مدارج و مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ صرف تخلیق کار ہی کو ہوسکتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک دنیاو دنیا کے مناظر اپنی اصل کی نقل ہیں۔ اس کی اصل تخلیق، تخلیق کار و صانع کے دماغ میں ہے۔ گویا وجود میں آنے سے قبل تخلیق کا ہیولا و خاکہ تخلیق کار کے دماغ میں مرحلۂ تکمیل سے ہمکنار ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک (آرکی ٹیکٹ) معمار اپنے دماغ میں تیار عمارت کی تعمیر کے لیے سنگ و خشت کا سہارا لیتا ہے۔ ایک مصور متناسب رنگوں سے خوبصورت تصویروں کا مرقع تیار کرتا ہے۔ ایک شاعر دماغ میں موجود خیالات کو لفظوں کی مدد سے شعری پیکر عطا کرتا ہے۔ گویا اس نقطے پر ادبا، شعرا نیز مذاہب متفق ہیں کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں، یہ نقل ہے۔ اس کی اصل کہیں اور ہے۔ انسان صرف ایک کردار ہے، آتا ہے، تماشا کرتا ہے اور اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ رقم کرنے والے مورخین نمایاں کرداروں کی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ زمین پر کھنچی ہوئی لکیریں ایک سمجھوتہ و مفاہمت ہے۔ یہی لکیریں انسانیت اور مخصوص تہذیب و ثقافت کی بقا کی ضامن ہیں۔ حدود میں اسیر ممالک اپنے اپنے تہذیبی وثقافتی ورثے وخزانے کے تحفظ وتوسیع کے لیے آزاد ہیں۔ ہر ملک اپنی ایک خاص تہذیب وثقافت کا مالک ہے، اس کے باشندوں کی ایک مخصوص شباہت ہے۔ وہ اپنی شکل وصورت اور طرزِ کلام سے پہچانے جاتے ہیں۔ گویا ان میں یکسانیت ہے۔ یہی یکسانیت ان کا امتیاز ہے۔

ہندوستان واحد ملک ہے جو بوقلمونی وتنوع کی دولت سے مالامال ہے۔ یہی ثروت مندی ہندوستان کو دیگر ممالک پر تفوق عطا کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اوّلین عرب سیاحوں میں سے کسی سیاح نے جب ہندوستان کی سیاحت کی تو فرطِ مسرت سے وہ دفعتاً چیخ پڑا۔ 'ہذہ مندر' یہ تو مندر ہے۔ یعنی مندر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پر نوادرات پائے جاتے ہیں۔ زمین پر ہندوستان جیسا ملک شاذ و نادر ہی ملے گا۔ جغرافیہ، موسم، آب و ہوا اور تہذیب وثقافت کے تنوع و رنگارنگی سے آنکھوں کو سرور اور دل و دماغ کو انبساط ملتا ہے۔ اندرونِ ملک ایک ہی وقت میں اختلافِ آب و ہوا نیز اختلافِ خزاں و بہار کا لطف اٹھایے، بغیر پروانہ و راہداری کے سیر کیجیے، خوش رنگ و خوش ذائقہ پھلوں، پھولوں، اور پکوانوں کا مزہ لیجیے۔

ہندوستان کی سرزمین شجاعت و بہادری، دلبری و دلربائی اور عشق ومحبت کی خوشبوؤں سے معطر ہے۔ نظام الدین اولیا اور خسرو کے پاکیزہ جذبۂ قلب ونظر سے بھگتی گیت وصوفی سنگیت میں کیف وسرور کی کارفرمائی ہے۔ سرمد ولالہ زادے کا عشق آج بھی بیبا کی کا مظہر ہے۔ اسی سرزمین پر سوہنی، مہیوال (عزت خان) کا عشق پروان چڑھا۔ ہندوستان اس وقت تک باقی رہے گا جب تک یہاں محبت کے نغمے گائے جائیں گے۔

ہندوستان کی زرخیز زمین پر قافلے آتے رہے نیز آسودۂ خاک ہوتے رہے۔ اس کی تہذیب وثقافت کو ثروت مند کرتے رہے، گوشہ ہائے کائنات کے رنگ برنگ پھلوں پھولوں سے اس گلشن وکشت کو تنوع بخشتے رہے۔ اسی تنوع نے ہندوستان کو ممالکِ غیر کی نظروں

میں اعلیٰ وارفع بنادیا۔ یہاں کے ادب پاروں کو گلشنِ کشمیر سے تشبیہ دی گئی۔ یہاں کا ہر خطہ اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ یہاں خسرو کا کلام بھی ہے، تان سین کی الاپ بھی، یہاں لمبے بال کی فسوں گری بھی ہے اور چشمِ غزال کا سحر بھی۔ یہاں حجلۂ عروسی کی زینت شہنشاہ و مہارانی بھی ہیں۔ جہاں دو تہذیبیں باہم دگر ہوئیں تو ایک تیسری تہذیب جسے گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں، منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئی۔ یہی وہ تہذیب ہے جو نسل در نسل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچی ہے۔ آج ہمارے ہندوستان کو اسی رواداری اور گنگا جمنی تہذیب کی ضرورت ہے تاکہ ہماری گمشدہ سونے کی چڑیا ہمیں واپس مل جائے اور جب یہ چڑیا چہکے تو پیمبرانِ ملک وقوم کو تسکینِ قلب نصیب ہو، ہمارے دانشوران اسی تلاش و جستجو اور تفقد و تفحص میں تاریخ کے اوراق پلٹ رہے ہیں کہ کاش ہمیں وہ سرچشمہ دستیاب ہوجائے جس کی روشنی میں ہم آگے بڑھ سکیں۔ دفعتاً انھیں مبنی بر اخلاص سعی و جہد میں کامرانی وظفر مندی نصیب ہوئی یعنی محمد داراشکوہ، کی صورت میں ایک ایسا ہیرا ہاتھ لگا جس کی پھوٹتی روشنی سے شش جہات منور ہوتی دکھائی دیں۔

قارئین کرام! یہاں ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے دانشوروں کی نظر داراشکوہ پر جاکر کیوں ٹکی؟ حالانکہ عہد سلاطین سے لے کر خاتمۂ عہدِ مغل تک حکمرانوں وشہزادوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہم تھوڑا اور ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو تاریخ کے پنوں میں ایک شہزادہ اور ملتا ہے جس نے تخت وتاج، عیش وعشرت نیز شراب و شباب کو ٹھکرا کر جنگل و بیابان کی کلفتوں و مصیبتوں کا انتخاب کیا جسے دنیا گوتم بدھ کے نام سے جانتی ہے۔ اگر اس نکتے پر غور وخوض کیا جائے تو یہ راز کھلتا ہے کہ زندگی سود و زیاں کے اندیشے سے برتر ہے۔ کبھی جینا زندگی ہے تو کبھی مرجانا عینِ حیات ہے۔ جنھیں عرفانِ ذات ہوا انھوں نے درباروں وسلطنتوں کی دیواروں کو توڑ دیا۔ امورِ سلطنت سے اغماض کیا۔

داراشکوہ نے ورثۂ انبیاورسل یعنی دولتِ علم کا انتخاب کیا جب کہ بھائیوں نے حکمرانی پسند کی جو فرعون وقارون کا ورثہ ہے۔ حکمرانی میں خوں ریزی وسفا کی ہے جب کہ کمالِ علم و فضل میں پیار، محبت، سکون و تسکین اور امن و امان ہے۔ دارا نے جب بحر علم میں جست لگائی تو وہ اس کی وسعتوں و گہرائیوں میں ایسا کھویا کہ اسی کا ہوکر رہ گیا۔ جب بحر علم سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں دو سمندروں کو جوڑنے والا پل یعنی تصنیف 'مجمع البحرین' تھی۔

اختصاص کسی ایک ہی موضوع پر ہوسکتا ہے۔ بیک

وقت متعدد محاذ شکست و ناکامی کا سبب بنتے ہیں۔ دارا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ خلقِ خدا کو پیار کی مالا میں پرونے والا نسخہ تیار کرنے میں امورِ سلطنت و معاملاتِ حکمرانی کے جوہر سے مکمل آشنا نہ ہوسکا۔ اس لیے میدانِ جنگ میں شکست کھائی۔ عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ داراشکوہ پر کفر والحاد کے فتوے صادر کرائے گئے اور وارثِ تخت و تاج کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اسی بغضِ برادر کا شکار سرمد کو ہونا پڑا جس نے پیش گوئی کی تھی کہ تم (دارا) کو بادشاہت ملے گی۔ دو بھائیوں یعنی بڑے بھائی داراشکوہ اور چھوٹے بھائی اورنگ زیب کے درمیان جنگ کفر و اسلام کی نہیں بلکہ حصولِ سطنت کی تھی۔ ایک نے رعایا سے محبت کی تو دوسرے نے تخت و تاج سے۔ اس لیے آج کی رعایا نے اپنے قدیم اس محسن کو ڈھونڈ نکالا جس نے دو تصورات کا انضمام وادغام کرکے ایک مہکتا ہوا گلشن آباد کرنا چاہا تھا۔

قارئین کرام! یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے دور میں ہم ایک قدیم بھولے بسرے شہزادے کے طرزِ حیات کو کیوں دہرانا چاہتے ہیں؟ اب تو زندگی گزارنے کے بہتر سے بہتر وسائل موجود ہیں۔ نئے ہندوستان کی تعمیر میں پرانا نسخہ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟ یہاں مجھے اقبال کی یاد آرہی ہے۔

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ہمارے دلِ پرسوز رکھنے والے نگہ بلند زعما و میرِ کارواں نے گردشِ ایام کے انداز کو باور کرلیا۔ اس لیے پکار اٹھے

لوٹ ماضی کی طرف اے گردشِ ایام تو

معیشت کی ترقی، تہذیب و ثقافت کی ترقی، دولت کی فراوانی سے بڑے بڑے کارخانے، بڑے بڑے ادارے قائم ہوسکتے ہیں جن کا مقصد و منشا محض حصولِ دولت و جاہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر خودی مرجاتی ہے، خودغرضی کا سر بلند ہوتا ہے آدمی زندہ رہتا ہے، انسان و انسانیت دم توڑ دیتی ہے۔ اس لیے معیشت، دولت، تہذیب و ثقافت نیز ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت، پیار و محبت اور بھائی چارہ کے فروغ، بہبود و فلاح کے لیے تعلیم یافتہ و پیار و محبت و ایثار پر مبنی معاشرے کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت ہمیں اسی گنگا جمنی تہذیب و مجمع البحرین کی طرف لے جاتی ہے۔ ورنہ معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ زندگی پارہ پارہ ہوجائے گی۔ سلطنتیں تہہ و بالا ہوجائیں گی۔

انھیں نکات پر غور کرنے کے بعد قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے محمد داراشکوہ کے تصور قومیت پر دو روزہ سمینار منعقد کرنے کا عزم بالجزم کیا، جس کا اہتمام لودھی روڈ نئی دہلی، آڈیٹوریم اسکوپ کمپلیکس میں 9 تا 10 اکتوبر 2019 کو کیا گیا۔ مذکورہ دو روزہ قومی سمینار کا موضوع 'محمد داراشکوہ: حیات و خدمات' مجموعی طور پر طے پایا۔ اس دو روزہ سمینار کا اختتام داراشکوہ کی پیدائش سے شروع ہوکر بالاستیعاب خدمات پر ہوا۔ اجلاسوں کی حسنِ ترتیب میں ماہرین کے مقام و مرتبے کے مطابق وقت کا خیال رکھا گیا۔

افتتاحی اجلاس: 9 **اکتوبر** 2019، 10:30 **تا دوپہر**، 12 **بجے**

جلسے کا آغاز 9 اکتوبر 2019، صبح 10:30 بجے ہوا۔ روایت کو نبھاتے ہوئے جناب تحسین منور نے فرضِ نظامت ادا کرنے کے لیے مائک سنبھالا۔ مہمانانِ اعزازی کو یکے بعد دیگرے اپنی اپنی نشستیں پُر کرنے کی دعوت دی۔ اولاً آر ایس ایس کے جوائنٹ جنرل سکریٹری ڈاکٹر کرشن گوپال کو بلایا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، پروفیسر طارق منصور نیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر، پروفیسر نجمہ اختر کو اپنی اپنی جگہ لینے کی درخواست کی۔

اسٹیج پر موجود مہمانانِ اعزازی، قومی اردو کونسل کے

آج اس آڈیٹوریم میں جس شخصیت کی زندگی پر گفتگو ہونی ہے، وہ ایک شہزادہ ضرور ہے لیکن اس کی نظر اپنے شہنشاہ باپ کے تخت و تاج پر نہیں بلکہ رعایا پر ہے، وہ شہزادہ دربار میں داد عیش دینے کے بجائے صوفی، سنتوں اور یوگی و سنیاسی سے علم و دانش کے جوہر اکٹھے کررہا ہے۔ ایسے شہزادے پر یہ سمینار یقینا میل کا پتھر ثابت ہوگا۔

"یہ وہ شخص تھا جو ہندوستان کے امتزاجی معاشرے کا علمبردار تھا، تمام ادیان کا احترام اور تمام دھرموں کا سمان کرتا تھا، اس کا تصور یہ تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ہیں، راستے الگ الگ سہی مگر منزل ایک ہے، اس نے ہندو مت اور اسلام کے درمیان نقطۂ اشتراک کو تلاش کیا، خاص طور پر دونوں کا نظریہ توحید ایک ہے، سزا اور جزا کا تصور ایک ہے۔"

وائس چیئرمین، پروفیسر شاہد اختر، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے رسم شمع فروزاں ادا کی۔ عملاً جلسے کا آغاز ناظم اجلاس تحسین منور نے پروفیسر شاہد اختر کے استقبالیہ کلمات سے کیا۔ پروفیسر شاہد اختر نے اپنی گفتگو میں محمد داراشکوہ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''آج اس آڈیٹوریم میں جس شخصیت کی زندگی پر گفتگو ہونی ہے، وہ ایک شہزادہ ضرور ہے لیکن اس کی نظر اپنے شہنشاہ باپ کے تخت وتاج پر نہیں بلکہ رعایا پر ہے، وہ شہزادہ دربار میں دادِ عیش دینے کے بجائے صوفی، سنتوں اور یوگی وسنیاسی سے علم و دانش کے جوہر اکٹھے کررہا ہے۔ ایسے شہزادے پر یہ سمینار یقیناً میل کا پتھر ثابت ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''داراشکوہ نے دنیا کے دوسرے ممالک میں ہندوستانی تہذیب و کلچر کو متعارف کرایا۔'' انھیں خیالات کے بعد پروفیسر شاہد اختر نے اپنی بات مکمل کی۔ بعدازاں ناظم اجلاس نے تعارفی کلمات کے لیے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کو پکارا۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے تعارفی کلمات میں محمد داراشکوہ کی زندگی کے نشیب وفراز پر کسی قدر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''داراشکوہ پر سمینار، وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ داراشکوہ ہندوستانیت کا مظہر اور بین مذاہب اتحاد و یکجہتی کی ایک روشن علامت تھے۔ اگر وہ حکمراں ہوتے تو اس ملک کی تاریخ، تصویر اور تقدیر کچھ اور ہی ہوتی۔ سرو دھرم سمبھاؤ کا تصور سب سے پہلے داراشکوہ نے ہی دیا تھا۔ اس کا وژن بہت وسیع تھا۔ وہ اس روحانیت پر یقین رکھتا تھا جو انسانوں سے نفرت نہیں محبت سکھاتی ہے۔ خدمت خلق، احترامِ انسانیت کا منشور ہے۔ داراشکوہ کے افکار و تصورات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کے تحت قومی اردو کونسل داراشکوہ کی تمام کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو میں اس کے ترجمے بھی کرارہی ہے۔''

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے داراشکوہ کی حیات کے ضمن میں ان کی پیدائش کے حوالے سے خواجہ معین الدین چشتی کے شہر اجمیر اور اس کی برکتوں کا ذکر کیا، جس کی تاثیر وتنویر سے قلب و جگر روشن ہوئے، داراشکوہ، مغل شہنشاہ شاہجہاں کا تین بیٹیوں کے بعد پہلا بیٹا تھا، جو شہنشاہ کے نزدیک نہایت عزیز تھا۔ اس بیٹے نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ آج خلقِ خدا کی نظروں میں عزیز ہے۔ اس کے تصورِ حیات وطرزِ جہاں بینی کو اسوہ ونمونہ نیز اندازِ حکمرانی کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ قائدین وفضلائے ملک وقوم کو پھر اسی بادہ و جام کی جستجو ہے جس میں پیار ومحبت اور بھائی چارہ واحترامِ انسانیت کا سرور وخمار ہے۔ اس حوالے سے میں قومی اردو کونسل کے سربراہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے افتتاحی کلمات سے چند جملوں کا سہارا لینا چاہتا ہوں۔ بقول ان کے ''یہ وہ شخص تھا جو ہندوستان کے امتزاجی معاشرے کا علمبردار تھا، تمام ادیان کا احترام اور تمام دھرموں کا سمان کرتا تھا، اس کا تصور یہ تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ہیں، راستے الگ الگ سہی مگر منزل ایک ہے، اس نے ہندومت اور اسلام کے درمیان نقطۂ اشتراک کو تلاش کیا، خاص طور پر دونوں کا نظریہ توحید ایک ہے، سزا اور جزا کا تصور ایک ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ آج ہمارے ملک ہندوستان کو اس تصور کی بازیافت اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سخت ضرورت آن پڑی ہے۔ یہی وہ رسی ہے جسے مضبوطی سے تھامنے کی ضرورت ہے، اسی میں ملک وقوم کی فوز وفلاح مضمر ہے۔ اس کے علاوہ سارے اصول ودساتیر بقا نہیں طریق فنا کی طرف لے جائیں گے۔ مادّی اذہان وافکار سے قومیں ہلاک ہوتی ہیں۔ طوائف الملوکی وسفاکیت کے نتائج سے کالی تاریخ رقم ہوتی ہے۔ وقت کا سچا صادق رہنما ایسے حالات سے بچنے کے لیے تاریخ کے اوراق پلٹتا ہے۔ حکومتوں وسلطنتوں کی بقا وفنا کے اسباب ڈھونڈتا ہے تاکہ منزل تک پہنچنے کے لیے روشنی مل جائے۔ اس نہج پر سوچتے ہوئے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے داراشکوہ کی علمی خدمات پر تسلی بخش گفتگو کی ہے اور اپنی تحریروں میں شہزادہ داراشکوہ کی علمی کاوشوں کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے 'سفینۃ الاولیا' 'سکینۃ الاولیا' رسالہ 'حق نما' نیز 'حسنات العارفین' کے موضوعات کی صراحت بھی کی۔ ڈاکٹر صاحب نے داراشکوہ کی خدمتِ ترجمہ نگاری کے ضمن میں اپنشد کے ترجمہ بنام 'سرِّ اکبر' کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''وہی پہلا شخص تھا جس نے 52 اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ہندومت اور اسلامی تصوف کے درمیان ایک مشترکہ بنیاد کی تلاش کی، انھی کے ترجموں کے بعد اپنشد کا ترجمہ، فرانس، جرمنی، اور دوسرے مغربی ممالک میں ہوا۔ مشہور فرانسیسی سیاح برنیئر اس ترجمے کو فرانس لے کر گئے، فرانس کے حلقے میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ہندوستانی فلسفے کے تئیں ایک عقیدت ومحبت کا سیلاب اٹھ پڑا۔ شوپنہاور جیسا دانشور 'اپنشد' کا بہت بڑا مداح تھا۔ مغربی دنیا میں اپنشدوں کو متعارف کرانے کا سہرا داراشکوہ کے سر جاتا ہے'' یہ ہیں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی توضیحات بسلسلۂ داراشکوہ۔ ان کے تعارفی کلمات کے بعد ناظم اجلاس تحسین منور نے شہزادہ داراشکوہ کی مسائل سے بھری زندگی وعلمی فتوحات پر اظہارِ خیال کے لیے دانش گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر طارق منصور کو مائک پر آنے کی زحمت دی۔ پروفیسر طارق منصور نے داراشکوہ پر کچھ کہنے سے قبل آر ایس ایس کے جوائنٹ جنرل سکریٹری ڈاکٹر کرشن گوپال کے دارا پر اختصاص و بالاستیعاب مطالعے پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ''ڈاکٹر کرشن گوپال نے داراشکوہ پر اتنا کام کیا ہے کہ کسی تاریخ اور فارسی کے اسکالر نے نہیں کیا۔''

پروفیسر طارق منصور نے داراشکوہ کی تصوف وفلسفہ کی دلچسپی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس خوبی کی طرف اشارہ کیا کہ دارا مذاہب وملل کی اچھی باتوں کو اختیار کرتا، ان کی عمومی خصوصیات پر اعتقاد واعتماد کرتا تھا۔ آپ نے داراشکوہ کی ترجمہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے اپنشد کی توسیع

وتبلیغ پر روشنی ڈالی۔ مجمع البحرین کو تصورات کا سنگم بتاتے ہوئے دارا کی مختلف النوع صلاحیت وکثیر لسانی، فلسفہ و مذہب اور فنون وادب پر گفتگو کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں، داراشکوہ چیئر، قائم کرنے کی اطلاع دی اور دلی میں کسی مرکزی مقام پر 'داراشکوہ سینٹر' قائم کرنے کی تجویز پیش کی نیز داراشکوہ پر ڈاکٹر کرشن گوپال کے اقدام کی ستائش کی۔ پروفیسر طارق منصور کی تکمیل گفتگو کے بعد ناظم اجلاس تحسین منور نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر کو داراشکوہ پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی دعوت دی۔ پروفیسر نجمہ اختر نے داراشکوہ کے تصورِ قومی یکجہتی، مشترکہ تہذیب پسندی پر لب کشائی کرتے ہوئے مجمع البحرین کا حوالہ دیا۔ پروفیسر نجمہ اختر نے اپنی گفتگو میں قدرے اجمال وایجاز سے کام لیا۔ بقول نجمہ اختر ''ہندوستان کے تخت وتاج کے لیے ان کے بھائی اورنگ زیب نے ان کا قتل کرایا'' پروفیسر نجمہ اختر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری میں داراشکوہ پر ایک ونگ (گوشہ) قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا نیز دارا پر ایک اسپیشل پیپر کے آغاز کی بات کہی۔ آخر میں آپ نے ڈاکٹر کرشن گوپال کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے کہا کہ دارا پر اقدام کے لیے آپ قابلِ مبارک باد ہیں، ہم اور ہماری جامعہ آپ کے ساتھ ہے۔ انھیں جملوں پر آپ نے اپنی بات مکمل کی۔ بعد ازاں قومی اردو کونسل سے مجمع البحرین کا ترجمہ جس کے مترجم طلحہ رضوی برق ہیں، کا اجرا عمل میں آیا۔ بعد ازاں ناظم اجلاس نے ڈاکٹر کرشن گوپال کو مائک پر آنے کی دعوت دی۔

محمد داراشکوہ پر سمینار کی غرض وغایت نیز تقریب رسمی کی ادائیگی کے بعد باقاعدہ دارا پر اظہار خیال کا افتتاح آر ایس ایس کے جوائٹ جنرل سکریٹری ڈاکٹر کرشن گوپال کے مقالے سے ہوا۔ موصوف کا مقالہ نہایت وقیع وبلیغ تھا۔ ڈاکٹر کرشن گوپال نے اولاً ہندوستانی قومیت کی کثرت میں وحدت پر روشنی ڈالی۔ کثیر المذاہب ملک ہونے کی خوبی بیان کی۔ دورانِ گفتگو آپ نے کہا کہ ''ہندوستان کی سب سے بڑی خوبی سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے، یہاں بہت سارے مذاہب ہیں، اچھی باتیں لے لینا ہندوستان کی خصوصیت ہے،

ہندوستان کے تخت و تاج کے لیے ان کے بھائی اورنگ زیب نے ان کا قتل کرایا'' پروفیسر نجمہ اختر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری میں داراشکوہ پر ایک ونگ (گوشہ) قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا نیز دارا پر ایک اسپیشل پیپر کے آغاز کی بات کہی۔

دارا نے ہندوستان کی روایت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، دارا ایسا شہزادہ تھا جو مطالعے کا بے حد شوقین تھا، وہ ہر مذہب کے علما وفضلا کی صحبت میں جاتا اور بحث ومباحثہ کرتا۔''

داراشکوہ پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر کرشن گوپال نے دارا کی گھریلو زندگی پر اظہارِ خیال کیا اور بتایا کہ دارا اور اس کی بڑی بہن جہاں آرا کے مابین دوستی کا رشتہ تھا۔ دونوں بہن بھائی دوستوں کی طرح رہتے تھے، ایک دوسرے سے بمنزلۂ اخوت، بہت پیار کرتے تھے۔ جہاں آرا بھی بہت باصلاحیت پڑھی لکھی قابل شہزادی تھی۔ ڈاکٹر کرشن گوپال نے شاہجہاں کے عہد علالت نیز حصولِ تخت وتاج کی جنگ پر تفصیلی گفتگو کی۔ دارا کی دردناک شکست اور اس کے اسباب کی صراحت کی۔ موصوف کے نزدیک دارا کے لیے اقتدار سے زیادہ رعایا پروری اہم تھی۔ اس لیے اس نے دو مذاہب کے لوگوں کو قریب کرنے کی سعی وجہد کی، اس کے لیے دارا نے دونوں مذاہب کی کتابوں نیز علما وفضلا سے کسبِ فیض کیا۔ سخت قانون وضابطے کے بجائے پیار ومحبت سے دلوں کو جوڑنے، زمینوں وسرحدوں کے بجائے دلوں کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے ایسا دستور تیار کیا جس پر آج سمینار وسمپوزیم منعقد ہورہے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دارا کی تصنیف 'مجمع البحرین' دو ملتوں کے انضمام کا دستور ہے۔ یہی اسباب تھے جن کے حصول میں دارا امورِ سلطنت پر مکمل دسترس حاصل نہیں کرسکا جس کا انجام تخت وتاج سے محرومی وموت تھا۔ بقول کرشن گوپال ''تقابلی مطالعے کی بنیاد داراشکوہ نے ڈالی ہے، دارا نے فارسی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے میں بہت محنت کی اور وقت لگایا، دارا دنیا کا پہلا آدمی ہے جس نے فارسی اور سنسکرت سے علوم کا ترجمہ کرکے آگے بڑھایا۔''

دارا پر گفتگو کے دوران ڈاکٹر کرشن گوپال نے سلطنت میں صادر شاہجہاں کے احکامات کی صراحت کرتے ہوئے بتایا کہ شاہجہاں کے وہ احکامات جو رعایا کے مزاج وحق کے منافی ہوتے جن سے رعایا کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ داراشکوہ ان کے عدم نفاذ پر شہنشاہ سے بدلیل بحث کرتا اور انھیں خارج کراتا۔ شاہجہاں انھیں قبول بھی کرتا۔ بقول کرشن گوپال:

''دس جگہ سے اچھی باتیں لے کر آنے کا نام دارا ہے، وہ توحید پرست تھا۔ ہر کوئی توحید کو مانتا ہے، صرف زبانیں الگ الگ ہوتی ہیں'' ڈاکٹر کرشن گوپال نے اپنے مقالے میں داراشکوہ کی تصانیف سے اقتباس نقل کرکے اپنی باتوں ودعوؤں کو مدلل انداز میں پیش کیا۔ داراشکوہ

دس جگہ سے اچھی باتیں لے کر آنے کا نام دارا ہے، وہ توحید پرست تھا۔ ہر کوئی توحید کو مانتا ہے، صرف زبانیں الگ الگ ہوتی ہیں" ڈاکٹر کرشن گوپال نے اپنے مقالے میں داراشکوہ کی تصانیف سے اقتباس نقل کرکے اپنی باتوں و دعوؤں کو مدلل انداز میں پیش کیا۔

لائبریری کی قیامِ تاریخ 1634 بتاتے ہوئے کہا کہ یہ ایسا شہزادہ تھا جس کے اندر مطالعے کا حد درجہ شوق تھا، مطالعے کی غرض سے مختلف مقامات پر امور سلطنت کے لیے خود کو مامور کراتا اور طویل عرصے تک وہاں قیام کرتا، صوفی سنتوں کی مجلسوں میں جاتا اور مستفیض ہوتا۔

ڈاکٹر کرشن گوپال کے مقالے نے داراشکوہ کی حیات وخدمات کا مکمل احاطہ کیا۔ بہت سارے شبہات و شکوک کا ازالہ بھی ہوا۔ اس مقالے سے داراشکوہ کی حب الوطنی کے ساتھ ساتھ گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کی تبلیغ و تشہیر کی مکمل واقفیت ہوئی جو ہندوستانی معاشرے کی بقا و فلاح کی ضامن ہے۔ اختتامِ مقالہ پر اظہار تشکر کے لیے ناظمِ اجلاس تحسین منور نے قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ اکیڈمک ڈائرکٹر، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی کو مائک پر آنے کی دعوت دی۔ محترمہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے مسند نشیں ڈاکٹر کرشن گوپال، پروفیسر طارق منصور، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر نجمہ اختر، قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور اجلاس کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچانے پر جناب تحسین منور کا شکریہ ادا کیا اور تحسین منور، ناظم اجلاس نے بارہ بجے چائے نوشی کا اعلان کیا۔

پلینری سیشن:9/ اکتوبر 2019، دوپہر 12:15 سے ایک بجے تک

محمد داراشکوہ کی حیات وخدمات پر 9/ اکتوبر 2019 کا پلینری سیشن ڈاکٹر علی اکبر شاہ کی نظامت، اور سابق ڈین، فیکلٹی آف لا، اے ایم یو علی گڑھ، پروفیسر محمد شبیر صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ ناظم اجلاس ڈاکٹر علی

اکبر شاہ نے رسمی کلمات کے بعد کلیدی خطبہ پیش کرنے کے لیے اعزازی صلاح کار انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ، اے ایم یو، پروفیسر آذرمی دخت صفوی صاحبہ کو مائک پر تشریف لانے کی زحمت دی۔

محترمہ نے اپنی گفتگو کا آغاز فارسی کے ایک شعر سے کیا۔ آپ نے نام اور کام کے امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب کا ایک شعر پڑھا کہ۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

محترمہ کے اس شعر کی قرأت کا مقصد اختلافِ رنگ ونسل میں اتحاد کی قوت و اہمیت واضح کرنا تھا، جیسے رنگ رنگ موتیوں سے پروئے ہوئے ہار کی خوش رنگی وخوشنمائی میں دلکشی پیدا ہوجاتی ہے، محترمہ آذرمی دخت صفوی کی گفتگو نہایت علمی تھی۔ اپنی بات کو باوزن و باوقار انداز میں پیش کرنے کے لیے آپ نے جگہ جگہ مناسب فارسی اقتباسات واشعار نقل کیے۔ درمیانِ گفتگو انگریزی کا سہارا بھی لیا۔ محترمہ کے مقالے میں دارا سے قبل کے صوفیائے کرام کا حوالہ موجود تھا۔ جہاں ماضی میں ایکتا کا درس دیا جاتا تھا۔ آپ نے اپنی گفتگو میں ایک حقیقت بیان کی کہ "خسرو کے بقول سنسکرت دنیا کی سب سے مکمل زبان ہے۔"

پروفیسر آذرمی دخت صفوی صاحبہ نے ماضی کی بازیافت کرتے ہوئے صراحت کی کہ داراشکوہ نے کوئی اجنبی بات نہیں کہی ہے اس کے سامنے درباری تاریخ میں یکجہتی کا ماضی تھا۔ جس کی داغ بیل اکبری دربار میں پڑی تھی۔ دربارِ اکبری کے ایک شاعر عرفی کا قومی یکجہتی پر مشتمل شعر پڑھا۔ گویا دارا کے سامنے ایک ایسا ماضی تھا جس کو بنیاد بنا کر دارا نے قومی یکجہتی کی عمارت تعمیر کی لیکن اس دنیا نے ہر سچے کو زہر کا پیالہ دیا۔ دارا نے پرانی شراب کو نیا گلاس دیا۔ اس نے عرفانی روایت کو ہم عصر موڑ دیا۔ سائنٹفک انداز میں ڈھالا۔ دراصل دارا نے توحید کا علم اپنشد سے حاصل کیا۔ بقول آذرمی دخت صفوی "دنیا کا کوئی نظام منطق کے بغیر نہیں چل سکتا، ہر سچے کو زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے، انسانی سماج کو رفتار وترقی دینے میں دارا نمبر ایک پر تھا" انھیں باتوں کے ساتھ محترمہ نے اپنا کلیدی خطبہ مکمل کیا۔ تاہم ناظم اجلاس ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے صدارتی کلمات کے لیے پروفیسر شبیر صاحب کو دعوت دی۔ موصوف کی گفتگو مکمل انگریزی زبان میں تھی۔ اوّل تا آخر انگریزی زبان میں ہی آپ نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ انھوں نے موجودہ ماحول پر تنقید کرتے ہوئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر گفتگو کی اور پچھلے مقررین کی باتوں کو دہراتے ہوئے داراشکوہ کے خیالات کو عملاً نافذ کرنے کی تجویز پیش کی۔ بعد ازاں دوپہر ایک بجے سے ڈیرھ بجے تک وقفہ برائے ظہرانہ ہوا۔

پہلا اجلاس: 9 **اکتوبر** 2019 **دوپہر**

9 اکتوبر 2019، دوپہر 1:30 سے 3:00 بجے کے لیے سمینار کے پہلے اجلاس کی کارروائی زیر صدارت طلحہ رضوی برق شروع ہوئی۔ نظامت کے فرائض ممتاز عالم رضوی نے ادا کیے۔ جبکہ اجلاس کے پہلے مقالہ نگار پروفیسر سید عین الحسن صاحب کے مقالے سے داراشکوہ پر گفتگو کا آغاز ہوا۔ پروفیسر سید عین الحسن صاحب نے اپنے مقالے کو بارہ نکات کے تحت پیش کیا۔ اس لیے ان کی گفتگو جامع تھی۔ خاص طور پر انھوں نے داراشکوہ کے تصور وحدت الوجود، اور روحانیت پر بات کی۔ ان کا مقالہ بیشتر تحلیل نفسی کا احاطہ کرتا ہوا محسوس ہوا۔ پروفیسر سید عین الحسن کی گفتگو کا لب لباب یک قومی نظریے پر تھا۔ چاہے مذاہب کچھ بھی ہوں گویا موصوف کے تصور کے مطابق تمام ادیان و مذاہب نیز ملتیں جب یکجا ہوتی ہیں تو ایک قوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو سے وضاحت ہوتی ہے کہ دارا کے نزدیک ملکی سرحدوں کے اندر پائی جانے والی تمام ملتیں ایک قوم ہیں۔ اس لیے انھیں ہر ایک کے جذبات و اعتقادات کا احترام لازم ہے۔ بصورت دیگر ملک و سلطنت میں تزلزل و بے چینی کا عالم ہوگا جس سے ملک کمزور ہوگا۔ طوائف الملو کی کا راج ہوگا۔

اس اجلاس کے دوسرے مقالہ نگار، پروفیسر سید محمد عزیزالدین تھے، عزیز الدین صاحب نے طوالت سے گریز کرتے ہوئے، بحیثیت مجموعی مغلیہ اندازِ حکمرانی پر گفتگو کی۔ دارا کے طرزِ حیات و اندازِ فکر پر روشنی ڈالی۔ ان کے بقول ''داراشکوہ صوفی نہیں تھا'' مغلیہ عہد پر بات کرتے ہوئے آپ نے اس عہد کی علمی خدمات بیان کیں خاص طور پر ترجمہ نگاری کے ضمن میں یہ عرض کیا کہ اس وقت بھی ترجمہ نگاری کی باقاعدہ ایک ٹیم تھی۔

عزیز الدین صاحب نے عہد شاہجہانی پر گفتگو کرتے ہوئے طرزِ حکمرانی پر اظہار خیال کیا نیز داراشکوہ پر کفر و الحاد کے فتوے پر روشنی ڈالی اور قتلِ دارا کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ دارا اور اورنگ زیب کے درمیان کفر و اسلام کی جنگ نہیں تھی بلکہ پورا معاملہ حصولِ تخت و تاج کا تھا'' عزیزالدین صاحب نے خضر آباد کے قریب پارک کا ذکر کیا نیز اس پارک کو داراشکوہ کے نام پر کرنے کی تجویز پیش کی۔ اسی دوران یہ بات آئی کہ یہ اقدام شروع تھا لیکن کسی سبب سے التوا میں پڑا ہوا ہے۔

اس اجلاس کے تیسرے آخری مقالہ نگار شریف حسین قاسمی صاحب تھے۔ شریف حسین قاسمی صاحب نے ڈاکٹر کرشن گوپال کی تقریر کی تعریف و توصیف کی۔ قاسمی صاحب کا مقالہ ہند کی دیرینہ تہذیب پر محیط ہے۔ ذکر دارا کے ضمن میں آپ نے انکشاف کیا کہ دنیا کی تمام لائبریریوں میں دارا کی کسی نہ کسی کتاب کا نسخہ موجود ہے۔ موصوف نے ہندوستان کی اولین تاریخ نویسی اور ترجمہ نگاری پر اظہار خیال کیا۔ اپنشد کا ترجمہ سرا کبر کا ذکر کیا۔ قاسمی صاحب کے بقول واردانِ ہند نے ہندوستان میں ہندوستان کو سمجھنے کی انتھک کوشش کی۔ اکبر ہندوستان کے ہندو و مسلمان کے اختلاف کو دور کرنا چاہتا تھا۔ شریف حسین قاسمی صاحب نے دارا کے اس واقعہ خواب کا ذکر کیا جس میں دارائے وششٹھ اور رام کو دیکھا تھا۔ قاسمی صاحب نے اس خواب کے واقعے کی اجمالاً تفصیل بیان کی۔ ان کا مقالہ نہایت وقیع و تحقیقی تھا۔ ترجمہ نگاری میں اس وقت ٹیم ورک کی تائید شریف صاحب نے کی۔ قاسمی صاحب کے بقول ''دارا نے یہ سب کام چوالیس سال کی عمر میں کیا۔ وہ سلطنت کا دلدادہ نہیں علم کا پیاسا تھا، مادیات سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، دارا نے سونے کی کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش دل سے قبول نہیں کی، عارفوں کی نظر عرش پر بھی نہیں ہوتی کرسی کیا چیز ہے'' انھیں وضاحتوں کے ساتھ شریف حسین قاسمی کی گفتگو تمام ہوئی۔ نیز صدارتی خطبے میں طلحہ رضوی برق نے تصوف کے معانی پر اظہارِ خیال کیا اور چند اشعار پر اپنی بات ختم کی۔ اس طرح پہلے اجلاس کی تکمیل بحسن و خوبی تین بجے ہوئی اور چائے کے وقفے کے لیے مجلس برخاست ہوئی دوسرے اجلاس کا آغاز 3:15 بجے ہوا۔

دوسرا اجلاس: 9 **اکتوبر** 2019، 3:15 **سے** 5:30 **بجے**

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے ادا کیے۔ اس اجلاس کے پہلے مقالہ نگار، پروفیسر سید حسن عباس تھے جنھوں نے داراشکوہ کی علم دانی و تصنیفی خدمات کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز داراشکوہ کی تصنیف 'مجمع البحرین' کے سرورق پر تحریر شعر سے کیا۔ پروفیسر سید حسن عباس نے واضح کیا کہ داراشکوہ کو شعرگوئی سے گہرا شغف تھا، وہ قادری تخلص کرتے تھے۔ موصوف نے دارا کے چند مخطوطوں کی ہیئت پر گفتگو کی۔ درمیان میں ترجمہ نگاری کا ذکر بھی کیا۔ پروفیسر سید حسن عباس کی گفتگو سے محسوس ہوا کہ وہ متون پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی گفتگو داراشکوہ کی علوم سے دلچسپی، تصنیف وتالیف سے شغف نیز علمی و تصنیفی خدمات پر محیط تھی۔ سید حسن عباس کی گفتگو کے بعد ناظم اجلاس ڈاکٹر شفیع ایوب نے دوسری مقالہ نگار، محترمہ پروفیسر سلمیٰ محفوظ کو مقالہ سنانے کی دعوت دی۔ محترمہ، علی گڑھ یونیورسٹی میں سنسکرت کی پروفیسر ہیں۔ پروفیسر سلمیٰ محفوظ کا مقالہ ان کے وسیع مطالعے کا ثبوت بھی ثابت ہوا۔ آپ نے داراشکوہ کے اپنشد سے تعلق خاطر پر روشنی ڈالی اور اپنشد سے تحصیل علم کے ذرائع پر اظہار خیال فرمایا۔ اسلام و ہندو دھرم کی مماثلتوں سے متعلق دارا کے خیالات بیان کیے۔ جگہ جگہ سنسکرت کے اقتباسات بھی نقل کیے جن پر دارا نے کافی علمی کام کیا ہے۔ پروفیسر سلمیٰ محفوظ نے مجمع البحرین کی زبان اور لفظیات پر بھی گفتگو کی۔ داراشکوہ قرآن کا مطالعہ بھی کرتا تھا۔ قرآن کے تعلق سے اس کے خیالات وافکار پر محترمہ نے گفتگو کی، نیز دارا کی مطبوعات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر سلمیٰ محفوظ نے ویدانت کو آسمانی صحیفہ تسلیم کرتے ہوئے قرآن سے دلائل پیش کیے۔ آپ نے دارا کی حیات وموت پر بھی اظہارِ خیال کیا۔

اجلاس کا آخری مقالہ پروفیسر طلحہ رضوی برق نے پیش کیا۔ آپ نے مقالے کا عنوان 'اسلامی تصوف اور داراشکوہ' متعین کیا۔ پروفیسر رضوی نے بہت اختصار سے کام لیا۔ مقالے کا آغاز فارسی کے ایک شعر سے کیا اور قرآن کی آیت بھی پڑھی۔ آپ تصوف کی تعریف بیان کرتے ہوئے فارسی کے اشعار سناتے رہے۔ جامع گفتگو کرتے ہوئے داراشکوہ کے مطالعہ اسلام و ہندو دھرم پر روشنی ڈالی۔ نیز دونوں مذاہب کے انسلاکات وامتزاج کو اجمالاً بیان کیا جو قومی یکجہتی کے لیے روشنی ثابت ہوتے ہیں۔ طلحہ رضوی برق کے اختتام مقالہ پر ناظم اجلاس شفیع ایوب نے صدارتی خطبے کے لیے پروفیسر شریف حسین قاسمی کو مائک پر آنے کی دعوت دی۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر سلمیٰ محفوظ سے گزارش کی کہ سرِّ اکبر کے ابتدائی پانچ صفحات کے ترجمہ پر فارسی دانوں سے نظرثانی کرائیں۔ انھیں مباحث کے بعد اجلاس اختتام پذیر ہوتا ہے۔ نیز داراشکوہ کے شائقین کے لیے دوسرے دن یعنی دس اکتوبر تک غور وفکر اور انتظار کا موقع ملا۔

پلینری سیشن: 10/ **اکتوبر** 2019، **صبح** 10:00 **سے** 11:00 **بجے**

دس اکتوبر کا پلینری سیشن ایک گھنٹے پر مشتمل تھا۔ نظامت ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے کی۔ جبکہ مقالہ نگار، امر حسن سیریا سے تشریف لائے تھے۔ امر حسن نے اپنا مقالہ

انگریزی زبان میں پڑھا۔ آپ نے اپنے مقالے میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور داراشکوہ کو لازم وملزوم قرار دیا۔ ان کی گفتگو سے واضح ہوا کہ داراشکوہ اور ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی ہم آہنگی قدرتی تھی۔ امر حسن نے داراشکوہ کے معاشرتی افکار و خیالات کے مطالعے پر مبنی دارا کی حیات کا مکمل جائزہ لیا۔ درمیانِ گفتگو ڈاکٹر کرشن گوپال کا ذکر کیا۔ صوفی سماج سے دارا کی قربت پر روشنی ڈالی۔ نیز دارا کی المیہ داستان کا تذکرہ کیا نیز قادریہ سلسلے سے دارا کی وابستگی پر اظہارِ خیال کیا۔ امر حسن نے دارا کی تصنیفات کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے اقتباسات کی روشنی میں دارا کے جذبہ انسانیت کی صراحت کی۔ دارا پر منصور حلاج کی عنایات کا ذکر کیا نیز رام چندر اور وششٹھ کے واقعہ خواب کی وضاحت کی۔ امر حسن کے مقالے میں کافی وسعت تھی۔ آپ نے ہندو مسلم تصوف و بھکتی کی اصطلاحات، وحدت الوجود، اس وقت کے سیاسی حالات نیز ہندو مسلم اتحاد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ جہاں داراشکوہ کی روحانیت سے دلچسپی کا ذکر کیا وہیں اورنگ زیب کے تخت وتاج سے دلچسپی بیان کی۔

دس اکتوبر کے پلینری سیشن کے دوسرے مقالہ نگار ڈاکٹر عطاء اللہ سنجری، کیرلہ سے تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر عطاء اللہ نے اپنے مقالے کا آغاز تعارف کے انداز میں شروع کیا۔ آپ نے ابتداء سیریا سے تشریف لائے مقالہ نگار امر حسن کے مقالے کی تعریف کی۔ امر حسن کو مخاطب کرتے ہوئے سیریا کے کشت وخون نیز خلفشار کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا نیز ڈاکٹر کرشن گوپال کے مقالے کو وقیع بتایا۔ ڈاکٹر عطاء اللہ خان نے قرآن کے سماجی و معاشرتی پہلو پر گفتگو کی۔ مغلیہ سلطنت کے حوالے سے مشتاق یوسفی اور اقبال کے ضمن میں کہا کہ ''بھائیوں کا سا سلوک کروں گا یعنی چن چن کر قتل کروں گا'' محترم مقالہ نگار نے وکی پیڈیا کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے اس سے استفادے پر روشنی ڈالی۔

اختتام مقالہ پر ناظم اجلاس ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے وقفۂ چائے نوشی کا اعلان کیا۔ بعد ازاں 11 بج کر 15 منٹ پر تیسرے اجلاس میں شرکت کے لیے سامعین نے دوبارہ اپنی اپنی نشستیں اختیار کیں۔ صدارت، پروفیسر اخترالواسع صاحب نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض، ڈاکٹر محمد کاظم نے ادا کیے۔

تیسرا اجلاس: 15 **اکتوبر** 2010، **صبح،** 11:15 **سے** 1:00 **بجے**

تیسرے اجلاس کے پہلے مقالہ نگار، مشتاق احمد تجاروی، استاذ، جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے تشریف لائے۔ ان کے مقالے کا عنوان 'داراشکوہ اور حضرت میاں میر' تھا۔ مشتاق احمد تجاروی نے مقالہ شروع کرنے سے قبل، داراشکوہ اور گوتم بدھ کی ذہنی وفکری ہم آہنگی کی طرف اشارہ کیا۔ تاریخ کی یہ دونوں ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے تخت وتاج و درباری عیش وعشرت کو ٹھوکر مار کر دربدری کی زندگی پسند کی جس میں انھیں لطف وانبساط اور طمانیت قلب نصیب ہوئی۔ مقالہ خوانی کے دوران ڈاکٹر مشتاق تجاروی نے داراشکوہ کی میاں میر سے تین ملاقاتوں کا انکشاف کیا، نیز خط وکتابت کے سلسلے پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپنے مقالے میں دارا کی صوفیا سے عقیدت، خاص طور پر میاں میر کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ درمیان میں ملا شاہ کا ذکر بھی آیا۔ مشتاق تجاروی کی تحقیق کے مطابق میاں میر سے جہانگیر کی خط وکتابت کا سلسلہ بھی رہا۔ تجاروی صاحب نے داراشکوہ کی شاعرانہ صفت وخوبی پر گفتگو کرتے ہوئے میاں میر کی عقیدت میں قادری تخلص اختیار کرنے کی بات کہی۔ دارا کے چند قرآنی آیات کے تراجم کا ذکر کیا۔ تنگیِ وقت کے سبب ڈاکٹر مشتاق تجاروی نے مقالہ پڑھنے کے بجائے زبانی گفتگو سے کام لیا۔

تیسرے اجلاس کے دوسرے مقالہ نویس، پروفیسر اخلاق آہن تھے، آپ نے 'مشترکہ ہندوستانی روایات اور داراشکوہ' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ان کا مقالہ داراشکوہ کی ادبی وتصنیفی خدمات پر مشتمل تھا جس کی روشنی

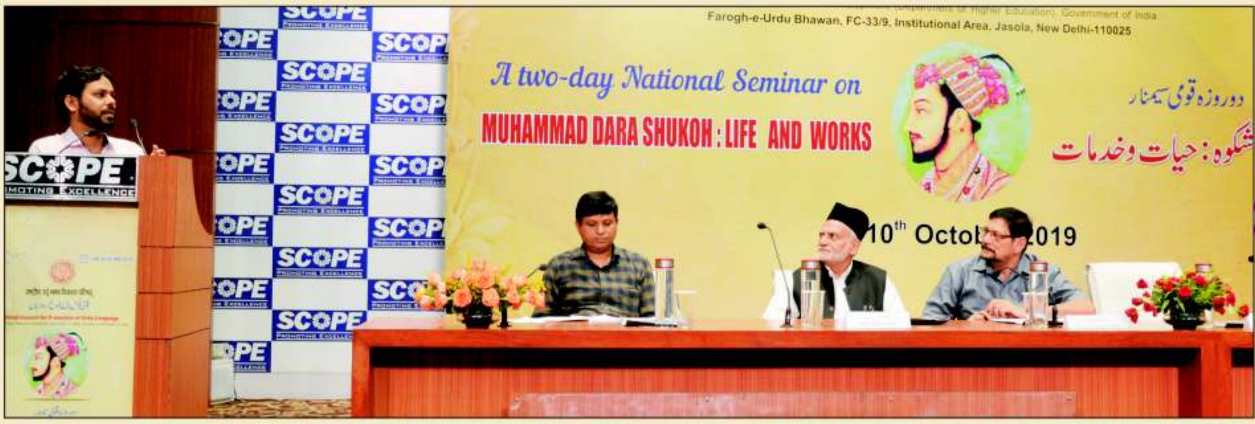

میں انھوں نے ہندوستان کی مشترکہ روایات سے متعلق داراشکوہ کے ادب پاروں کا جائزہ لیا۔ خاص طور پر دارا کی رباعیات پر گفتگو کی۔ ضمناً عمر خیام کا ذکر بھی کیا۔ پروفیسر آہن نے داراشکوہ کی رباعی گوئی کے یک موضوعی پہلو پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ''اسی سبب سے وہ ممتاز ہے، دارا پوری فارسی روایت میں اپنی رباعی گوئی کے سبب منفرد ہے'' پروفیسر اخلاق آہن نے 'سرِّ اکبر'، 'سرالاسرار' کے مغرب میں متعارف ہونے کا ذریعہ، مغرب میں ہندوستانی مذاہب کی رسائی کا وسیلہ داراشکوہ کو بتایا۔

دارا کے بڑے ادیب و شاعر ہونے نیز فارسی شاعری کے گہرے مطالعے کے ضمن میں پروفیسر اخلاق آہن نے دارا کی 133 غزلوں اور 180 رباعیات کا ذکر کیا۔ انھیں تفصیلات کے ساتھ مقالہ اختتام کو پہنچا اور ناظم اجلاس نے تیسرے مقالہ نگار علیم اشرف جائسی کو دعوت مقالہ خوانی دی، جو حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ علیم اشرف جائسی نے اپنے مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد اولاً دارا کی زندگی پر گفتگو کی۔ دوسرے حصے میں دارا کے تعلق سے تصوف پر اظہارِ خیال کیا اور تیسرے حصے میں معاصر صوفیا پر بات کی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا حوالہ دیا نیز اقتباس بھی نقل کیا۔ آپ نے اپنی گفتگو کے دوران داراشکوہ کی فرضی انگوٹھی کے قصے پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہ انگوٹھی صرف قصے کی حد تک ہے اصل میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ سفینۃ الاولیا کا ذکر کرتے ہوئے دارا پر الحاد کے تصور کو حتمی طور پر رد کرتے ہوئے کہا کہ داراشریعت کے خلاف کبھی نہیں تھا۔ علیم اشرف جائسی نے وحدت الوجود پر نہایت بلیغ گفتگو کی۔ ملا شاہ کی تعریف کرتے ہوئے اشعار پیش کیے۔ میر عبدالواحد بلگرامی کے نزدیک کرشن جی کی شان میں پڑھے گئے اشلوک سماع کی محفلوں میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ جائسی صاحب نے دارا کے عہد پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی بات تمام کی۔ بعد ازاں ناظم اجلاس ڈاکٹر محمد کاظم نے آخری مقالہ نگار، پروفیسر عبدالقادر جعفری کو دعوت مقالہ خوانی دی۔

پروفیسر عبدالقادر جعفری کے مقالے کا موضوع 'داراشکوہ اور مسئلہ وحدت الوجود' تھا۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے موصوف نے مائک پر آتے ہی مقالہ خوانی شروع کردی۔ آپ کا مقالہ تصوف کی اہمیت وضرورت پر بہت وقیع تھا۔ آپ نے تصوف کے سلسلے میں سلسلۂ قادریہ کو تفوق دیا۔ درمیانِ مقالہ خوانی آپ نے حبسِ دم (سانس روکنا) پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری کا مقالہ 'محبّ اللہ الہ آبادی، وحدت الوجود، وحدت الشہود اورنگ زیب کا عہد اور داراشکوہ کے ہندو مذہب کے مطالعے پر مبنی تھا۔ جعفری صاحب کے بقول ''دارا کا اصل مقصد ہندو و مسلمانوں کے درمیان خلیج کو پاٹنا تھا، جو کام اکبر نے کیا تھا، حق کی شناخت میں لفظوں کے سوا کوئی فرق نہیں''، جعفری صاحب نے مجمع البحرین کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالی نیز دارا اور بابا لال کے مکالمات پر اظہار خیال فرمایا اور کہا کہ دارا نے تصوف والٰہیات پر بڑی دقیق نظر سے مطالعہ کیا تھا'' انھیں خیالات کے ساتھ جعفری صاحب کا مقالہ تکمیل کو پہنچا، اور صدارتی کلمات کے لیے پروفیسر اختر الواسع صاحب مائک پر تشریف لائے۔ آپ نے مختصر گفتگو کی اور دارا کا سلسلہ امیر خسرو سے ملایا۔ آپ نے کہا کہ ''امیر خسرو کے باپ ترک تھے لیکن ماں ہندوستانی تھی، دارا نے مجادلے اور مباحثے کے دور میں مکالمے کی بنیاد رکھی، مذہبی آزادی خدا کی دین ہے، ہر کسی کو اپنا عقیدہ اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ میاں میر کی ہندوستان میں بڑی اہمیت ہے۔ دارا اسی روایت سے جڑے تھے، وحدت الوجود اور شہود، اسلام اور ہندو دھرم

میں بھی موجود ہے۔ آخر میں پروفیسر اختر الواسع صاحب نے بہادر شاہ ظفر کا شعر۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا وہ ہو کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

انھیں باتوں پر صدارتی کلمات مکمل ہوئے اور ایک بجے سے ڈیڑھ بجے تک ظہرانے کا وقفہ ہوا۔

چوتھا اجلاس: 10 **اکتوبر** 2019، **دوپہر** 1:30 **سے** 3:00 **بجے**

10 اکتوبر 2019 ، ایک بج کر 30 منٹ پر چوتھے اجلاس کا آغاز ہوا۔ صدارت کی ذمے داری، فارسی اسکالر، پروفیسر سید حسن عباس نے ادا کی۔ اس اجلاس کے پہلے مقالہ نگار ڈاکٹر محشر کمال حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ ان کے مقالے کا عنوان 'ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مجمع البحرین کی روشنی میں' تھا۔ محشر کمال نے اپنے مقالے کا آغاز ہندوستان میں واردینِ سلاطین سے کیا۔ قدیم صوفیا کرام کی تعلیمات نیز ان کے حصولِ علم کی تفصیل بیان کی۔ محشر کمال نے داراشکوہ کی دو ایجاد کردہ اصطلاحات کا ذکر کیا نمبر ایک مذہبِ برحقِ صوفیا نمبر دو مذہب موحدانِ ہند۔ بقول محشر کمال ''اسلام اور دوسرے مذاہب میں اگر فرق ہے تو اس کے اسباب ہیں، معاشرتی امتیاز، اسلام اور دوسرے مذاہب میں جو خلا ہے دارا نے اسے پر کرنے کی کوشش کی، مجمع البحرین کی تصنیف کا مقصد دونوں مذاہب کے تقابلی مطالعے کے بعد اس کے مشترک نکات کی نشاندہی کرنا تھا'' محشر کمال نے اپنے مقالے میں اختصار و ایجاز سے کام لیا اور کم وقت میں اپنا مقالہ مکمل کیا۔ بعد ازاں معین شاداب، ناظم اجلاس نے دوسرے مقالہ نگار پروفیسر عراق رضا زیدی کو دعوت مقالہ خوانی دی۔

پروفیسر عراق رضا زیدی نے مقالہ شروع کرنے سے قبل ایک خوش آئند اطلاع یہ دی کہ عادل رشید کے پاس داراشکوہ کا سارا سرمایہ موجود ہے۔ اگر کوئی کام کرنا چاہے تو ان سے مدد لے سکتا ہے۔ زیدی صاحب نے کہا کہ مغلوب کی تاریخ نہیں لکھی جاتی، غالب کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی کا مقالہ داراشکوہ کی زندگی اور اس کی رباعیات کا احاطہ کرتا ہے۔ زیدی صاحب نے رباعی کے اوزان پر نہایت اہم باتیں گوش گزار کیں۔ دارا کی ایسی رباعیوں کا ذکر کیا جن میں عمر خیام کے مضامین ملتے ہیں۔ گویا داراشکوہ کا مطالعۂ رباعی بہت دقیق تھا۔ زیدی صاحب کے مقالے سے صراحت ہوتی ہے کہ دارا نے اپنی رباعیوں میں شہنشاہِ اکبر کے تصورِ صلحِ کل کے مضامین داخل کیے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے رباعیات اور ان کے تراجم سے اپنے مقالے کو نہایت وقیع بنایا۔ جگہ جگہ قرآنی آیات کے حوالے دیے۔ بقول زیدی صاحب ''داراشکوہ کی رباعیاں، بحر، دریا اور قطرہ کے استعارے سے معمور ہیں'' مقالہ خوانی کے دوران زیدی صاحب نے اپنے اشعار بھی سنائے، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں کے ذکر سے محفل کو گلزار بنا دیا۔ گفتگو کے درمیان اقبال کی رموزِ خودی اور رموزِ بیخودی کا حوالہ دیا۔ حدیثِ قدسی، کنزِ مخفیہ کا ذکر کیا۔ عشق و سمندر جیسے وسیع استعارے کو دارا نے بہت استعمال کیا ہے۔ انھیں خیالات کے بعد پروفیسر عراق رضا زیدی کا مقالہ اختتام کو پہنچا اور صدارتی کلمات کے لیے ناظم اجلاس معین شاداب نے سید حسن عباس کو آواز دی۔

سید حسن عباس نے صدارتی خطبے کا آغاز داراشکوہ کی غزل کے ایک شعر سے کیا۔ محشر کمال کے مقالے کی تعریف کرتے ہوئے اس پر تبصرہ کیا۔ مقالے کی روشنی میں آپ نے فرمایا کہ مشترکات کو پھر سے حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ سید حسن عباس نے پروفیسر عراق رضا زیدی کے قول ''مغلوب کی تاریخ نہیں لکھی جاتی، غالب کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بطور تائید کہا کہ فاتح کی تاریخ لکھی جاتی ہے مفتوح کی نہیں، انھیں خیالات پر چوتھا اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

پانچواں اجلاس:

پانچویں اجلاس کی نظامت غزالہ فاطمہ نے مائک سنبھالا اور کرسی صدارت کو زینت بخشنے کے لیے پروفیسر سید عین الحسن کو آواز دی۔ نیز اس اجلاس کی پہلی مقالہ نگار پدم شری، ڈاکٹر ناہید عابدی سے مقالہ خوانی کی درخواست کی۔ محترمہ نے اپنے مقالے کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا، یہ وضاحت ضروری ہے کہ محترمہ کا علمی و تحقیقی کام سنسکرت زبان میں ہے۔ اس لیے آپ نے بسم اللہ کا سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا ہے جسے پڑھ کر سنایا بھی۔ ان کا موضوع 'سرِّ اکبر' تھا۔ انھوں نے اپنا مقالہ ہندی زبان میں لکھا تھا۔ آپ کا مقالہ ایکتا و اتحاد، تقابلی مطالعے، دارا اور اورنگ زیب کے رویے، سلسلہ قادریہ، مغرب میں دارا کی تصنیفات کے تراجم نیز داراشکوہ کے تصورِ وحدت الوجود پر محیط تھا۔ ڈاکٹر ناہید عابدی نے اپنے مقالے میں بالخصوص اپنشد پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فارسی اور سنسکرت کے تراجم پر گفتگو کی۔ شنکراچاریہ کے حوالے سے 'اپنشد' لفظ کا تجزیہ پیش کیا نیز دارا کے 'سورت فاتحہ' کے سنسکرت ترجمہ کی قرأت کی اور سنسکرت کے اشلوک بھی پڑھ پڑھ کر سنائے نیز تراجم بھی کیے۔ محترمہ کے مقالے کا لب لباب داراشکوہ کے قومی یکجہتی کے نکات پر مبنی تھا۔ اختتام مقالہ پر ناظمِ اجلاس غزالہ فاطمہ نے دوسرے مقالہ نگار، پروفیسر محمد حبیب کو مقالہ خوانی کی دعوت دی جو پنجابی یونیورسٹی سے تشریف لائے

تھے۔ پروفیسر محمد حبیب کا مقالہ موجودہ عہد میں داراشکوہ کی اہمیت پر تھا۔ ان کے مطابق صوفی مومنٹ، بھگتی مومنٹ، اسلام، اکبر کا طرزِ مذہب اور سیاسی ضرورت و اہمیت، ان تمام طریقوں سے حق کو سمجھنے کی کاوش ہے۔ مقالہ نگار نے واضح کیا کہ اتحاد اور یکسانیت میں فرق ہے۔ اتحاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی اپنے عقیدے و ایمان کو ترک کر کے دوسرے کے ساتھ ہو جائے۔ سب کو اپنے اپنے عقیدے پر عمل کرتے ہوئے مل جل کر رہنا ہے۔ آپ کا مقالہ مسلم حکومتوں، مسلم تہذیب، اور اسلام کے امتیازات پر روشنی ڈالتا ہے۔ آپ نے روح اور مادے کے فلسفے پر بھی مدلل گفتگو کی۔ دورانِ گفتگو آپ نے قاضی عبدالستار کے ناول 'داراشکوہ' کے حوالے سے گفتگو کی اور ناول سے اقتباس بھی نقل کیا جو گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرتا تھا۔ اختتامِ مقالہ پر ناظم اجلاس غزالہ فاطمہ نے صدارتی کلمات کے لیے پروفیسر سید عین الحسن کو مائک پر آنے کی دعوت دی۔ پروفیسر سید عین الحسن نے اختصار سے گفتگو کرتے ہوئے پدم شری ڈاکٹر ناہید عابدی کے مقالے پر تبصرہ فرمایا اور ان کی سنسکرت دانی کی تحسین و توصیف کی۔ نیز محترمہ کی تبحر علمی پر اظہار خیال کیا۔ عین الحسن صاحب نے داراشکوہ اور بنارس کے متعلق چند اطلاعات بہم پہنچائیں کہ بنارس میں داراشکوہ کے نام کی ایک مسجد بھی ہے، ایک محلے کا نام بھی داراشکوہ کے نام سے جانا جاتا ہے وہیں ایک داراشکوہ کٹڑا بھی ہے۔ عین الحسن صاحب دارا کی مصروفیات کے باوجود اس کی تصنیفی خدمات کی تحسین و توصیف کی، دورانِ گفتگو دانتے، شیلی اور رومی پر بہت اچھی معلومات فراہم کی۔

اختتام اجلاس پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ بالخصوص ڈاکٹر کرشن گوپال، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، پروفیسر طارق منصور، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر، پروفیسر نجمہ اختر، قومی اردو کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر شاہد اختر، علی گڑھ یونیورسٹی، شعبۂ قانون کے پروفیسر شبیر احمد، پروفیسر آذر می دخت صفوی، طلحہ رضوی برق، پروفیسر سلمیٰ محفوظ، پروفیسر سید محمد عزیزالدین اور سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور آخر میں اس آخری اجلاس کو بحسن و خوبی اختتام تک پہنچانے پر غزالہ فاطمہ، جامعہ ملیہ کا شکریہ ادا کیا۔

■

Dr. Abdur Rasheed Azmi
M-109, Gul Marg Apts, First Floor
Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

مظفر حسین سید

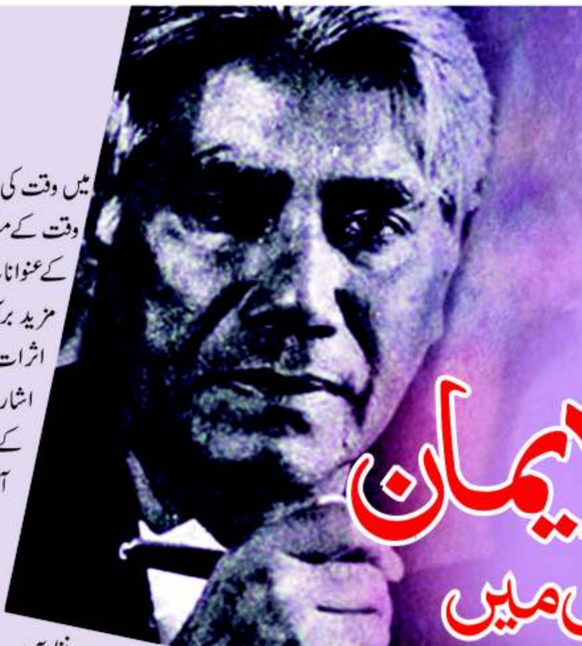

اخترالایمان کی شاعری میں وقت کا حوالہ

اس جہان کم نظراں میں

اختر الایمان جیسے اہل نظر عنقا نہیں تو ان کا فقدان ضرور ہے۔ وہ ہمارے عہد کے ایک روشن فکر، مگر محال الفہم اور پیچیدہ شاعر ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ غالب اور اقبال کے بعد، جن اردو شعرا کا کلام گنجینۂ معنی کے طلسم کے مماثل ہے، ان میں اختر الایمان سر فہرست ہیں، تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ ایک جانب ان کا ذہن جدید ہے، فکر جدید تر ہے، تکنیک نئی ہے، تو جانب دگر، ان کی زبان کلاسکی ہے، ان کے یہاں مشکل سے مشکل تر فارسی و عربی تراکیب کا استعمال بے محابا نظر آتا ہے۔ عہد حاضر کے شعرا میں جوش اور فیض کے بعد شاید وہی ہیں، جن کے یہاں زور بیان اور قدرت برزبان کے مظاہر جابہ جا نظر آتے ہیں۔ اختر الایمان کے یہاں ایک جانب اساطیری و تاریخی تلمیحات کا عالمانہ و پر جمال استعمال ہے، تو دوسری جانب داستانوی حوالے بھی اور کہیں وہی انداز بھی۔

اختر الایمان، بیسویں نہیں اکیسویں صدی کے شاعر تھے، اوّلاً، وہ غالب کی مانند عندلیب گلشن ناآفریدہ تھے۔ خود ان کے قول کے مطابق، کوئی انھیں گردانتا نہ تھا، مگر کئی عدد عشرے گزرے اور ہمارے فاضل نقادان ادب نے انھیں دریافت کیا، تو ان کی پذیرائی شروع ہوئی۔ خاکسار نے ایک مرتبہ ان سے استفسار کیا تھا کہ: ''آپ نے اپنے اکثر مجموعوں کے دیباچے خود کیوں لکھے ہیں، تو انھوں نے انکشاف کیا۔

''بڑے بڑے پروفیسر مجھ سے کہتے تھے کہ آپ کی شاعری ہماری سمجھ میں نہیں آتی، آپ اس کی وضاحت و صراحت کا سروسامان کیجیے، ستم ظریفی کہ یہ اساتذہ وہ ہیں جنھوں نے میری نظمیں داخل نصاب کر رکھی ہیں، تو میں نے اپنے ہر مجموعہ کا دیباچہ لکھنا شروع کیا اور یوں بھی کہ، جس سے کہتا کہ بھائی تقریظ لکھ دو، دیباچہ لکھ دو، وہ غچّہ دے جاتا۔ میراجی نے جیسے تیسے ایک بار لکھ دیا۔ پھر آمادہ نہ ہوئے، اس لیے صاحب! میں نے خود ہی شاعری بھی کی، مجموعے بھی ترتیب دیے اور ان کے دیباچے بھی لکھے۔ اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنے اشعار کا مطلب کچھ اور سمجھاتے ہیں، ہم کچھ اور سمجھتے ہیں، اور ہمارے شاگرد کچھ اور، تو بھائی میں کیا کر سکتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ جناب، آپ چاہے جو سمجھیے، آپ کو اختیار ہے، مجھے شعر کہنے دیجیے، مطلب آپ نکالتے رہیے کیونکہ تخلیق تو عوامی ملکیت ہوتی ہے، ایک بار عام ہونے کے بعد، اس پر تخلیق کار کا حق ختم ہو جاتا ہے۔''

یہ باتیں علی گڑھ کی ایک نجی ملاقات کی ہیں، اس قسم کے خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے کئی مصاحبات میں بھی کیا ہے، جو رسائل و جرائد کے صفحات میں محفوظ ہیں، نیز ان کے خود نوشت دیباچے، ان کی کلیات میں شامل ہیں۔

اختر الایمان کا ایک مصرع ہے۔ ع۔ گردش ایام میں کس کی لگن پیہم رہی۔ راقم اپنی بات یہیں سے شروع کرتا ہے۔ اس مصرع میں قدرے تصرف کر کے اگر یوں کہیں کہ۔ ع۔ گردش ایّام میں میری لگن پیہم رہی۔ تو بات مزید واضح ہو جاتی ہے اور جیسے اختر الایمان کے وقت کے تصور کی کلید ہاتھ لگ جاتی ہے۔

ان کی شاعری میں زمان و مکاں، دونوں کا حوالہ بڑے وسیع تناظر میں نظر آتا ہے۔ خصوصاً وقت، جہاں جہاں ان کا موضوع بنا ہے۔ وہ ان کی فکر، نیز مطالعہ کثیر کا پتہ دیتا ہے۔

اختر الایمان کے کل کلام کے اجمالی جائزے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ان کی فکر اور ان کے تخیل میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے براہ راست وقت کے موضوع پر، تین عدد نظمیں تخلیق کی ہیں، جن کے عنوانات ہیں، 'وقت کی کہانی، کال چکّر اور جیونی' مزید برآں، وقت کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اثرات کی جانب، کہیں واضح، کہیں خفیف سے اشارے کرتی ان کی متعدد نظمیں موجود ہیں، جن کے عنوانات ہیں، نئی صبح، پس منظر، جب اور اب، آخر شب، یہ دور، سحر، بنت لمحات، ساتویں دن کے بعد، زندگی کا وقفہ، دن کا سفر، جب گھڑی بند تھی اور شب و روز، وغیرہم۔ علاوہ ازیں اور بھی چند نظمیں ہیں، جن پر وقت سایہ فگن ہوتا نظر آتا ہے، مگر ان میں وقت پر کوئی تبصرہ نہیں ہے اس لیے ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ یوں بھی یہ کوئی مکمل اور جامع فہرست نہیں، محض مثالیں ہیں۔

انھوں نے وقت کے ضمن میں اپنا نظریہ بہ نفس نفیس واضح کیا ہے۔

وہ یوں رقم طراز ہیں:

''میری نظموں میں وقت کا تصور اس طرح ملتا ہے، جیسے یہ بھی میری ذات کا ایک حصّہ ہے۔ اور یہ طرح طرح سے میری نظموں میں میرے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی یہ گزرتے وقت کا علامیہ بن جاتا ہے، کبھی خدا بن جاتا ہے تو کبھی نظم کا ایک کردار۔''

اپنی بات کی تشریح مزید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''(میری نظم) 'باز آمد' میں رمضانی قصائی وقت ہے۔ 'بیداد' میں خدا وقت ہے۔ 'وقت کی کہانی' میں گرداب زیست وقت ہے اور کوزہ گر' میں سامری وقت ہے۔ وقت جبرئیل امیں ہے، جو زمیں سے تاحدِّ نظر مسلط ہے (اور) ہماری گزران حیات پر ہے، (اور) جس کے پاؤں تحت الثریٰ سے بھی نیچے ہیں اور سر عرش معلّی کے اوپر۔ ساتھ ہی یہ تصور نہ مایا کا تصور ہے، نہ فنا کا۔ یہ ایک ایسی زندہ و پائندہ ذات ہے، جو 'انت' ہے، جو اگر وقت نہ ہوتی تو خدا سے بڑی کوئی چیز ہوتی۔ اس لیے کہ اس کے ہاتھوں، خدا کی شکل و صورت اور تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔''

(بحوالہ: دیباچہ بنت لمحات، 1949)

اپنے مجموعے 'آب جو' (1989) کے دیباچے میں بھی انھوں نے وقت کے تئیں اپنے نظریے کے باب میں اشارتاً چند جملے رقم کیے ہیں۔ مثلاً:

''(میری نظم) 'مسجد' میں جوندی مسجد کے قریب بہتی ہے، وہ وقت کا دھارا ہے''۔ ایک اور جملہ ہے۔ ''اسی طرح میری نظم 'موت' میں مسلسل دستک کی آواز، وقت کی وہ آواز ہے، جو کبھی بند نہیں ہوتی، ہمیشہ زندگی

کے دروازے کو کھٹکھٹاتی رہتی ہے''۔

اپنے مجموعے 'یادیں' کے دیباچے (1961) میں وہ یوں رقم طراز ہیں '' میری بیشتر شاعری میں ایک یاد کا سارنگ ہے۔ اب کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ یاد کا تعلق ماضی سے ہے، اور ماضی وقت ہے''۔

اختر الایمان کی شہرۂ آفاق نظم، 'ایک لڑکا' بھی کم و بیش موضوع وقت کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ نظم اتنی وقیع و بسیط ہے کہ اس پر ایک علاحدہ مضمون رقم کیا جانا چاہیے۔ اپنے مجموعے 'آب جو' (1959) کے دیباچے میں اختر الایمان نے اس نظم کی وجہ تخلیق، اس کے پس منظر اور محاکات پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے اس کے حوالے اور اس کا تجزیہ راقم کے اصل مضمون میں شامل ہے، یہاں اس عبارت، نیز اس طویل نظم کے اقتباسات کا محل نہیں۔

بغرض صراحت مزید، یہاں ان کی نظموں کے چند بند پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ان کی شہرہ آفاق نظم 'یادیں' کا اولین بند ملاحظہ فرمایئے۔

لو وہ چاہ شب سے نکلا پچھلے پہر پیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رکتے رکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر خوابوں کے افسردہ شِہاب
سب کے سب خاموش، زباں سے کہتے ہیں، اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پَل ہو، گزری بات ہے، نقش برآب
یہ روداد ہے اپنے سفر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی، اس آباد خرابے میں

یہاں ماضی، پارینہ، یادوں کے دفتر، گزری بات، صدی، پل، روداد، سفر اور بسر، یہ تمام الفاظ وقت کے مظہر ہیں اور اسی پر مبنی ہیں۔

دو مصرعے اور، نظم، 'وقت کی کہانی' سے۔

وہ یار کھو گئے، گرداب زیست میں سب آج
ہمارے پہلو میں جو بیٹھے تھے، جیسے صنم!

ایک اور مثال، نظم 'مناجات' سے۔

ہر لمحہ قبر ہے گئے لمحے کی، ہر نَفس
پہلے نَفس کی گور ہے، افسردہ ہوگئے

اس میں الفاظ 'لمحہ'، 'لمحے، وقت کی علامت ہیں اور 'نَفس' بھی وقت کا علامیہ ہے، گرچہ قلیل العمر ہے۔

مذکورہ مصرعے سن کر، اگر فانی کا مشہور شعر یاد آجائے تو امر حیرت نہیں۔

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مرمر کے جیے جانے کا

دو مثالیں، نظم 'جب گھڑی بند تھی' سے۔

وقت سے بے خبر بھی رہی ہو
صبح تو آئے گی
شام تو جائے گی
شام اور صبح کے بین جو رنج ہیں
اور خوشیاں ہیں جو
خود بخود ساتھ ہو جائیں گے۔

تین مصرعے اور اسی نظم سے۔

جب گھڑی بند ہوگی تو کیا بیتنے والے پل
چھاؤں پاکر، کہیں سب ٹھہر جائیں گے
وقت سے پہلے مر جائیں گے

یہاں گھڑی تو وقت کی میزان ہے، نیز وقت، صبح، اور شام، یہ تمام الفاظ وقت کے علامیے ہیں۔

اختر صاحب کی ایک بے عنوان نظم ہے، جو غالباً 'کلیات' سے قبل کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی تھی، اور ان کے غیر مطبوعہ مسودوں میں گم تھی، اسے بیدار بخت نے تلاش کر کے اپنے مضمون: 'کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ' میں درج کیا ہے۔ اس سہ سطری نظم میں بڑی معنی آفرینی ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

ناظر ہوں میں، سب دیکھتا ہوں بنتے بگڑتے
رکھا ہے مرے سامنے آئینۂ ایام
آئے ہیں، علم لے کے گزر جاتے ہیں پل میں

یہاں اس بیان کی ضرورت نہیں کہ یہاں 'آئینۂ ایام'، کی ترکیب اور پل کا لفظ دونوں، وقت کی علامت ہیں۔

دیکھیے کتنی چھوٹی سی مگر بڑی بات ہے۔ ان کی ایک نامکمل نظم کا صرف ایک مصرعہ سنیے۔ ع۔ میں تاریخ کی دھول میں کھو گیا۔ ظاہر ہے کہ تاریخ خود وقت کا بیانیہ ہے۔ پتہ نہیں شاعر کیا کہنا چاہتا تھا، جو کہہ نہ سکا۔

ایک نظم 'نئی صبح' ہے۔ اس کے آخری دو مصرعے، بڑے بامعنی ہیں، سماعت فرمایئے۔

دھوپ سی ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبور جوانی
کیا جانے کب سورج نکلے، بستی جاگے غم مٹ جائیں

یہاں 'ڈھل، بیت، جوانی اور کب، یہ تمام الفاظ وقت کے علامیے ہیں ویسے تو یہاں 'دھوپ سی' اور 'مجبور جوانی' جیسے اظہارات میں بڑے معنی پوشیدہ ہیں، مگر، سر مضمون ہٰذا یہ موضوع گفتگو نہیں، لہٰذا اس بحث سے گریز۔

کسی کی یاد میں کہی گئی ایک نظم 'شفقی' ملاحظہ فرمایئے اس کا یہ ابتدائی بند۔

رنگوں کا چشمہ سا پھوٹا ماضی کے اندھے غاروں سے
سرگوشی کے گھنگرو کھنکے گرد و پیش کی دیواروں سے
یاد کے بوجھل پردے اٹھے، کانوں میں جانی انجانی
لوچ بھری آوازیں آئیں، جیسے کوئی ایک کہانی

اگرچہ یہاں وقت، موضوع نظم نہیں، یہ خالصتاً رومانی نظم ہے، تاہم اس میں بھی 'ماضی' یاد، جیسے الفاظ وقت کا حوالہ دیتے نظر آتے ہیں اور کہانی تو خود ہی کسی گزرے واقعے کا بیانیہ ہوتی ہے، جس کا منبع وقت ہی ہوتا ہے۔

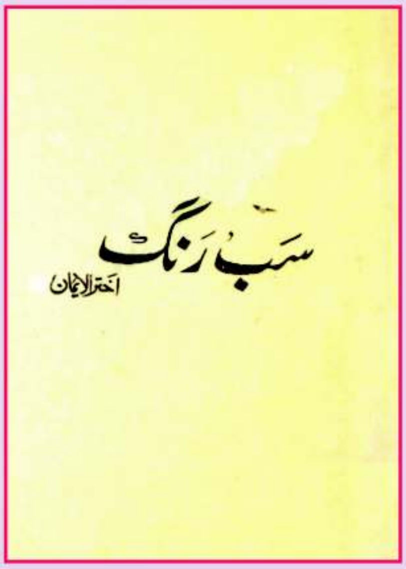

ان کی ایک نظم ہے، 'زندگی کا وقفہ'، اس کے صرف دو مصرعے ملاحظہ فرمایئے، دیکھیے کیا معنی آفرینی ہے۔

خود کو سو ناموں سے بہلاتے رہو، چلتے رہو
سانس رک جائے جہاں، سمجھو وہیں منزل ہے

اب کیا یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ 'سانس' بہ معنی خود وقت کا لمحے سے بھی صغیر تر جزو ہے۔ جس کا گزرنا وقت کا سفر ہے۔ یعنی ہر پل گزرتے ہی ماضی ہوجاتا ہے۔ دراصل، صرف دو زمانے ہیں، ماضی اور مستقبل۔ درمیانی وقفہ حال کا ہے، جس کی عمر محض ایک لمحہ بھی نہیں، ابھی حال تھا، ابھی ماضی ہوگیا، اور مستقبل سے جو لمحہ آیا، وہ بھی پلک جھپکتے، نفس آتے جاتے میں ماضی ہوگیا۔ اس فلسفیانہ موضوع پر گفتگو کی بڑی گنجائش ہے، مگر سردست مہلت نہیں۔ یہ تمام باتیں اختر الایمان نے نہیں کہی ہیں، کوئی شاعر، کوئی تخلیق کار پوری بات نہیں کہتا، وہ یہ فریضہ قاری کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ مگر قاری ہونا شرط ہے۔

یہاں بہت سے حوالے رہ گئے ہیں اس لیے شاید بات نامکمل لگے، ادھوری رہے، ترسیل کا المیہ وارد ہوجائے، مگر مجبوری ہے۔

ایک بات یاد آتی ہے، کوئی تین، چار عشرے قبل ایک ملاقات میں اس بے فہم نے اختر الایمان سے یہ سوال کر لیا کہ آپ کی شاعری میں وقت کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ تقریباً ہر جگہ وقت کے دھارے بہتے نظر آتے ہیں، یا محسوس ہوتے ہیں، تاہم آپ نے براہ راست وقت کے موضوع پر صرف ایک نظم کہی ہے، 'وقت کی کہانی، جبکہ اس موضوع کے بطن میں تو بڑی گنجائش ہے، پھر کیا وجہ رہی؟۔ انھوں نے جیسے چونک کر خاکسار کی جانب دیکھا اور بڑی آہستگی سے گویا ہوئے، ''ہاں، بات تو ٹھیک ہے، مگر شاید اس کی کوئی وجہ نہیں، خاص وجہ

نہیں''۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر اس بے سواد کے اشارے پر، یا، بہ حسن اتفاق، یا قصداً، انھوں نے اس گفتگو کے بعد چھوٹی بحر میں ایک قدرے طویل نظم 'کال چکّر' کہی، جو ان کے مجموعہ کلام 'سروسامان' میں شامل ہے۔ براہ راست وقت کے موضوع پر، بلکہ اک عرصے کا احاطہ کرتی ہے۔ مابعد، ان کی ایک اور نوحصص پر مشتمل طویل نظم 'جیونی' منظر عام پر آئی۔ جو خود ان کے بقول ہنوز نامکمل تھی، تاہم انھوں نے اپنی حیات میں ہی اسے اپنے مجموعہ کلام 'زمین زمین' میں شامل کرلیا۔ ان کے معمول کے خلاف اس نظم پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

آئیے اب ان دونوں نظموں کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے، جو براہ راست موضوع وقت کا احاطہ کرتے ہیں۔ 'کال چکّر' کے چند مصرعے ہیں۔

کس کے پاس وقت کا
اس قدر ذخیرہ تھا
بانٹتا رہے مگر
اس کی انتہا نہ ہو

'جیونی' کے دوحصص سے منقول یہ دومختلف اقتباسات بھی ملاحظہ کرلیجیے۔

پہلا اقتباس: ذیلی عنوان 'کوہ ندا کا بلاوا' کے تحت

آج تک روز اوّل سے سنتا رہا
آج بھی میرے کانوں میں ہے یہ صدا
''یااخی! یااخی! یااخی! یااخی!
آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا''

دوسرا اقتباس: ذیلی عنوان 'اتمام سفر سے پہلے کا پڑاؤ' کے تحت

کوئی ہے ہم سفر میرا، کوئی نہیں
اس مسافت میں رہ رہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی

بین طور پر اقتباس اوّل میں روز ازل، آغاز زمانہ کا حوالہ ہے اور یہ اس امر کا غماز بھی ہے کہ وہی صدا، جسے شاعر نے 'کوہ ندا کا بلاوا' قرار دیا، آج بھی آرہی ہے، مسلسل آرہی ہے۔ اقتباس دوم میں سفر حیات کے اختتام کا اشارہ ہے۔ بلکہ بیان ہے، اس حصے کا ذیلی عنوان ہی 'اتمام سفر سے پہلے کا پڑاؤ' ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اس کے دومصرعے اختر صاحب کی لوح مرقد پر بھی کندہ ہیں۔ (بحوالہ: بیدار بخت)

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ شاعر موت کو اپنے سفر کی آخری منزل تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اس کے یقین کے مطابق، یہ اتمام سفر نہیں، بلکہ اتمام سفر سے پہلے کا پڑاؤ ہے۔ شاید یہاں، شاعر کے پیش خیال میر کا یہ شعر رہا ہوگا۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اختر الایمان کی ایک اور طویل نظم ہے، 'سب رنگ' اس کے تمام کردار حیوان ہیں، اور پس منظر جنگل کا ہے خود ان کے قول کے مطابق، تمام کردار کسی نہ کسی قدر کے مظہر ہیں کیونکہ یہ نظم تمام تر علامتی ہے۔ اگرچہ اس نظم کا موضوع وقت نہیں، بلکہ عصری نظام ہے، لیکن اس کا کم از کم ایک بند، موضوع وقت کا احاطہ کرتا ہے۔ اس بند کے صرف تین مصرعے بطور دلیل کافی ہیں۔

لیکن یہی کیوں ہے کہ ہمیں ملنے نہ پایا
اک لمحہ بھی فرصت کا، رہی جنگ برابر
آفات سماوی، کبھی ارضی سے ابھی تک

اختر الایمان کی ایک اور طویل نظم ہے، 'سب رنگ' اس کے تمام کردار حیوان ہیں، اور پس منظر جنگل کا ہے خود ان کے قول کے مطابق، تمام کردار کسی نہ کسی قدر کے مظہر ہیں کیونکہ یہ نظم تمام تر علامتی ہے۔ اگرچہ اس نظم کا موضوع وقت نہیں، بلکہ عصری نظام ہے، لیکن اس کا کم از کم ایک بند، موضوع وقت کا احاطہ کرتا ہے۔

غالباً اس وضاحت کا تقاضا نہیں کہ ان مصرعوں میں الفاظ، لمحہ اور فرصت، وقت کا اشاریہ ہیں، اور لفظ 'ابھی تک' تو وقت کا ترجمان ہے ہی۔

عموماً عظیم شخصیات کے کردار، عمل وفکر کی فہم کے لیے ان کی تخلیقات، ان کے وضاحتی مضامین، یا ان کی خود نوشت سوانح کا مطالعہ کرنے کا رواج ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اختر صاحب نے یہ تمام سامان اپنے قاری، ناقد اور مداح کے لیے فراہم کرادیے ہیں۔ لیکن اگر کسی اہم شخص کا روزنامچہ زیردست آجائے تو فہم وادراک کے کئی نئے غرفے واہوجاتے ہیں۔ بہ حسن اتفاق بیگم سلطانہ اختر الایمان اور اختر صاحب کے حبیب ورفیق، بیدار بخت کی عنایت کے طفیل ان کے روزنامچے کے کافی مندرجات منظر عام پر آسکے ہیں اور انھیں 'باقیات اختر الایمان' میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ عمل قطعاً بے محل نہیں کہ ان کے خودنوشت روزنامچے کے چند اقتباسات کا بھی جائزہ لے لیا جائے، تاکہ ان کے تصور وقت اور فلسفۂ زماں کے کئی اور گوشے روشنی میں آسکیں۔ اسی مقصد کے تحت چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

14/اپریل 1946 کی ایک تحریر ہے:

''زندگی کی رفتار ناپنے کا میرے پاس کوئی آلہ نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کائنات میں، اس سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی چیز نہیں''۔

ملاحظہ کیجیے، کیا فلسفیانہ خیال ہے، اگر یہ بشکل شعر ڈھل جاتا تو اور لطف آتا۔

15/جنوری 1967، کو انھوں نے اپنے روزنامچے میں مرزا غالب کا ایک شعر نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

''انسان ماضی پرست ہے۔ اس لیے کہ ماضی ہی حقیقت ہے، باقی سب افسانہ ہے، حقیقت نہیں۔ مستقبل اور حال دونوں اس تیزی سے گزر جاتے ہیں کہ انسان پکڑتے پکڑتے، بے دم ہوجاتا ہے اور یہ پکڑ میں نہیں آتے۔ شاید اسی لیے غالب نے کہا تھا۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

اس ضمن میں، انھوں نے مزید لکھا ہے۔

'''رفت' اور 'بود' کے سوا انسان کے پاس اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے پاس 'رفت' اور 'بود' بھی نہیں۔''

(بحوالہ: ڈائری کے اقتباسات، مشمولہ، باقیات اختر الایمان)

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دامن میں 'رفت اور بود' کے سوا کچھ بھی نہیں، جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا، حال کی عمر تو محض ایک لمحہ ہے، ایک نفس ہے، پلک جھپکی اور حال رفت ہوا، گزر گیا، اور بود ہوگیا، یعنی ماضی، اور انسان کا دامن پھر خالی۔

اختر الایمان کے دو مصرعے ہیں، اگرچہ ان کا براہ راست تعلق وقت سے نہیں، مگر اس کے وسیلے سے خدا کے تئیں ان کا تصور واضح ہوتا ہے۔ اور ان کے فلسفہ کے مطابق خدا اور وقت میں بڑا اشتراک ہے۔

خدا کو ڈھونڈتا رہتا ہے، کیوں دنیا میں آکر بھی
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوگا تو خدا ہوگا

غیرارادی طور پر یہاں غالب کا ایک شعر یاد آجاتا ہے۔ یہ ان مصرعوں کا محرک ہونہ ہو، مگر یہ شعر یقیناً اختر الایمان کے ذہن میں رہا ہوگا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بہر کیف، فی الحال، اتمام گفتگو، اختر الایمان کے ان دو مصرعوں پر جو اُن کا پیغام بھی ہیں۔

مرے حق میں ابھی، کچھ فیصلہ صادر نہ فرمانا
میں جس دن آؤں گا، تازہ لغت ہمراہ لاؤں گا

■

Dr. Muzaffar Husain Syed
29/11, Sir Syed Road, Darya Ganj
New Delhi - 110002
Cell: 9818827853 , 9211366940
E-mail: syedmh92@yahoo.com ,
syedmh92@gmail.com

سید یحییٰ نشیط

علامہ شبلی کی شعری کائنات درسیاتی تناظر میں

شموس العلما اور رفقاءِ سر سید میں شبلی اگرچہ کم عمر رہے ہیں لیکن ان کی علمی و ادبی خدمات کا قد بلند دکھائی دیتا ہے۔ شبلی عالم ہیں، معلم ہیں، مصنف ہیں منصف ہیں، مورخ ہیں، مفکر ہیں، سوانح نگار ہیں، ناقد ہیں، مشرقی شعریات کے ماہر ہیں، مغربی ادب کے شناسا ہیں، علم الکلام سے آگاہ ہیں، حدیث و فقہ میں شغف رکھتے ہیں، اعلیٰ معتمد ہیں، بہترین منتظم ہیں اور عربی فارسی میں ان کا ادراک اعلیٰ درجے کا ہے۔ وہ سیاست و مدنیات کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ ان تمام اوصافِ علمیہ کے درمیان ان کی شاعرانہ شخصیت بساط ادب پر بے اثر تو نہیں مگر نحیف و نزار ضرور دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنی اس کمزوری کو خود بھی محسوس کیا تھا چنانچہ سید عبدالحکیم دسنوی کو لکھے مکتوب میں وہ کہتے ہیں:

''میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے، بالکل قادر نہیں، یعنی بغیر کسی خاص فوری تاثیر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ احباب نے فرمائشیں کیں اور کئی کئی دنوں تک طبیعت پر زور ڈالا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔''

(خط بنام سید عبدالحکیم دسنوی: مکاتیب شبلی جلد اول 1966، ص 308)

اس کمزوری کے باوصف جب ان کی طبع رسا شاعری کی طرف التفات کرتی ہے تو کمانِ پیری میں بھی ان کا تیر شباب اپنے اہداف تلاش کر ہی لیتا ہے۔ چنانچہ ایم مہدی کو لکھتے ہیں:

''19 برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ ممبئی میں بڑی دلچسپیاں رہیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں، لیکن حافظ تو کہتے ہیں۔

عشق در ہنگامِ پیری چوں بہ سرما آتش است

(خط بنام ایم مہدی: مکاتیب شبلی حصہ دوم ص 207 اور 215)

شبلی حادثۂ پا کے فوراً بعد ہی اپنے ممبئی کے سفر میں کنارِ آبِ چوپاٹی اور گلگشتِ اپالو سے اس قدر متاثر ہوئے کہ شوخیانہ اور عاشقانہ فارسی غزلوں کے سولہ صفحات لکھ ڈالے۔ ان غزلوں میں حافظ کا رنگ نمایاں ہے۔ بلکہ ایک غزل تو حافظ ہی کی زمین میں ہے۔ شبلی نے حافظ کے مصرعے میں معمولی سا تصرف کر کے پوری غزل لکھ ڈالی۔

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را
کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را
فغاں از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ زرتشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را

شبلی نے آخری شعر میں استعارے کو اس انداز میں استعمال کیا ہے کہ لفظی نسبت اسے مراعاۃ النظیر تک پہنچا دیتی ہے اور شبلی کی خیال آفرینی سے شعر اسطوری فکر کی جمالیات کا مظہر بن جاتا ہے۔ شبلی نے اپنے ایک خط میں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں، ''پارسی نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں۔''

شبلی کی یہ غزلیں موقر جرائد میں شائع ہوئیں، ان کی زبان و طرز ادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں اور معاصر شعراء نے ان غزلوں کی روشنی میں غزلیں کہیں۔ ناقدین ادب نے اپنی طبیعت اور اپنے ادراک کے مطابق سراہا اور ان کا تجزیہ کیا۔ چونکہ ان میں شوخیانہ پن زیادہ ہے اس لیے نصاب میں جگہ نہ پا سکیں۔

شبلی نے اپنی فارسی غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا تھا جو مطبع نامی کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ 'دستۂ گل' اور 'بوئے گل' بھی ان کے شعری مجموعے ہیں۔ شبلی کے فارسی کلام کو اس دور کے فارسی شناس مولانا چریا کوٹی کی سندِ تحسین حاصل تھی۔ مگر جتنی پذیرائی ان کے فارسی کلام کی ہوئی، اردو کلام اس سے تہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ خود اردو شاعری کی طرف بہت بعد میں متوجہ ہوئے۔ علی گڑھ جانے سے پہلے وہ اردو کی بجائے فارسی میں خط و کتابت کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ 'سیرۃ النعمان' میں انھوں نے اس نکتے کی وضاحت کر دی تھی۔ لیکن ملک کے سیاسی، سماجی اور مسلمانوں کے تہذیبی اور معاشرتی حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور مصلحین امت کو عوامی زبان میں اپنی تعمیری اور افادی خدمات انجام دینا ضروری ہو گیا تھا۔ حالی نے 'مسدس' کے ذریعے سوئی ہوئی امت کو جگایا، ڈپٹی نذیر احمد اپنے ناولوں اور کہانیوں کے ذریعے اصلاح کرنے لگے، محمد حسین آزاد نے درسی کتابوں کے ذریعے نونہالان قوم کے علمی شوق کو پروان چڑھایا اور سر سید نے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے قوم کی اخلاقی تربیت کی۔ ان ساری سماجی، تہذیبی اور تعلیمی خدمات کو بروئے کار لانے کے لیے اردو زبان ہی وسیلہ بنی۔ اردو کی اس اہمیت کے پیش نظر شبلی نے تخیلاتی دنیا کے موہوم محلات تعمیر کرنے کی بجائے حقیقی دنیا کی افسردہ اور مایوس زندگی کے خزاں رسیدہ چمنستاں کو سنوارنے کے لیے اردو شعر و ادب کا سہارا لیا۔ اردو کی ایسی منظومات نصاب میں طلبہ کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں شبلی کی ان منظومات کو جگہ مل سکی۔ درسیات کی رو سے نصاب کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ اس میں طلبہ کی نفسیات، ذہنی استعداد، شوق، صلاحیتوں، دلچسپیوں، سماجی ماحول، روایتی قدرروں، تعلیمی فضا، زبان کا معیار اور سیاسی پالیسیوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ شبلی کی اکثر نظمیں ان تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔

شبلی کا اردو کلیات نہایت مختصر ہے۔ اس میں اصلاحی رجحان غالب نظر آتا ہے۔ حالی کی طرح شبلی نے بجائے قنوطیت کے اپنی منظومات میں رجائی انداز اپنانے کی کوشش کی ہے۔ غدر کے بعد ملک کے سیاسی اور عوام الناس کے معاشرتی حالات میں اس قدر تبدیلی آ گئی تھی کہ فلاح و بہبودی کے پرستار ادبا اور شعرا اصلاحی و افادیت کے حامل مضامین ہی اپنی تخلیقات میں پیش کرنے لگے تھے۔ یہ معاملہ صرف اردو ہی تک محدود نہیں تھا بھارت کی تمام زبانوں کے ادب میں یہ رجحان غالب نظر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ اس زمانے کے ادبی موضوعات میں بڑی حد تک یکسانیت اور فکر کی

> **’تماشاھائے عبرت ‘ کے عنوان سے علی گڑھ کی سالانہ نمائش کے لیے شبلی نے ایک مسدس لکھا تھا۔ یہ مسدس مسلمانوں کی زبوں حا لی کی روداد ھے۔ اس زبوں حالی کو پیش کرنے کے لیے سر سید نے ایک قومی تھیٹر کی بنیاد ڈالی تھی۔شرفا کے نزدیک یہ غیر سنجیدہ طریق خلاف تھذیب تھا مگر سر سید نے اپنے تعلیمی مشن کی تشھیر کے لیے اسے مستحسن جانا۔ 6 فروری 1894 میں اسٹیج کیے گئے اس ڈرامے میں بھت سارے ملکی روسا اور انگریز اساتذہ شریک تھے اور لباس بدل بدل کر تقریریں، مباحثے اور مکالمے پیش کر رھے تھے۔**

وحدت نظر آتی ہے۔حریت اور غلامی جیسے موضوعات تو اس دور میں ادب کی پہچان بنے ہوئے تھے اور تعمیری ادب میں ان مضامین کو خاص مقام حاصل تھا۔شبلی کے یہاں ان موضوعات کو تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کا اہتمام ملتا ہے۔ مثلاً ’صبح امید‘ میں انھوں نے مسلمانوں کے علوم وفنون کی ترقی اور تنزل کے نشیب وفراز کو پیش کرنے کے بعد سرسید کی تعلیمی تحریک کو مسلمانوں کی ’صبح امید‘، افسردہ دلوں کی ہمت، حوصلوں کی پرواز کو بلندی بخشنے والا‘ کہا ہے اور اس تحریک کی بقا کے لیے مسلمانوں کو جہد مسلسل کرتے رہنے کی تلقین بھی کی ہے۔شبلی کی اس دعوت میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب کا عنصر بھی شامل ہے۔اس کا موضوع پختہ ذہنوں کے لیے مفید ہے اس لیے اکثر ثانوی درجات میں یہ پڑھائی جاتی ہے۔

’صبح امید‘، ’گلزارنسیم‘ کی بحر میں ہے لیکن مثنوی کی دیگر روایات سے شبلی نے انحراف برتا۔اس میں نہ حمد ہے نہ نعت ومنقبت۔اس میں کوئی قصہ کہانی کا پلاٹ بھی نہیں۔ بس مسلمانوں کے علمی عروج وزوال کو اشاروں کنایوں میں پیش کرکے سرسید کی تحریک کو آگے بڑھانے اور دوبارہ کھوئے ہوئے ماضی کے وقار کو حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔شبلی کا یہ عمل مثنوی کی روایت میں ایک قسم کی جدت سے کم نہیں۔ اس مثنوی کو شبلی نے اپنی تخلیقات سے علاحدہ کر دیا تھا۔ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اسی موضوع پر حالی کا نہایت مؤثر اور معروف مسدس اس وقت موجود تھا۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شبلی کی مثنوی میں شعریت کی وہ چاشنی نہیں ہے جو تاریخ کے قشف کو طراوت بخشے۔البتہ یہ مثنوی ہماری تاریخ کو ذہنوں میں پیوست کر دیتی ہے،اس لیے طلبہ کے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔

’تماشاہائے عبرت‘ کے عنوان سے علی گڑھ کی سالانہ نمائش کے لیے شبلی نے ایک مسدس لکھا تھا۔ یہ مسدس مسلمانوں کی زبوں حالی کی روداد ہے۔اس زبوں حالی کو پیش کرنے کے لیے سرسید نے ایک قومی تھیٹر کی بنیاد ڈالی تھی۔شرفا کے نزدیک یہ غیر سنجیدہ طریق خلاف تہذیب تھا مگر سرسید نے اپنے تعلیمی مشن کی تشہیر کے لیے اسے مستحسن جانا۔ 6 فروری 1894 میں اسٹیج کیے گئے اس ڈرامے میں بہت سارے ملکی روسا اور انگریز اساتذہ شریک تھے اور لباس بدل بدل کر تقریریں، مباحثے اور مکالمے پیش کر رہے تھے۔شبلی کو یہ ناٹک مطلق پسند نہیں تھا۔ وہ سبز عبا پہنے اور رنگین عمامہ باندھے اسٹیج پر آئے اور قوم کی زبوں حالی کو تماشہ بنا کر پیش کرنے کی نہ صرف یہ کہ مذمت کی بلکہ طنز وتضحیک کے کرارے وار بھی کیے۔ ان کی نظم خوانی ایسی مؤثر اور الم ناک تھی کہ سامعین پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ یہ مسدس 14 بندوں پر مشتمل ہے، اس میں حالی کا انداز بھی ہے مگر خوبی اور عالمانہ فن کاری کے لحاظ سے یہ حالی کے مقابلے میں کمتر ہے۔اس مسدس میں شبلی نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں ؎

ہائے افسوس کہ ہو قوم تو یوں خستہ و زار
مرض الموت میں جس طرح سے کوئی بیمار
نہ معالج ہو کوئی پاس نہ سر پر غم خوار
نظر آتے ہوں دمِ نزع کے سارے آثار
واں تو یہ حال کہ مرنے میں بھی کچھ دیر نہیں
آپ ادھر سیر تماشے سے ابھی سیر نہیں

اس مسدس کے بعض اشعار میں شبلی نے بیجا، بینا، تماشا جیسے ’اختلا ردف‘ کو روا رکھا ہے۔ اشعار میں بعض جگہ عربی اور انگریزی الفاظ ثقالت پیدا کر دیتے ہیں یہ نظم باوجود موثر اور زود اثر ہونے کے نصاب کے تقاضے پر پوری نہیں اترتی۔اس میں یاسیت کا عنصر بھی غالب نظر آتا ہے جس سے طلبہ مایوسی کا شکار ہوسکتے ہیں۔

مثنوی اور مسدس کے علاوہ شبلی نے قصائد لکھے، مطائبات کو جزو شاعری بنایا، مرثیہ اور شہر آشوب بھی لکھے۔ تاریخی واقعات منظوم کیے اور سیاسی حالات پر نظمیں لکھیں۔ غرض کہ شبلی کے مختصر کلیات میں بہت ساری اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ان کے کلیات میں چار قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ 1893 کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ یہ ترکیب بند میں لکھا ہوا ہے۔ قصیدہ خطابیہ ہے اس لیے تشبیب وگریز سے عاری ہے۔ اس میں خطاب امتِ مسلمہ سے ہے مگر نسل آدم کی بجائے نسل عدنان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ عدنان کوئی معروف شخصیت نہیں۔خود آپ نے امت اسلامیہ کے لیے اولاد ابراہیم اور اسمٰعیل کی اصطلاح استعمال کی ہیں۔ عربوں کے علم الانساب کے مطابق حضورؐ کا سلسلۂ نسب عدنان تک 21 پشتوں میں تواتر کے ساتھ ملتا ہے۔ بس اسی خصوصیت کی بنیاد پر شبلی نے ’عدنان‘ کا قافیہ باندھا ہے۔ اس قصیدے میں تاریخی اسناد پیش کرکے مسلمانوں کے روبہ زوال ہونے کی وجوہات بیان کی ہیں۔ یہ ایک طرح کی یاس آمیز حقیقت ہے اس لیے پرشکوہ تراکیب ولفظیات اس قصیدے میں نہیں ملتیں۔ اس کا اختتام بھی دعائیہ نہیں بلکہ اس میں انتباہ اور امتناع کی آمیزش کچھ زیادہ ہے۔ یہ قصیدہ طلبہ کی ذہنی ونفسیاتی سطح سے بالاتر ہے نیز اس میں بچوں کی دلچسپی کا کوئی سامان بھی نہیں ہے۔اس لیے بالعموم اسے نصاب سے دور ہی رکھا جاتا ہے۔

دوسرا قصیدہ تہنیتی ہے۔ شبلی نے اسے آنریبل جسٹس سید محمود کی شادی کے موقع پر لکھا تھا۔اس قصیدے میں مدحت طرازیوں اور فرحت ونشاط کی تمام تر رنگینیوں کو شاعر نے بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے شامل کیا اور خوشی کے موقع پر لکھے گئے اس قصیدے کو بہاریہ بنا دیا ہے۔ محسن کاکوری کے قصیدہ مدح خیر المرسلین کی طرح یہ بھی لامیہ ہے اور انشا کے قصیدے کی طرح اس میں نشاطیہ عنصر غالب ہے۔اس میں قصیدے کی تمام فنی روایتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔اس کی تشبیب بہاریہ ہے تشبیب سے مدح کی طرف رجوع ہونے کے لیے جو گریز کا پہلو اختیار کیا گیا ہے وہ قصیدے کی جان ہے۔شبلی نے گریز کے اس مرحلہ کو بڑی خوبصورتی اور فنی چابک دستی سے نبھایا ہے۔تشبیب کا آخری شعر یہ ہے ؎

مژدہ اے بادہ کشو! اب تمھیں ڈر کس کا ہے
ابر کا عالمِ بالا پہ بھی ہے اب تو عمل

اور مدح اس اردو شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

قوم کو ناز ہے اے سیدِ والا تجھ پر
جمعِ اسلام کو ہے آج تری ذات پہ بل

ان دونوں مختلف الخیال موضوعات کو شبلی نے بات سے بات نکالنے اور دونوں کے درمیان ربط قائم کرنے کے لیے گریز کے اس فارسی شعر کا سہارا لیا ہے ؎

بادہ بر فرّخیِ شادیِ محمود بہ نوش
آں کہ در انجمنِ فضل بود صدرِ اجل

گریز کے اس شعر کے بعد دو اور فارسی اشعار مدحتِ محمود ہی میں ہیں۔مگر اردو میں اصل مدح ’قوم کو ناز ہے‘ والے شعر سے شروع ہوتی ہے۔ شبلی نے سید محمود کی مدحت طرازی میں مبالغہ آرائی اور بیجا ستائش سے کام نہیں لیا اور جو خوبیاں ممدوح کی ذات میں پائی جاتی تھیں انھیں برملا پیش کر دیا۔شبلی نے اس تہنیتی قصیدے میں حسنِ طلب کا عجیب انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے وقار اور

تشخص کو قائم رکھتے ہوئے کہا ہے،'' تو اگر محمود ہے تو میں عنصری ہوں۔ تو اگر فخر اول تو میں بھی اسلاف کا ناز ہوں۔ مجھے اپنی طبیعت پر اتنا غرور ہے کہ اگر مدح لکھنا بھی چاہوں تو اپنے ہی علم وعمل کا بیان کرتا ہوں۔'' شبلی کا قصیدے میں اس طرح کا اظہار خودی اور تکبر و تفاخر فارسی قصیدہ گو شعرا کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اس قصیدے کو نصاب میں شامل کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس میں قصیدے کے کم وبیش تمام عناصر موجود ہیں اور انھیں واضح انداز میں پیش کیا ہے، کمزوری صرف اتنی ہے کہ اس میں گریز کا شعر فارسی میں درج ہے۔ نصاب کے مرتبین کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ اس کی تشریح اور وضاحت مشق کے ذیل میں کردی جائے۔ کیونکہ سارے اساتذہ فارسی سے واقف ہوں یہ ممکن نہیں۔

مولانا کے دو قصائد ایسے ہیں جن کی وجہ سے انگریز انھیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ روم کے سفر سے لوٹنے کے بعد یہ خبر پھیل گئی تھی کہ سلطان عبدالحمید والیِ ترکی کے سفیر بن کر شبلی ہندوستان آئے ہیں۔ مولانا نے والیِ ترکی کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ دوسرا قصیدہ علی گڑھ کے ایک جلسے کے لیے بھی قلم بند کیا تھا اس کے ایک شعر۔

نو جوانو ! یہ حریفوں کو دکھا دینا ہے
اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا

میں لفظ 'حریفوں' نے انگریزوں کو بے چین کر دیا تھا۔ اس لیے شبلی نے اپنی سیاسی نظمیں پہلے 'کشاف' کے نام سے لکھیں پھر وصاف کے نام سے 'زمیندار'، 'ہمدرد'، 'مسلم گزیٹ' اور 'الہلال' میں لکھنے لگے۔

شبلی نے مذہبی، اخلاقی اور سیاسی نظمیں بھی لکھیں۔ مذہبی و اخلاقی منظومات میں زیادہ تر تاریخ اسلام کے واقعات ہی قلم بند ہوئے ہیں۔ واقعاتی سطح پر یہ منظومات مؤثر ضرور ہیں لیکن خود شبلی جسے 'شاعری کی جان' کہتے ہیں وہ 'قوتِ تخیل' ان منظومات میں دکھائی نہیں دیتا۔ نیز واقعیت اور اصلیت جو تاریخ کے بنیادی عناصر ہیں، ان کے درمیان خیال آرائی اور معنی آفرینی نے ان منظومات میں اپنا وجود کھو دیا ہے۔ یہاں بطور مثال شبلی کی آخری نظم 'اہل بیت رسول کی زندگی' کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم اتنی مقبول ہے کہ ملک بھر کے تعلیمی نصابوں میں شامل ہے۔ اس میں حضورؐ سے حضرتِ فاطمہؓ کا اپنے لیے ایک غلام مانگنے کا واقعہ درج ہے۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

اس لیے حضرت فاطمہ نے حضورؐ سے جنگ میں قید ہوئے غلاموں میں سے ایک غلام اپنے گھر کے کام کے لیے مانگا تو

ارشاد یہ ہوا کہ 'غریبانِ بے وطن'
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گزرتی ہیں
میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا
یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

لیکن شبلی نے حضورؐ اور فاطمہ کے درمیان کی گفتگو زمانۂ ماضی میں بیان کردی ہے۔ اس لیے اس نظم میں زمانے کے استعمال کی غلطی در آئی۔ مذکورہ اشعار کی نثر اس میں موجود زمانے کے مطابق کی جائے تو وہ بڑی بے ربط اور Abrupt دکھائی دے گی۔ مثلاً:

''ارشاد ہوا غریبان بے وطن جن کا قیام صفۂ نبوی میں تھا میں ان کے بندوبست سے ہنوز فارغ نہیں ہوں ہر چند مجھے اس کام میں خاص اہتمام تھا۔ ان پر جو جو مصیبتیں گزرتی ہیں میں ان کا ذمہ دار ہوں اور (انھیں دور کرنا) میرا ہی کام تھا۔ وہ لوگ جن کو بھوک پیاس سے سونا حرام تھا ان کا حق تم سے زیادہ مقدم ہے۔ اس مکالمہ میں فعلِ حال کے لیے صیغۂ ماضی کا استعمال کرنے کی وجہ سے یہ نثر بڑی بھدی محسوس ہو رہی ہے۔ اس غلطی کے باوجود یہ نظم بڑی مقبول ہے اور ہمیشہ درسی کتابوں میں شامل رہی ہے اور اس زمانی غلطی کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

شبلی کی لکھی ہوئی سیاسی نظموں میں 'ہنگامۂ مسجد کانپور' اور اسی واقعہ کے متعلق دیگر منظومات نہایت دردانگیز تاثر کی حامل ہیں۔ اثر انگیزی اور معنی آفرینی میں اس نظم سے بڑھ کر سیاسی منظومات میں کوئی دوسری نظم نہیں ہے۔ شاعر نے نہایت اضطراری کیفیت میں یہ نظم لکھی ہے۔ گویا جذبات کا سیل صبر کے بند توڑ کر بہہ نکلا ہے۔ شبلی کے انداز بیان نے اس خونین سانحہ کو اور بھی الم ناک بنا دیا۔ یہ منظومات سیاسی نوعیت کی ہیں اس لیے نصاب میں شامل کرنے سے اجتناب برتا جاتا ہے۔

جہاں تک ان کی اردو غزلوں کا تعلق ہے تو وہ دس بارہ سے زیادہ نہیں۔ خود سید سلیمان ندوی کو بھی انھیں تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی نظموں کا رنگ کچھ اس طرح تھا

ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں کو زور ہے
روک لے اس کو کہاں یہ آسماں میں زور ہے
تیرِ قاتل کا یہ احساں رہ گیا
جائے دل سینے میں پیکاں رہ گیا
شبِ فرقت میں دلِ غم زدہ بھی پاس نہ تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالمِ تنہائی تھا
تمیں دن کے لیے ترکِ مے و ساقی کرلوں
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

ان غزلوں میں نیا پن کچھ بھی نہیں۔ بھرتی کے الفاظ (یہ، تو، بھی وغیرہ) نے ان اشعار کے حسن کو غارت کردیا ہے۔ آخری شعر میں 'یار کی اغیار سے رغبت' اور 'گلِ تر کی خار سے ہوس' یہ نہایت پست خیالات ہیں۔ ہاں! البتہ حیدرآباد پہنچنے کے بعد داغ کی صحبت میں شبلی مشاعروں میں شعر پڑھنے لگے تو ان پر داغ کا رنگ چڑھنے لگا تھا۔ یوں بھی انھیں داغ سے کافی لگاؤ تھا اور ان کے کئی اشعار شبلی کو ازبر تھے۔ اس زمانے کی غزلوں میں تغزل نے کچھ اپنا اثر بھی چھوڑا تھا۔

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوں گی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا

حیدرآباد کے قیام کے زمانے کی اس غزل میں شبلی داغ سے کافی متأثر نظر آتے ہیں۔ رجز مخبون جیسی طویل بحر میں داغ نے کئی غزلیں کہی ہیں۔ انھیں کی تقلید میں شبلی نے شاید اس بحر کو اپنایا ہے۔ غزل کی لفظیات، تراکیب، خیال کی پچی کاری میں بھی داغ کا اثر غالب دکھائی دیتا ہے۔ یہ اردو غزلیں بھی نصاب کے ضابطوں پر پوری طرح نہیں اترتیں، کیونکہ ان میں عشق کی جنسی کیفیات کا اظہار شد و مد کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے شبلی نے شعر العجم جلد چہارم میں شاعری کی جن خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے، ان کی شاعری میں ان ہی اوصاف کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی منظومات میں تاریخ کے جگمگاتے واقعات تو ضرور بیان کردیے ہیں مگر عوام الناس کے دلوں کو وہ روشن نہ کر سکے، گویا اثر انگیزی میں ان کی شاعری حالی کی شاعری سے بہت پیچھے نظر آتی ہے۔

■

Syed Yahya Nasheet
24, Kashana, Kalgaon
Talluqa: Gigras
Distt: Awatmal - 445203 (MS)

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی

اردو میں غیر منقوط کتابیں
ایک تعارف

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے انسان ایک ایسی مخلوق ہے، جس کو بہت ساری ایسی خصوصیات سے نوازا گیاہے، جن سے دوسری مخلوقات یکسر محروم ہیں، جیسے غور وفکر کی خصوصیت، سوچنے سمجھنے کی خصوصیت اور بولنے کی خصوصیت وغیرہ، انہی خصوصیات میں سے ایک اہم مافی الضمیر کولفظوں کی شکل میں ڈھالنے (لکھنے اور تحریر کرنے) کی خصوصیت بھی ہے، اس کی اس خصوصیت کی بنا پر انسان کے بولنے کی خصوصیت نے جاودانی حاصل کرلی ہے، سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

"تحریر زبان کا ایک منقش علامتی جسم ہے، جسے پاکر وہ جاوداں اور متحرک ہوگئی، خاموشی سے ارتقائی منزلیں طے کرنے لگی اور آہستہ آہستہ حیاتِ انسانی کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کا ذریعہ بن گئی، مذہبی تصورات، فلسفیانہ خیالات، شاعرانہ جذبات اور تاریخی معلومات نے انھیں علامتوں سے پر پرواز پایا اور تہذیبی زندگی استوار ہونے لگی، فن تحریر کی انھیں خصوصیات کو پیش نگاہ رکھ کر مشہور اطالوی عالم ڈاکٹر ڈرنگر نے اسے تہذیب انسان کی کلید سے تعبیر کیا ہے، قفل ابجد کے طلسم کی طرح تحریروں کے پُرسحر نقوش نے انسانی دلوں کے راز کھولنے شروع کردیے، معبدوں کے نقوش گیت گانے لگے اور انسان کا ماضی اپنے خول سے باہر آگیا۔"[1]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھنے کی جو صلاحیت انسانوں کو ودیعت کی گئی ہے، وہ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے اب یہاں تک جا پہنچی ہے کہ انسان ایسی تحاریر لکھنے پر قادر ہوگیا ہے، جو نقطوں کے بغیر ہو؛ لیکن پڑھنے میں کسی قسم کی کوئی دشواری نہ ہو، ایسی تحریروں کو اصطلاح میں 'صنعت مہملہ' یا 'صنعت عاطلہ' کہا جاتا ہے۔

یہ ادب کی ایک سنگلاخ وادی ہے، جس میں بہت کم ادباء آبلہ پا ہوئے بغیر منزل مقصود تک پہنچ پاتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس صنف میں صرف اٹھارہ حروف (اٹ ح د ڈ ر ڑ س ص ط ع ک گ ل م و ہ ی) کے ذریعے سے لکھنا ہوتا ہے اور وہ بھی ایسے انداز میں کہ مفہوم بالکل واضح ہو، راہ نوردان شوق نے اس مشکل راستے کو بھی سر کیا ہے اور عجیب بات ہے کہ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں نہ صرف یہ کہ نظم اور ایک آدھ مضامین پر اکتفا کیا گیا؛ بلکہ پوری پوری غیر منقوط کتابیں لکھی گئی ہیں، آئیے یہاں غیر منقوط اردو کتابوں کے بارے میں جانتے چلیں، ان کتابوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) نثر (2) نظم

نثری غیر منقوط کتابیں:

نثر، نظم کے مقابلے میں دشوار ہونے کے باوجود آسان ہے، تلاش وجستجو کے بعد جو کتابیں ملیں، پہلے ہم انھیں نثری کتابوں سے ابتدا کرتے ہیں۔

1. **سلك گوهر:** یہ کتاب انشاء اللہ خاں انشاء (پ: دسمبر 1752ھ، و: 19/مئی 1817) کی ہے، تاریخ تصنیف 1805 بتائی گئی ہے، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ ایک صدی قبل کی اردو کی غیر منقوط پہلی کتاب کہی جاسکتی ہے۔

سلک گوہر کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے، اس نسخے کو رامپور لائبریری کے ناظم امتیاز علی عرشی نے 1948 میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، یہ پی ڈی ایف شکل میں rekhta.org میں موجود ہے، اس کے اندر ایک عشقی داستان ہے، روس کا شہزادہ، جس کا نام ماہ ساطع ہے، شکار کھیلتا ہوا ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے ایک دوسرے ملک حصار طلا کار میں داخل ہوجاتا ہے، جہاں وہ ملکہ گوہر آرا کو دیکھ کر عاشق ہوجاتا ہے اور ملکہ کے دل میں بھی اس کی تاثیر پہنچ جاتی ہے، رات کو ملکہ اپنی کنیز ماہ رو کے واسطہ سے اسے بلا بھیجتی ہے اور کہتی ہے کہ اپنے والدین کے ذریعے سے شادی کا پیغام بھجواؤ، اگر وہ منظور کرلیں تو خیر، ورنہ وصل محال ہے، یہ سن کر شہزادہ غم زدہ ہوجاتا ہے اور الوداعی رخصت سوچ کرتن بہ تقدیر کوہ صحرا میں دو برس تک صحرانوردی کرتے ہوئے کوہ طلا پر پہنچتا ہے، جہاں اس کی ملاقات ایک سو سالہ شخص طاؤس مراد سے ہوتی ہے، جس کی ساحرہ پوتی گل رو، جو اپنے سحر کی وجہ سے ہدہد بھی بن جاتی ہے، ملکہ گوہر آرا کے والدین تک پیغام پہنچاتی ہے، ملکہ کے والدین شادی پر راضی ہوجاتے ہیں اور بڑی دھوم دھام سے شادی ہوتی ہے۔[2]

انشا نے اس کی ابتدا حمد وثنا سے اس طرح کی ہے:

"عالم عالم حمد، صحرا صحرا درود، اللہ صمد ودود، اور رسول کردگار، سرگروہ رُسل، محمد محمود، اور آلہ الاطہار کو اور سو لاکھ سلام ہر سحر ومسا اس ماہ مصر اسلام، مدار المہام سرکار ملک علام، امام ہمام، اسد اللہ کو، کہ مع عسا کر واعلام مدام معرکہ آراء رہا، اس حد کو علم کس کا اور کس کا حوصلہ کہ مرحلہ گرد اس راہ کا ہو! اللہم صلی علا محمد وآلہ، وعددہ وکمالہ۔"[3]

2. **هادی عالم:** سیرت طیبہ پر یہ پہلی غیر منقوط کتاب ہے، جس کے مصنف مشہور مفتی اور مفسر قرآن محمد شفیع دیوبندی کے فرزند اور معروف فقیہ شیخ الاسلام مفتی تقی عثانی مدظلہ کے برادر معظم جناب محمد ولی رازی صاحب ہیں، تصنیف کا سال 1982 ہے، اس کتاب کے آغاز میں ایک غیر منقوط نعت بھی ہے، جس کے خالق مؤلف کتاب ہی ہیں، حضور اکرمؐ کی پوری سیرت 414 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، 1983 میں پاکستان میں کتب سیرت النبیؐ کے قومی مقابلہ برائے سال 03-1402ھ میں اول انعام کا مستحق بھی قرار دیا گیا اور مؤلف کتاب کو دس ہزار روپے بطور انعام دیے گئے، راقم کے سامنے اس کا چوتھا ایڈیشن مطبوعہ دار العلم کراچی 1987 ہے، 'مولود مسعود' کے ذیلی عنوان کا ایک پیراگراف بطور نمونہ پیش ہے:

"اللہ اللہ! وہ رسول امم مولود ہوا کہ اس کے لیے صدہا سال لوگ دعا گو رہے، اہل عالم کی مرادوں کی سحر ہوئی، دلوں کی کلی کھل اٹھی، گمراہوں کو ہادی ملا، گلے

کوراعی ملا، ٹوٹے دلوں کوسہاراملا، اہل دردکودرماں ملا، گمراہ حاکموں کے محل گرے، سالہاسال کی دہکی ہوئی وہ آگ مٹ کے رہی کہ لاکھوں لوگ اس کوالہٰ کرکے اس کے آگے سرٹکائے رہےاوررودساوہ ماءرواں سے محروم ہوا۔4

3. **سروں کے سودے:** امت مسلمہ کے مصائب، زوال کے اسباب، جہاد، مغازی اورسیر پر دنیا کی یہ پہلی غیرمنقوط کتاب ہے، جس کے مصنف ابوسلمان مولانا ڈاکٹرشمس الہدیٰ ربانی ہیں، اس کی تالیف 2004 اور 2005 کے درمیان مکمل ہوگئی تھی؛ لیکن 2008 میں پہلی بار یہ زیورطباعت سے آراستہ ہوئی، یہ 360 صفحات کی کتاب ہے، میرے سامنے اس کا پہلاایڈیشن ہے، جس کا ناشرالہلال ٹرسٹ ہے، اس کتاب میں ایک ذیلی عنوان ہے: 'ولداسود'، اس کی ابتدائی سطریں بہ طورنمونہ پیش ہیں:

''ہمدم مکرم ولداسود (مقداد بن اسود) اٹھ کھڑے ہوئے اورکہا کہ: ''اے رسول اللہ! وہ کام کرکہ اللہ کے ہاں سے اس کا حکم ہواہے، ہم سارے کے سارے ہم رہ ہوں گے، اللہ گواہ ہے اسرائلی گروہ کے اس کلام کی طرح کے کلام سے ہم دورہوں گے کہ موسیٰ علی روحہ السلام سے ہوا کہ اے موسیٰ! اللہ کوہم راہ لے کرمعرکہ کی راہ لے کرلڑ، ہم اِدھرہی رہیں گے؛ مگراس کے علی العکس ہماراکلام ہے کہ اے اللہ کے رسول! اللہ کولے کر ہردولڑو، ہم ہم راہ ہوں گے۔''5

4. **دوسسردوداماد:** خلفائے راشدین کی سیرت پر غیرمنقوط پہلی کتاب ہے، اس کے مصنف ابومحمد محمدعظیم رائی ہیں، اس کی تالیف کا آغاز اگست دوہزارسات میں ہوا اور دس مئی دو ہزار دس کو یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اشاعت دو ہزار گیارہ میں ہوئی، یہ کتاب 288 صفحات پرمشتمل ہے، میرے سامنے ادارہ اساس العلم کراچی 2011 کاایڈیشن ہے، حضرت ابوبکرصدیقؓ کی سیرت اس انداز میں شروع ہے۔

''سسررسول، مسلم اول، والداسماء، ہمدم مکرم، اسلام کاحاکم اول، سرداردارالسلام، وارداورل دارالسلام، ماہ عالم، مہرعالم، سمع رسول، رسول اللہ کے دکھ دردکاحصہ دار، اساس علم، ہمدم رسول، ہم راہی کھوہ، حامیِ رسول، ارحم عالم، صالح عالم، دلارائے رسول، ہم راہی ماءاعلیٰ، امام ملائک، حرداراالآلام، مملوک اللہ، ولدولدعامر، صلاح کاررسول، محمودرسول، مددگاررسول، دل دادۂ رسول، داعی اول، رسول اللہ کا ہم عمر (اللہ اس سے مسرورہو)''6

5. **محمدرسول اللہؐ:** یہ سیرت نبی پرایک غیرمنقوط کتاب ہے، جس کے مصنف محمدیٰسین سروہی ہیں، 2007 میں مشتاق بک کارنرلاہورسے یہ کتاب شائع ہوئی ہے، یہ 544 رصفحات پرپھیلی ہوئی ایک مبسوط کتاب ہے، بسم اللہ کاترجمہ یوں کیاگیاہے:

''اللہ مالک کے اسم سے کہ وہ رحم والااورکمال رحم والاہے۔''7

6. **درس کلام اللہ:** یہ قرآن مجید کامکمل پہلا اردوغیر منقوط ترجمہ ہے، اس ترجمہ نگار کا نام ڈاکٹرمحمد طاہرمصطفیٰ ہے، جویونیورسٹی آف مینیجمنٹ اینڈٹیکنالوجی، جوہرٹاؤن، لاہورمیں شعبہ اسلامی فکروتہذیب کے استاد ہیں اوراسماء النبی میں پی ایچ ڈی کرچکے ہیں، انھوں نے اس ترجمہ کودوسال میں مکمل کیاہے، 14 مئی 2011 میں اس کا آغازکیا اور 13 مئی 2013 کواس کام سے فارغ ہوئے، جناب محمدریاض صاحب (موضع ٹوبہ ٹیک، سندھ، پنجاب، پاکستان) کے بہ قول یہ ابھی مخطوطہ کی شکل میں موجودہے اورزیورطباعت سے آراستہ ہونے کامنتظر، سورۂ اخلاص کاترجمہ بطورنمونہ پیش خدمت ہے:

''کہہ دوکہ اللہ احدہے* اللہ (ارحام کے سارے واسطوں سے) ماوراہے* سوال ہی معدوم کہ اس کی کوئی اولادہواوروہ کسی کی اولادہو*سوال ہی معدوم کہ کوئی اس کے مساوی ہو''8

منظوم غیرمنقوط کتابیں

جس طرح غیرمنقوط کتابیں نثر میں لکھی گئی ہیں، اسی طرح نظم میں بھی کوشش کی گئی ہےاور پرلطف بات یہ ہے کہ جس طرح نثر میں انشاءاللہ خاں انشاکواولیت حاصل ہے، اسی طرح نظم میں انھیں کوسقیت حاصل ہے، آیئے اس سلسلے میں تصنیف شدہ کتابوں کوجانتے چلیں:

1. **دیوان انشا:** انشاء اللہ خاں انشا نے پوراایک دیوان (مختصر) بغیرنقطہ کے لکھی ہے، جوان کی کلیات میں شامل ہے، اس میں ایک حمد، ایک مخمس اورچوبیس غزلیات شامل ہیں، یہ پورادیوان فارسی کی ایک غزل کو چھوڑکراردومیں ہے، جس میں 1332 شعار ہیں، کلام انشا میں ایک جگہ غیرمنقوط 43/اشعار پرمشتمل ایک منقبت ہے، جس کے دوشعرحاضرہے:

ہلاؤ مروحۂ آہ سرد کو ہر گام
کہ دل کو آگ لگا کر ہَو اہُوا آرام
درِ وصال دل آرام دور، ورہ مسدود
مرد مرحلہ گرد وساوس واوہام 9

غیرمنقوط دیوان کے کچھ اوراشعار، جوکلام انشاء میں اختصار کے ساتھ تقریباً دس صفحات (333-343) میں ہے، پیش خدمت ہے۔

اورکس کا آسرا ہو سر گروہ اِس راہ کا
آسرا اللہ اور آل رسول اللہ کا
اہل عالم کا سہارا آسرا کس کام رکھ
ہر سحر گہہ آسرا واللہ اُس درگاہ کا

اور۔

دل کم حوصلہ کو گو کہ سدا درد رہا
ہم دم اس کا گلہ آلودہ دم سرد رہا
المدد والمدد اُو معرکہ آرا کہ مدام
مرداس معرکہ کادادرسِ مرد رہا10

2. **ماہ کامل:** یہ مشہورمرثیہ نگارمرزاسلامت علی دبیرکا بغیرنقطوں والامرثیہ ہے، جو 34 رصفحات پرپھیلا ہواہے، اس کوحضرت مہذب لکھنوی نے مرتب کیاہے، اس کے ناشرسیدحسین میرزامقرب لکھنوی ہیں، جنھوں نے سرفراز قومی پریس لکھنؤسے جنوری 1961 میں شائع کیاہے، اس میں آٹھ رباعیات، ایک سلام اور 69/بندکامرثیہ ہے، رباعیات کی ابتدااس سے ہوئی:

آرام دل حرم کا معدوم ہوا
کم عمر کا حال مرگ معلوم ہوا
دودھ اگلا، لہو ڈالا، درا کھا کرسم
اور سر ددہ معصوم کا معصوم ہوا11

3. **طالع مہر:** یہ مرزادبیرکے غیرمنقوط کلام کامجموعہ ہے، جسے ڈاکٹرسیدتقی عابدی نے اپنی تحقیق، تدوین اور تشریح کے ساتھ 2004 میں اظہارسنزپرنٹرز، لاہورسے شائع کروایاہے، یہ مرزادبیرکے گیارہ 11 رباعیات، ایک قطعہ منقبتی (بندمسدس)، دوسلام، ایک قطعۂ تاریخ مرثیہ: مہرعلم سرورِاکرم ہواطالع، دومراثی پرمشتمل ہے، پہلے مرثیہ کی ابتدا، جو 68 بندکاہے، اس طرح ہے:

مہر علم سرورِ اکرم ہوا طالع
ہر ماہِ مرادِ عالم ہوا طالع
ہر گام علم دار کا ہم دم ہوا طالع
اور حاسد کم حوصلہ کا کم ہوا طالع

دوسرے مرثیہ کاآغاز، جس میں 101 بندہیں، یوں ہوا ہے۔

ہم طالع ہما مرو ہم رسا ہوا
طاؤس کلک مدح اڑا اور ہما ہوا
مطلع ہمارا مطلع مہر سما ہوا
اور دوحۂ کلام سراسر ہرا ہوا12

اس دوسرے مرثیہ کونواب محمدتقی خاں اختر کی طرف بھی منسوب کیاگیاہے؛ چنانچہ حضرت مہذب لکھنوی 'ماہ کامل' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''نواب محمد تقی خاں اختر نے 106/بند کا ایک مرثیہ اسی صنعت (غیر منقوط) میں کہا، جس کا مطلع ہے: 'ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا'؛ چونکہ اس مرثیہ میں عطارد تخلص رکھا ہے، اس وجہ سے بعض لوگ اسے حضرت دبیر کا کلام سمجھتے ہیں؛ کیوں کہ ایسے ہی محل پر انھوں نے بھی یہی تخلص اپنے لیے پسند کیا تھا۔''[13]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مرثیہ مرزا دبیر ہی کا ہے؛ چنانچہ شمس العلما مولانا حسین احمد آزاد لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب نے 29/محرم 1292ھ کو 72/ سال کی عمر میں انتقال کیا، اس مدت میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا، سلاموں، نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں، ایک مرثیہ بے نقط لکھا ہے، جس کا مطلع ہے: ''ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا''، اس میں اپنا تخلص بجائے دبیر کے عطارد لکھا ہے۔''[14]

اس سلسلے میں اگر مزید تحقیق درکار ہو تو ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مرتب کردہ کتاب 'طالع مہر' میں دیکھ سکتے ہیں، جہاں انھوں نے ماہرین کی تحریریں بھی نقل کی ہیں اور خود کا تجزیہ بھی۔

4. قاری یعقوب علی خاں نصرت کی رباعیات، سلام اور مرثیہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی نے قاری یعقوب علی خاں نصرت (مدد) شاگرد مرزا دبیر کے بے نقط کلام کو بھی 'طالع مہر' کی زینت بنایا ہے، یہ وہی قاری یعقوب علی خاں نصرت ہیں، جن کی طرف 'ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا' مرثیہ منسوب ہے، قاری صاحب کے اس مرثیہ کا آغاز، جو 50/بند پر مشتمل ہے، اس طرح ہے۔

مداح ہوا کلک امام دوسرا کا
مسرور ہو دل لکھ کلمہ صل علا کا
مطلع ہو کہ عالم ہو مہ و مہر سما کا
مداح ہو مورد کرم و مہر و عطا کا[15]

5. مصدر الہام: یہ مشہور شاعر و ادیب صبا متھراوی کا غیر منقوط مجموعۂ کلام ہے، جن کا نام رفیع احمد ہے، ان کی پیدائش متھرا (یوپی، انڈیا) میں ہونے کی وجہ سے متھراوی کہلائے، ان کا یہ غیر منقوط مجموعۂ کلام حمد، مدح رسولؐ اور مختلف عناوین کی رباعیات پر 96 صفحات پر مشتمل ہے، اس مجموعے کی اشاعت 1981 میں مکتبۂ اردو ادب، کراچی سے ہوئی، کچھ نمونے پیش خدمت ہیں:

مسلسل درود اور مسلسل سلام — مدام و مدام و دوام دوام
حرم ہو ارم ہو محمد کا گھر — دو عالم محمد کا ملک دوام
ہواؤ دکھاؤ محمد کا در — معطر معطر وہ دار السلام[16]

6. مدح رسول: یہ نعتیہ مجموعۂ کلام ہے، جو مشہور شاعر راغب مراد آبادی کے کاوش قلم کا عمدہ نمونہ ہے، 176 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں چالیس غیر منقوط نعتیں اور تیس رباعیات ہیں، ان تمام میں بجز تخلص راغب کے کسی اور حرف میں نقطہ نہیں نظر آتا، کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی ہے، جو صفحہ: 168 سے صفحہ: 176 تک ہے، 'الحمدللہ' کے نام سے ایک بے نقط مضمون بھی صفحہ: 47 تا صفحہ: 51 تک شامل ہے، تصنیف کا سنہ 1979 ہے؛ لیکن اس کی اشاعت 1983 میں ایجوکیشنل پریس کراچی سے ہوئی، کچھ نمونے پیش خدمت ہیں:

رسول ہدیٰ کا کرم اللہ اللہ — ہوا دور اک اک الم اللہ اللہ
سواد حدود حرم اللہ اللہ — حدود حرم اور ہم اللہ اللہ
رہا اللہ اللہ کرم اس کا ہر دم — ہوا سہل کار عدم اللہ اللہ[17]

ایک دوسری نعت میں کہتے ہیں:

ورد کر او دل! سدا اسم رسول اللہ کا
دور ہر لمحہ ہراس و ہول ہوگا راہ کا
کاکل سرور کا سودا، سر کو ہو مولا عطا
دل کو حاصل ہو، سرور سرمد اس درگاہ کا[18]

7. محمدھی محمد: یہ بھی غیر منقوط منظوم کتاب ہے، جس کے مؤلف سید محمد امین شاہ نقوی ہیں، یہ 240 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں حمد، نعت اور مناقب پر 113 نظمیں اور 'گلہائے معطر' کے عنوان کے تحت 19 نعتیہ قطعات ہیں، یہ کتاب پہلی بار 1985 میں باب الہدیٰ فیض آباد، فیصل آباد (پاکستان) سے شائع ہوئی، اس میں پنجابی، اردو، فارسی اور عربی چاروں زبانوں میں کلام ہے، 1989 میں اس کے مؤلف نے ایک عربی غیر منقوط نعتیہ مجموعہ بھی لکھا ہے، جس کا نام 'محمد رسول اللہ' ہے، اس میں 33 منظومات، 313/اشعار، 12/حمد اور 21/نعتیں ہیں، اس کتاب کا ایک شعر یہ ہے:

وہی ہے سارے مکارم کا مصدر ومحور
صدائے روح مہاں لاالٰہ الااللہ [19]

8. داعی اسلام: یہ ایک منظوم غیر منقوط سیرت کا مجموعہ ہے، جو 200 صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس کے خالق مولانا صادق علی انصاری قاسمی دریابادی صادق ہیں، ان کی پیدائش 15 اپریل 1936 اور وفات 15 دسمبر 2018 میں ہوئی، غیر منقوط منظوم سیرت لکھنے کا داعیہ مولانا محمد ولی رازی کی غیر منقوط نثری سیرت 'ہادیٔ عالم' دیکھ کر ہوا[20] ناشر: خالد کمال اشاعت گھر، لہرولی بازار، ہٹوا، بستی یوپی ہے، یہ کتاب 86-1985 کی تصنیف ہے۔ اس کا سنہ اشاعت 1993 ہے، 'مہم اور معرکے کی اصطلاح' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

مسلسل ٹوہ گمراہوں کی، ہٹ دھرموں کی محصوری
حسد کاروں کی رکھ والی کو ہم دردوں کی معموری
مددگاروں کی گرما گرم اصلاحی عمل کاری
گروہوں کی عدو کے اطلاع، اُسروں کی دل داری
مہم کے اسم سے سارا عمل موسوم ہے لوگو
ہمارے ہسٹری داں کو اگر معلوم ہے لوگو
اگر حاصل رہی سرکردگی سرکار عالی کی
مہم اسلام کی وہ اصطلاحاً 'معرکہ' ہوگی [21]

'معاہدۂ صلح کے رہ گئے عمرہ کی ادائے گی' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

رہا طے کارواں اسلام والوں کا ادھر لوٹے
رہا طے آکے اگلے سال عمرے کو ادا کرلے
رہے سہ دار کوئی اسلحہ ہو گھر کو رکھ آئے
کرے عمرہ، رہے صم گم، کیے عہدوں کا ڈر کھائے
اسی کی رو سے ہم دردوں مددگاروں کی اک ٹولی
گئی مکہ ادا عمرے کو کر کے گھر لوآ لوٹی [22]

9. محامد وراء المعراء: یہ میاں چنوں (پاکستان) کے رہنے والے سید مختار گیلانی کا چھ زبانوں (سرائیکی، پنجابی، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی) پر مشتمل صنعت عاطلہ میں مجموعۂ کلام ہے، یہ 304/صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس کی اشاعت 1993 میں ہوئی، اس کتاب میں شاعر نے اردو زبان کے 19 غیر منقوط حروف ہجائی (ٹ، ح، د، ڈ، ر، ڑ، س، ص، ط، ع، ک، گ، ل، م، و، ہ، ء، ی، ے) کے لحاظ سے انیس باب بنائے ہیں اور ہر باب کو ایک غیر منقوط حرف سے خالی رکھا ہے، مثلاً: پہلے باب کے اشعار 'الف' سے اور دوسرے باب کے اشعار 'ٹ' سے خالی رکھا، 'س' سے خالی کی مثال ایک شعر میں ہے۔

والی و مولا وہی عالم کا آمر ہے وہی
ماہ و مہر ولعل و گہر کا مصور ہے وہی[23]

10. سرکار دو عالم: یہ کتاب بھی منظوم صنعت عاطلہ کی عمدہ کاوش ہے، جو سید تابش الوری کی تصنیف ہے، اپریل 2004 میں مجلس ثقافت پاکستان، بہاولپور سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب حمد اور مدح رسول پر مشتمل 106 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، 2005 میں حکومت پنجاب کی طرف سے اسے کتب سیرت کے مقابلے میں انعام اول کا مستحق بھی قرار دیا گیا، تابش الوری کا اصلی نام سید سردار علی ہے، ان کی کتاب سے کچھ نمونے پیش خدمت ہیں۔

سرور سے دل لہک رہا ہے، درود سے روح کھل اٹھی ہے
کسی کی آمد کا سلسلہ ہے، ہوا مسلسل مہک رہی ہے
ہوا اسی کی مکاں مکاں ہے، صدا اسی کی گلی گلی ہے
اسی سے دم دم کا واسطہ ہے، اسی سے دلڑی لگی ہوئی ہے [24]

(سرکار دو عالم، ص 63)

ایک دوسری نعت میں ہے ۔

ہمارے ہمارے محمد محمد　کہوں کے سارے محمد محمد
کسی کا سہارا گوارا کہاں ہے　ہمارے سہارے محمد محمد
ارادوں کے حاصل، مرادوں کے ساحل
دعاؤں کے دھارے، محمد محمد 25

11. **ارحم عالم:** یہ منظر پھلوری کی غیر منقوط نعتوں کا مجموعہ ہے، اس میں 52 نعتیں ہیں، اس کا پہلا ایڈیشن جنوری 2013 میں شائع ہوا، 2014 میں عید میلاد النبی کے موقعے پر منعقد قومی سیرت کانفرس میں صدر پاکستان ممنون حسین نے صدارتی ایوارڈ سے نوازا، 11 فروری 2014 میں اس کا دوسرا ایڈیشن احسن پبلی کیشنز فیصل آباد (پاکستان) نے شائع کیا، منظر پھلوری کا اصل نام عبدالمجید افضل ہے، قلمی نام منظر پھلوری ہے اور غیر منقوط میں تخلص 'سائل' استعمال کرتے ہیں، یہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ (پاکستان) کے 'اڈہ پھلور' میں 10 جنوری 1973 میں پیدا ہوئے، اس کی غیر منقوط شاعری کے کچھ نمونے حاضر خدمت ہیں۔

کرم کی راد لے کر سرکار آئے
وہ سرور، وہ ہادی، وہ سردار آئے
وہ سرور، وہ اکرم، وہ سردار عالم
وہ علم و فضل کے کرم کار آئے 26

ایک دوسری نعت اس طرح ہے ۔

حد ادراک سے ما ورائے گماں
وہ وری الوری، کوئی اس سا کہاں
وہ عطائے الہٰ، سائر لا مکاں
ہادی کل، وہی مرسل مرسلاں 27

12. **والی لولاك:** یہ بھی منظر پھلوری ہی کی غیر منقوط مجموعۂ کلام ہے، جو حرمین، فیصل آباد سے 2016 میں شائع ہوئی، اس کے صفحات: 136 ہیں۔

13. **ماہ حرا:** یہ بھی منظر پھلوری ہی کا غیر منقوط مجموعۂ کلام ہے۔

14. **اساس ادلہ:** یہ بھی منظر پھلوری کا غیر منقوط مجموعۂ کلام ہے۔

15. **معلم عالم:** یہ جناب عبدالرحیم ارحم قریشی کا پہلا غیر منقوط نعتیہ مجموعہ ہے، جو 2014 میں محض تین ماہ کی محنت سے وجود میں آیا، اس سے پہلے جو غیر منقوط کتابیں وجود میں آئیں 28 ش، ان میں 'ط' والے حروف (ڈ، ٹ، ڑ) سے مدد لی گئی تھی؛ لیکن ارحم قریشی کے اس مجموعے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ان حروف سے بھی احتراز کیا گیا ہے، اس مجموعے میں نعتوں کے علاوہ حمد و دعا بھی ہے، جس کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں ۔

میرے اللہ، میرے مالک، میرے مولا لکھ دے
سر ارحم کو محمدؐ کا ہو سودا لکھ دے
سر میرا مس در اطہر سے ہوا ہو، اس دم
مرگ ارحم کا الٰہی وہی لمحہ لکھ دے
ہر کوئی اس کو محمدؐ ہی کا مداح کہے
مدح سرورؐ ہی رہے، اس کا حوالہ لکھ دے

بارگاہ رسالت میں 'نذرانۂ درود و سلام' کی روانی ملاحظہ کریں:

سرور دوسرا، وہ رسول ہدی
اس کے مملوک ہم، وہ ہمارا امام
اس کو لاکھوں درود، اس کو لاکھوں سلام
ہے مسلسل وہی، ہے مکمل وہی
اس اعلی عمل، اس کا اعلی کلام
اس کو لاکھوں درود، اس کو لاکھوں سلام
درکلام ہدی، ہم کو صلوا کہا
اور کہا سلموا، حکم ہے حکم عام
اس کو لاکھوں درود، اس کو لاکھوں سلام 29

16. **اسرار السلوک:** یہ گوجرخان کے خط پوٹھوہار کے معروف شاعر فاضل شائق کا غیر منقوط شعری مجموعہ ہے، جس کی تقریب رونمائی 10 جنوری 2019 میں ہوئی۔ 30

17. **روح عالم:** یہ یوسف طاہر قریشی کا غیر منقوط مجموعۂ کلام ہے، جو 184 صفحات پر مشتمل ہے، اس کی اشاعت نعت اکادمی، فیصل آباد سے 1998 میں ہوئی، نعتیہ اشعار کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

سہل ہو راہ مدح محمد　مرے الٰہی مری دعا ہے
مدح طاہر الہامی ہے　مدح رسول کا ما حصلہ ہے 31

18. **مدح رسول:** یہ کامران اعظم سوہدری کا غیر منقوط مجموعۂ کلام ہے، یہ 104 صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب علم وعرفان پبلشرز، لاہور سے 2099 میں شائع ہوئی، کامران اعظم سوہدری 20 دسمبر 1976 میں سوہدرہ تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے، یہ ایک پاکستانی مصنف ہیں، جن کی قرآن وحدیث، تاریخ وسیرت، کتب شاعری اور مختلف علوم وفنون پر سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، 'مدح رسول' کی ابتدا ان اشعار سے کی ہے:

ہر سو اس کا عکس ہدی　ہر سو وہ آس عہد روا 32

یہ اردو کی غیر منقوط کتابوں کا ایک مختصر تعارف تھا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر کتنی صلاحیتیں رکھی ہیں، اگر انسان ان کا استعمال کرے تو روز ایک نیا تحقیق کا باب دریافت ہوتا رہے گا۔

حوالہ جات

(1) فن تحریر کی تاریخ، تعارف، ص: ب، مطبوعہ: انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 1962
(2) انشاء اللہ خاں انشا، از: عابد پشاوری، ص: 30-513، ط: اتر پردیش اردو اکادمی 1985، انشاء اللہ خاں انشا، از: سید تقی عابدی، ص: 84-83، ط: القمر انٹر پرائزرز، رحمان مارکٹ، اردو بازار، لاہور
(3) سلک گوہر، ص 13
(4) ہادی عالم، ص 43
(5) سروں کے سودے، ص 250
(6) دوسر دو داماد، ص: 3-42
(7) محمد رسول اللہ، ص 33
(8) معارف نومبر 2018، ص: 347، urduweb.org/ mehfil/ threads/ 65679
(9) کلام انشاء، ص 269
(10) کلام انشاء، ص: 343-333، مرتبہ: مرزا محمد عسکری محمد رفیع فاضل دیوبند، مطبوعہ: ہندوستانی اکیڈمی، الہ باد، اتر پردیش 1952
(11) ماہ کامل، ص 5
(12) طالع مہر، ص 156
(13) مقدمہ ماہ کامل، ص 3
(14) آب حیات، ص 278
(15) طالع مہر، ص 215
(16) punjnud.com احمد سہیل کا مضمون: صبا متھراوی: ادیب، شاعر، ادبی تاریخ گو اور استاد، نیز دیکھیے: ci.nii.ac.jp
(17) مدح رسول، ص: 76-75
(18) مدح رسول، ص 133
(19) محمد ہی محمد، ص 26
(20) داعی اسلام، ص 6
(21) داعی اسلام، ص 145
(22) داعی اسلام، ص 182
(23) معارف، نومبر 2018
(25) سرکار دو عالم، ص 41
(26) ارحم عالم، ص 45
(27) ارحم عالم، ص 27
(28) معلم عالم، ص 12
(29) hamariweb.com/article/113083
(30) urdupoint.com/daily/livenews/2019-01-10/news-1802034.html
(31) معارف نومبر 2018
(32) ur.wikipedia.org، مدح رسول، ص 1 بحوالہ: معارف، نومبر 2018

■

Md. Jamil Akhtar Jameeli
Vill + P.O: Pochari
Distt: Dhanbad - 828306 (Jharkhand)
Mob.:8292017888

محمد سہیل انور

کلیم الدین احمد کا نظریۂ نقد

صنفِ غزل اور ترقی پسند مصنّفین کے حوالے سے

اردو دنیا کی تنقید میں کلیم الدین احمد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ البتہ شعبۂ تنقید میں انھوں نے نام کمایا، اس سے کہیں زیادہ بدنامی اُن کے حصے میں آئی۔ اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں اپنے نظریۂ نقد کی پرورش خود ہی کی اور کسی بھی قسم کے متضاد اور متنازعہ بیانات کی فکر نہ کرتے ہوئے اپنی بے باک رائے کا برملا اظہار کیا اور خود ہی اپنے مقدمے کی پیروی بھی کی۔ بالخصوص جب ہم اردو ادب کے سرمایے میں صنفِ غزل اور ترقی پسند مصنّفین، مثلاً ادبا، شعرا، تنقید نگار و محققین کی خدمات کا ذکر کرتے ہیں تو اِن مشاہیرِ ادب پر کلیم الدین احمد نے اپنا نظریۂ نقد، جس بے تکلفانہ اور گاہے بہ گاہے متنازعہ فقرے کے پیرائے میں کیا ہے اس کو نظر انداز اور چشم پوشی تو در کنار، فراموش بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ در اصل زیرِ نظر مضمون 'صنفِ غزل اور ترقی پسند مصنّفین کے رجحانات پر کلیم الدین احمد کا نظریۂ نقد' کے حوالے سے تجزیہ پیش کرنے کی ایک چھوٹی سی کاوش ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے مقبول ترین صنف غزل اور تنقید کے حوالے سے جو مختلف فقرے چسپاں کیے ہیں۔ مثلاً:

الف: 'غزل نیم وحشی صنفِ سخن' ہے

ب: 'تنقید 'معشوق کی موہوم کمر ہے'

ج: یا' اقلیدس کا خیالی نقطہ

اِن فقروں پر آج کے ادبی ماحول میں خاطر خواہ بحث ہونی چاہیے۔ نہ کہ صرف اس کو مخالفین کے ذریعے معترضہ جملے یا فقرے یا معترفین کے حوالے سے معترفہ جملے یا فقرے کہہ کر اِن سے چشم پوشی کرنا یا دست بردار ہو جانا، راقم السطور کی نظر میں صحت مند رویہ نہیں ہو سکتا۔

در اصل زیرِ نظر مضمون میں راقم الحروف نے اِنہی پہلوؤں و نکات کو از سرِ نو اپنی علمی بساط بھر احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ میری نظر میں 'غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن' کہنا در اصل خالص مغربی شعریات یا صنف غزل کو مغربی عینک سے دیکھنے کی ایک سعی ہو سکتی ہے کیونکہ اس قول یا فقرے میں (جہاں تک میری دانست میں ہے) کلیم الدین احمد نے کوئی اضافی یا مدلل بات نہیں کی ہے سوائے اس کے کہ مغربی ادب میں رائج Semi Barbary Poetry کا جو Concept تھا، انہوں نے من و عن اُسی کا اردو ترجمہ پیش کر دیا۔ اگر ہم بالفرض مان بھی لیں کہ جب انھوں نے اِس قول و فقرہ کو (خواہ وہ ترجمہ کی شکل میں ہی ہو) اپنی ذہنی اُپج کے طور پر پیش کیا یا مطمحِ نظر بنایا تو عین ممکن ہے کہ مغرب میں بھی شعریات (Poetry) کو اُسی سیاق و سباق میں دیکھا، پرکھا اور سمجھا جا رہا تھا اور ایسا کہنے کے پسِ پردہ اُن کا مغربی نظریہ حائل ہو۔ اس فقرے سے صنف غزل کی تضحیک کی بلکہ مشرقی ادب کی سب سے معتبر و مقبول صنف و شاعری پر بھی ایک کاری ضرب لگائی۔

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے
کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

زیرِ نظر شعر میں موصوف نے غزل کو صنم سے تشبیہ دی ہے۔ ہر عاشق و معشوق، کھُلی آنکھوں سے اپنے جسم کے چند اعضاء کے علاوہ ہر عضو کو دیکھ سکتا ہے تو پھر کلیم الدین احمد نے مذکورہ شعر پیش کر کے 'تجاہلِ عارفانہ' سے کام کیوں لیا؟ حالانکہ ان سے پیشتر ناقدوں نے بھی شاعری اور غزل کی رُو سے تمسخر اور معترضہ جملے پیش کیے ہیں۔ مثلاً بابائے اردو تنقید حالی نے اِس نوع کی شاعری اور غزل، جس میں نسوانی موضوعات، محبوب سے لگی لپٹی، حسن و عشق، رومانس و جمالیات اور صرف چوٹی کنگھی کی ہی باتیں ہوں یا خود بقول حالی: موضوع یا ہیئت کے اعتبار سے جس قسم کی شاعری میں جوش، اصلیت، سادگی اور صحتِ الفاظ کا برمحل استعمال نہ ہو تو الطاف حسین حالیؔ نے ایسی شاعری کو 'ناپاک دفتر' سے تعبیر کیا اور اس قسم کی شاعری میں برتنے والے موضوعات مثلاً حُسن و رعنائیاں اور بے جا جمالیات کو ایک شعر میں اس طرح ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

یہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے بھی ہے بدتر
گنہگاروں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

تو دوسری طرف نظم طباطبائی نے 'غزل' سے بدظن ہو کر یہ مشورہ دے دیا کہ 'اس کی گردن مار دو' اور اِس نوع کی شاعری کو 'غزل' نہیں بلکہ 'ہزل' سے موسوم کیا۔ طباطبائی نے ایسا کہہ کے شیوۂ گفتار (میر کا شیوۂ گفتار) کو تنگنائے غزل کا شکار بنایا۔ انھوں نے بھی غالباً 'غزل' کو تنگ زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ غالباً ایسے ہی موقع کے لیے غالب نے بھی کہا تھا۔

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
(لیکن مثبت انداز میں)

شاید انھی ادیبوں و ناقدوں (حالی و طباطبائی) کے پیشتر اقوال وفقروں کے پرتَو میں ہی 'غزل' پر جب کلیم الدین احمد گویا ہوئے تو انھوں نے بھی غزل کی مناسبت سے بڑا ہی سخت گیر لہجہ اختیار کیا اور شاید اس کی وجہ میری نظر میں یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کلیم الدین احمد بھی اپنے پیش روؤں کے خیالات سے صنفِ غزل کے متعلق بدگماں ہوئے ہوں، دوسرے مغرب میں شاعری کے حوالے سے جو نظریہ پیش کیا جا رہا تھا ممکن ہے اُس سے بھی کبیدہ خاطر ہوئے ہوں یا مرعوب ہوئے ہوں، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ اُنھیں غزل جیسی معتبر اور ہر دلعزیز صنف پر ایسی ہی گاج (بجلی) گرانی مقصود تھی تو صحتِ الفاظ کے ساتھ مطعون کرتے نہ کہ بطور تضحیک و تمسخر سخت ترین فقرہ پیش کر کے اس صنف بلکہ اس کی ساکھ پر بھی سوالیہ نشان لگانے کی کوشش کی؟

لیکن اس کے برخلاف 'غزل' کے حوالے سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ قول'' غزل اردو شاعری کی آبرو ہے''

یقیناً غزل کی صحت اور مقبولیت کے عین موافق تھا اور اُن کا یہ فقرہ یا تمہید 'غزل' کی تمثیل کے عین مطابق ہو گیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اگر غزل کی صحت اور اس کے موضوع و ہیئت کے اعتبار سے اپنے رخِ نظر کا برملا اظہار نہ کیا ہوتا تو یہ بھی امکان تھا کہ بعد کے نقاد (بشمول کلیم الدین احمد) غزل پر اُس کی ہیئت و ندرتِ بیان کے لحاظ سے مزید کتنے سخت گیر حملے کرتے یا جملے چسپاں کرتے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ حالانکہ اردو ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے صنفِ غزل کا کینوس (Canvass) اس قدر وسیع و وقیع ہے کہ اس میں موضوعات کے اعتبار سے ہر طرح کے کلام کو اعتبار بخشنے کا ہنر مضمر ہے اور مستقبل میں بھی اس کے امکانات روشن و تابناک ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں موضوعات کے تنوع کے باعث ہی اس کی وسعت پذیری و ہمہ گیریت کا اعتراف ہر دور کے صاحبِ نظر ادیب و شاعر نے کیا ہے۔

غزل میں جب حسنِ بیان اور ندرتِ بیان کی خوبصورت آمیزش ہوتی ہے تو ایسی غزل کو 'تغزل' کے زُمرے میں رکھا جاتا ہے اور اس کی یہی حُسن و رعنائیاں، مکمل غزل کو اعتبار بخشنے میں معاون ہوتی ہیں۔ مثلاً سودا، میر، غالب اور مومن کا یہ شعر ملاحظہ کریں، جس کو تغزل کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اور خدائے سخن میر کا یہ کلام۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس ضمن میں غالب کا کلام بھی ملاحظہ کریں جو تغزل کا خوبصورت نمونہ ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور مومن کا یہ شعر تو ضرب المثل ہی بن گیا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالانکہ کلیم الدین احمد، اپنی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' کے پیش لفظ میں تنقید کے اصول وضوابط سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر آپ کاشت کاری کے اصول سے واقف نہیں ہیں تو آپ کسان نہیں بن سکتے اُسی طرح اگر آپ اصولِ تنقید سے واقف نہیں ہیں تو آپ نقاد نہیں بن سکتے۔ اردو میں تنقید کی ترتیب وتشریح ابھی تک نہیں ہوئی ہے''

لیکن یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ کلیم الدین احمد کے اقوال میں اس قدر تضاد کیوں ہے؟ اول تو وہ 'اردو میں تنقید کی ترتیب وتشریح' کو نامکمل کہتے ہیں، پھر صنفِ غزل پر طعن و تشنیع کیوں؟ اور اس معتبر صنف کو ہدفِ تنقید کیوں بنایا؟ اس قسم کے کئی سوالات ذہن میں اُٹھتے ہیں! جب کہ وہ اس کے برخلاف خود اپنی مذکورہ کتاب کی تمہید میں یہ کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ 'اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے'۔ ایک طرف تو اردو میں تنقید کے وجود کو ہی سرے سے تسلیم نہیں کرتے اور اس کو فرضی گردانتے ہیں، لیکن دوسری طرف اُسی صفحہ پر سرِ عبارت غزل کا ہی ایک شعر بطور نمونہ پیش کرتے ہیں، جو اُن کے تخیّل کی نہ صرف تردید کرتا ہے بلکہ صنفِ غزل میں جو عمدہ رعنائیاں اور ندرتِ بیان مضمر ہے اِس شعر میں اُس کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

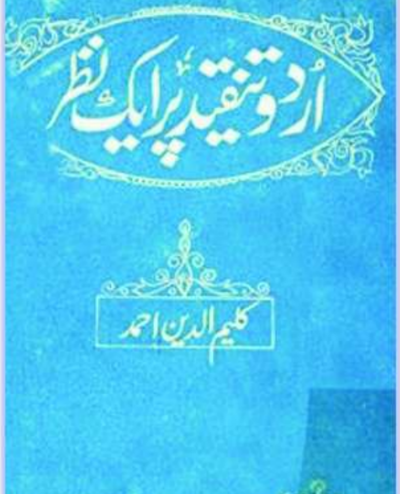

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین وحق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

یہی تو دراصل غزل کی اپنی دلکشی و رعنائی اور ندرت ہے کہ مصرعہ اول و مصرعہ ثانی میں تضاد کے باوجود بھی غزل کا شعر اپنی پوری تابناکی کے ساتھ سامعین و قارئین کے اذہان پر اثر پذیر ہو جاتا ہے اور مصرعہ اول وثانی میں بے ربطگی کا گماں تک نہیں گذرتا ہے۔ یہ غزل کی ہی پرکاری، خوبصورتی اور اثر پذیری ہے کہ اپنی سادگی اور اظہارِ بیان کی ندرت کے باعث بڑے سے بڑے نازک اور تاریخی موضوعات کو بھی آسانی سے اپنے کلام میں سمیٹتے ہوئے اپنی انوکھی غنائیت سے مترنم و مترشح بنا دیتی ہے۔

میر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

اب دیکھیں میر کے مذکورہ شعر میں غزل کی رعنائیاں جلوہ افروز ہیں تو اس میں انفرادیت کا عنصر بھی ہے اور عہدِ مغلیہ کی تاریخی و ثقافتی منظر نامے کی روداد بھی ہے۔ لیکن میر کے اس شعر کو سیاق وسباق میں سمجھنے اور پرکھنے کی اہلیت وہی شخص یا ادیب کر سکتا ہے جو متعلقہ دور یعنی عہدِ مغلیہ کی تہذیب و ثقافت اور صناعی و مصوری سے بخوبی واقف ہو، ورنہ متذکرہ شعر عام قاری کے لیے زندگی کے لائحہ عمل کی ایک عمدہ تمثیل کے بجائے صرف مسرّت و انبساط بہم پہنچانے کا ذریعہ کے علاوہ کچھ نہیں ثابت ہو سکتا ہے۔ اس بے غزل کے اشعار بظاہر پہلی قرأت میں خوبصورت محاکات و منظر نگاری کے ساتھ بھی جلوہ گر ہوں تو اس کی جمالیات و رعنائیوں سے آپ یکسر یہ کہہ کر دست بردار نہیں ہو سکتے کہ اس میں صرف حُسن و جمال کی بظاہر سطحی رعنائیوں یا دلکشی کا ہی ذکر ہے۔ لہٰذا غزل کے

سیاق وسباق کا بغائر مطالعہ کیے بغیر یا اِس کی تفہیم و تعینِ قدر سے پوری طرح لطف اندوز ہوئے بغیر متعلقہ غزل یا شعر کے حسن و معیار کا بخوبی جائزہ نہیں لے سکتے اور نہ اس کے معیارِ اظہار اور معاملہ بندی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ کلیم الدین احمد بھی اِس کلیے سے بخوبی واقف تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر میں' تمام اختلافات کے باوجود دانستہ یا نادانستہ طور پر یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ 'آرٹ براہِ راست حقیقت کا جلوہ گر ہے'۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی بات 'بہر کیف'! سے شروع کرتے ہیں، جو اردو زبان و ادب میں 'جملے' کو ممیّز کرنے کا بطور سابقہ ایک خوبصورت حیلہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''... بہر کیف! آرٹ وہ مصوری ہو یا نقاشی، شاعری ہو یا موسیقی، آرٹ کا واحد مقصد افادی علامتوں، رسمی اور سماجی کلیوں غرض ہر اُن چیزوں کو جو حقیقت کو ہماری نگاہوں سے مخفی رکھتی ہیں، مٹاتا ہے اور ہمیں براہِ راست حقیقت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ شاعری ہمیشہ اندرونی کیفیتوں کی ترجمانی کرتی ہے... آرٹ کا مقصد انفرادیت کا حصول ہے، جس شئے کی کوئی آرٹسٹ تصویر کھینچتا ہے، اس کو اُس نے کسی خاص جگہ، کسی خاص دن، خاص ساعت ایسے رنگ میں دیکھا ہے جو پھر کبھی نظر نہ آئے گا۔ شاعر اپنے نغموں میں ایسی کیفیتوں کا اظہار کرتا ہے جو صرف اُس کی ہیں اور جو کبھی لوٹ کر نہ آئیں گی''

(اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد، ص 177 تا 179)

غرض کہ مذکورہ اقتباس میں کلیم الدین احمد نے آرٹ، ادب یا مصوری و شاعری کے حوالے سے جو کُلیے اور آرٹ یا شاعری کے متعلق اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، وہ اس بات کی ضامن ہے کہ کلیم الدین احمد غزل کے حوالے سے کہے گئے اپنے معروضات یا فقرے کی صحت سے رُوگردانی یا انحراف کرتے نظر آرہے ہیں۔ اُن کے اقتباس کو بار بار پڑھنے پر ایسا گماں گذرتا ہے کہ موصوف اپنے ہی معروضات پر نا دانستہ ہی سہی Anti Thesis کی مہر لگانے سے بھی گُریز نہیں کرتے۔ گو کہ کسی

آرٹ کا مقصد انفرادیت کا حصول ہے، جس شئے کی کوئی آرٹسٹ تصویر کھینچتا ہے، اس کو اُس نے کسی خاص جگہ، کسی خاص دن، خاص ساعت ایسے رنگ میں دیکھا ہے جو پھر کبھی نظر نہ آئے گا۔ شاعر اپنے نغموں میں ایسی کیفیتوں کا اظہار کرتا ہے جو صرف اُس کی ہیں اور جو کبھی لوٹ کر نہ آئیں گی۔

بھی موضوع پر اپنی Thesis تو پیش کرتے ہیں لیکن اُس کی Anti Thesis سے پیشتر ہی Synthesis تک پہنچنے کے لیے راستے ہموار کرتے ہوئے نتیجتاً درمیان میں ہی وہ اپنے اس کلیے یا معروضے میں عدم تکمیل کے مرحلے سے گذرتے ہوئے مشکوک نظر آتے ہیں۔ دیکھیں خود اُن کی اِس ذہنی کیفیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ غزل کو اپنی تنقید کا ہدف بنانے سے پیشتر 1956 میں ترقی پسند مصنّفین کے علمبرداروں پر بھی نشانۂ ہدف لگانے سے باز نہیں آئے۔ ملاحظہ کریں مندرجہ ذیل اقتباس، جس میں ترقی پسند ادیبوں اور اُن کے رجحانات سے کبیدہ خاطر ہو کر اُنھیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے:

''..... ترقی پسندوں کے علمبرداروں نے اِن باتوں کو مہمل سمجھ کر اُن کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کی رٹ لگاتے رہے لیکن اس حقیقت کی طرف سے منھ موڑے رہے اور زور زور سے اپنا ایک راگ الاپتے رہے، شاید اس لیے کچھ نئی باتوں کی بھنک کان میں پڑ جاتی تو یہ راگ بے لطف ہو جاتا۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ اِن باتوں کی بھنک کان میں پہنچ ہی گئی لیکن ان کا مدلل جواب نہ بن پڑا تو گالیوں پر اُتر آئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب دو بچے آپس میں لڑتے ہیں اور ایک کمزور پڑ جاتا ہے تو وہ لڑنے کے بدلے گالیوں پر اُتر آتا ہے اور اُنہیں گالیوں سے اپنی کمزوری پر پردہ ڈالتا ہے اور اپنی تسلّی کر لیتا ہے.... ترقی پسند تنقید میں نئی نئی گالیاں ہیں، جسے ترقی پسند نقاد عام طور سے استعمال کرتے ہیں، رجعت پسند، جمہوریت دشمن، عینیت پسند، خیال پرست، تصور پرست، بورژوا اور اس قسم کی بہت سی گالیاں ہیں، اِن لفظوں کا کوئی خاص مفہوم نہیں یہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہیں اور بس۔ اِن لفظوں سے ترقی پسند نقاد کی برہمی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اس تنقید کا جواب گالی ہے۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد ص 179 تا 180)

مذکورہ اقتباس میں کلیم الدین احمد نے ترقی پسندوں کے علمبرداروں اور ترقی پسند مصنّفین کو بھی اپنی تنقید کا ہدف بنایا اور یہ کہہ کر اِن ترقی پسند علمبرداروں کو کم فہم و نافہم گردانا، کیونکہ ترقی پسندوں کے ذریعے جاری کردہ اصطلاحات کلیم الدین احمد کی نظر میں مہمل گوئی اور گالیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں اور یہاں بھی انہوں نے تشبیہ کے طور پر چند اصطلاحات کا سہارا لے کر رجعت پسندوں و ترقی پسندوں کو دو زُمرے میں تقسیم کرتے ہوئے دو بچوں کی طفلانہ حرکت (ایک بہادر اور دوسرا

نسبتاً ڈرپوک) سے موازنہ کیا ہے، جو میری دانست میں مختلف زاویے سے صحت مندرجحان نہیں ہو سکتے۔ بچوں پر ہی کیا موقوف ہے بالغان بھی قضیہ و تکرار کی صورت میں گالی گلوج پر اُتر آتے ہیں لہٰذا یہ معروضہ پیش کرنا قرین ازصحت نہیں ہے دوئم ترقی پسندوں یا اُن کے علمبرداروں کے پختہ اذہان (Maturity) کا مقابلہ بچوں کی طفلانہ شرارت یا نفسیات سے کرنا یوں بھی بعید از فہم معلوم ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد کی تنقیدی نگارشات و حملہ آور فقروں کا بغائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ بین السطور مغالطے اور کنفیوژن کے شکار بھی ہو جاتے ہیں، کیونکہ ایک طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''ترقی پسند مصنّفین کے خیالات 'منطقی طرزِ ادا' کے باوجود (بمعنیٔ دیگر باوصف) بھی منطق سے مبرّا ہوتے ہیں''

(اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد، ص 179 تا 180)

دیکھیں کلیم الدین احمد کی مذکورہ سطر سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ گویا وہ دیہی باشندوں کی ٹھیٹھ دیہی کہاوتوں کے مصداق ہیں کہ ''گُڑ کھاؤ لیکن گُلگلہ (گُڑ سے ہی تیار کردہ میٹھے پکوڑے) سے پرہیز کرو''۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر گُڑ کا Physical structure تبدیل ہو جائے تو کیا اُس کی افادیت و مضر اثرات بھی تبدیل ہو جائیں گے۔ مثلاً وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ترقی پسند مصنّفین کے خیالات 'منطقی طرزِ ادا' کے باوجود یعنی باوصف بھی ہے اور منطق سے مبرّا بھی۔ اول تو آپ یہ تھیس ہی نہ دیں کہ ان کے خیالات 'منطقی طرزِ ادا' کے باوجود (بمعنی باوصف) متحرک ہیں اور اگر ہیں تو پھر اپنے ہی جملہ کی اینٹی تھیس یعنی 'منطق سے مبرا' کیسے ہو گئے؟ اس قسم کے ایسے کئی جملے و فقرے ہیں جو بین السطور، قاری کو 'مغالطے

وکنفیوژن میں مبتلا کرتے ہیں۔اپنی ہی کتاب میں ایک مقام پر مولوی عبد الحق کے اقتباس کا حوالہ دے کر ترقی پسند مصنّفین کے تصورات و خیالات پر کس طرح قدغن لگانے کی کوشش کی ہے حالانکہ چند مقامات پر وہ اپنے معروضات پیش کرنے میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں لیکن بعدازاں بین السطور ہی وہ اپنی ہی نگارشات ومفروضات کی نفی بھی کرتے ہیں۔ راقم نے گذشتہ سطور میں اُن کے 'منطقی طرزِ ادا' کے باوجود'منطق سے مبرّا' اصطلاح پر گفتگو بھی کی، لیکن خود اُن کی تحریروں میں متضاد جملے بھی پائے جاتے ہیں۔کہیں وہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریروں میں 'طرزِ ادا' کے وصف بھی تلاش کرتے ہیں تو کہیں یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں کہ ترقی پسند ادب میں طرزِ ادا بھی ناقص ہے، گوکہ ترقی پسند مصنّفین کے تصورات وخیالات طرزِ ادا سے عاری ہیں۔ پہلے کلیم الدین احمد کے اقوال ملاحظہ کریں کہ اُن کی باتوں میں کس قدر تضاد ہے اور کس

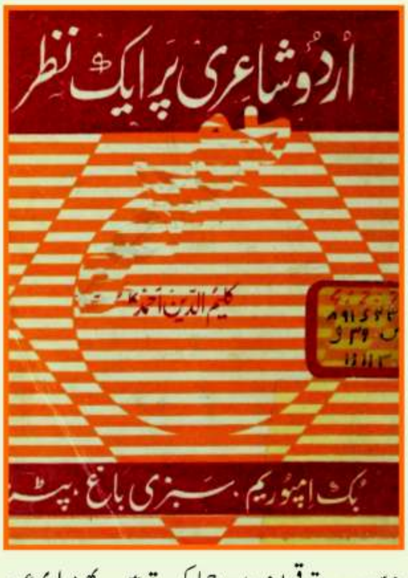

شدّ ومد سے ترقی پسندوں پر حملہ کرتے ہیں۔ پھر مولوی عبد الحق کے اقتباس سے کسبِ کمال حاصل کرتے ہیں۔اس دوران اقتباس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے قاری کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ خود کلیم الدین احمد نے بھی اپنی آرا پیش کرنے میں کس حد تک مولوی عبد الحق صاحب کے خیالات مستعار لیتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ پہلے کلیم الدین احمد کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ترقی پسند مصنّفین کو غور وفکر کی ضرورت نہیں۔ خیالات ماخوذ ہیں، وہ دماغ سے صحیح مصرف نہیں لیتے ہیں اور مستعار خیالات کی صحت وعدم صحت کے متعلق کبھی نہیں سوچتے ہیں، غور وفکر اُن کے بس کی بات نہیں اور غور وفکر کے بغیر کامیاب ادب ممکن نہیں۔اُن سے یہ بھی نہیں ہوتا، بنے بنائے خیالات کو اچھی طرح بیان کریں— 'ترقی پسند مصنّفین' خیالات کو اور یہ خیالات اپنے نہیں مانگے ہوئے ہیں بہت اہم سمجھتے ہیں اور الفاظ سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد، ص 57-156)

لیکن اِس سے پیشتر یہ بھی لکھتے ہیں:

'' تصورات میں جدّت نہ سہی کم از کم 'طرزِ ادا' میں حسنِ تکمیل اور انفرادی رنگ آمیزی تو ہو لیکن ترقی پسند ادب میں 'طرزِ ادا' بھی ناقص ہے'' (ایضاً)

اور پھر دیکھیں کلیم الدین احمد، مولوی عبد الحق صاحب کے اقتباس سے کس طرح کسبِ فیض کرتے ہیں، گوکہ ایسا گماں گذرتا ہے کہ کلیم صاحب 'خود را فضیحت دیگر را نصیحت'' کے مصداق ہیں :عبد الحق صاحب کا اقتباس ملاحظہ ہو:

'' مجھے معاف فرمایئے گا میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا ممکن ہے وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالاتر ہیں۔میں اسے تسلیم نہیں کرتا اور غالبًا کوئی بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا....زبان کیا ہے؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ ہے اگر کسی کاریگر کا اوزار بھدّا ہے تو اس کا کام بھی بھدّا ہوگا۔یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات سما نہیں سکتے۔کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیالات ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو بشرطیکہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو ...ظاہر ہے کہ ہر ادیب اپنی زبان کے صرف ونحو اور لغت سے واقف ہوتا ہے لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہے اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہئے، لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں لفظ ایک بڑی قوت ہے۔اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے جو اس گُر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا اُس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد، ص 57-156)

طوالت کے خوف کے باعث مستند حوالہ جات اور توضیحات کی روشنی میں اتنی باتیں محتاط کے ساتھ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ زیر بحث کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' اور اُس کتاب میں درج کلیم الدین احمد کے مختلف فقرے و جملے بالخصوص صنفِ غزل، ترقی پسند مصنّفین، نقاد، شہرۂ آفاق شاعروں وغیرہ کے فنِ شاعری بشمول خصائص و نقائص پر کلیم الدین احمد نے جو معروضات ومفروضات پیش کیے ہیں، وہ سب باتیں اپنے تمام تر اختلافات و اعتراضات کے باوجود متذکرہ کتاب کے قارئین کو از سرِ نو غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔البتہ موصوف نے چند نکات ایسے بھی پیش کیے ہیں مثلاً محمد حسین آزاد کو تذکرہ نگار تو تسلیم کرتے ہیں لیکن بحیثیت ناقد، اُن کو کوئی خاص مقام دینے سے گریز کرتے ہیں۔لیکن یہ بات بعید از فہم لگتی ہے کہ ایک تذکرہ نویس کی تحریروں کو وہ مقام نہیں دیتے جو اُس کا خاصہ ہے۔کیونکہ محمد حسین آزاد کی مبسوط کتاب 'آبِ حیات' کا یہ زبان زد جملہ '' انگریزی لالٹینوں سے روشنی آتی ہے'' اور اس قسم کی بیشتر سطور، جو اُس پُر آشوب دور میں کافی احتیاط کے ساتھ تذکرہ نویسی کے دوران رقم کی گئی ہیں، خود محمد حسین آزاد کی تنقیدی بصیرت کی غمّاز ہیں۔کلیم الدین احمد کے معروضات سے قدرے اختلاف و اتفاق کے ساتھ ساتھ حیرت تو تب ہوتی ہے جب وہ بابائے اردو تنقید الطاف حسین حالؔی کو بحیثیت ناقد و شاعر تسلیم تو کرتے ہیں لیکن اُن کی شہرۂ آفاق تنقیدی کتاب 'مقدمہ شعر وشاعری کو بہترین تنقیدی سرمایۂ کے زمرے میں رکھنے سے اختلاف کرتے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کتاب کے متعلق توصیفی جملے کو یہ کہہ کر مسترد کرتے ہیں کہ ''مقدمہ شعر وشاعری کو تنقیدی سرمایہ کہنا ایک 'حوصلہ شکن جملہ' ہے۔صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فلسفۂ مارکس اور مارکسزم کو تنقیدی ہدف کا نشانہ بناتے ہوئے 'دودھاری تلوار' سے موسوم کرتے ہیں اور وہ ملٹن اور انگلز سے بھی قدرے اختلاف کی گنجائش نکال لیتے ہیں۔غرض کہ کلیم الدین احمد کی تنقیدی بصیرت میں ہمیں استاد ذوق کے اس شعر؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

کا احساس موجزن نظر آنا ایک فطری بات ہے لیکن اُن کی تحریروں میں بین السطور یہ احساسات بھی کارفرما نظر آنے چاہیے کہ بقول شخصے؎

مذاق سب کا جدا ہے، سخن تو ایک ہے رِند
وہی سمجھتے ہیں جن کو شعور ہوتا ہے

تب جا کر ہم کسی تخلیقی فن پارے یا نگارشات کے محاسن و معائب کے ساتھ توازن، غیر جانب داری یا مفاہمت کا رویہ اختیار کرنے کے حامل ہو سکتے ہیں۔

■

Dr. Mohd Sohail Anwar
Ghalib Institute
New Delhi - 1100
Mob.:9350572257
Email: anwersohail79@gmail.com

سعید رحمانی

اسمٰعیل آذر

اسماعیل آذر طنز ومزاح کے معروف شاعر ہیں۔ان کی پیدائش جنوری 1943 کو کٹک میں ہوئی تھی۔ گریجویشن کے بعد دہلی میں آرکیوسٹ کی تربیت حاصل کی اور اڈیشا کے محکمۂ آثارِ قدیمہ سے وابستہ ہوگئے۔اس محکمہ میں دورانِ ملازمت انھوں نے اڈیشا میں عہدِ مغلیہ کی فارسی دستاویزات کا ترجمہ کرکے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ بلاشبہ لائقِ ستائش ہیں۔اپنی ملازمت کے اواخر میں اڈیشا اردو اکادمی کا عہدہ بھی سکریٹری کی حیثیت سے سنبھالا۔یہی وہ زمانہ تھا جب اکادمی کے دفتر میں اکثر وبیشتر ملاقاتیں رہیں۔کبھی اڑیا اردو ڈکشنری کی تدوین کے سلسلے میں تو کبھی مشاعروں اور سمیناروں کے مواقع پر۔ان ملاقاتوں میں ان کی ہمہ جہت شخصیت ابھر کر سامنے آئی اور انھیں قریب سے جاننے کا موقع ملا۔

وہ ایک خوش فکر شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک شائستہ، خلیق اور ملنسار انسان بھی تھے۔جب بھی ملیے چہرے پر ہلکا سا تبسم اور باتیں بے حد سنجیدہ اور سلجھی ہوئی۔ یہ گمان ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک مزاحیہ شاعر ہیں اور اپنی شاعری میں طنز ومزاح کا ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ لوگ سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجائیں۔اردو کے علاوہ اڑیا اور انگریزی زبانوں پر بھی ان کی اچھی گرفت تھی۔ڈکشنری کی تدوین کے دوران ان کا یہ جوہر کھل کر سامنے آیا۔تدوین کے کام میں ڈاکٹر کرامت علی کرامت)،حفیظ اللہ نیولپوری، مرحومہ ڈاکٹر نسیمہ بیگم اور مولوی مطیع اللہ نازش کے علاوہ راقم الحروف بھی شریکِ کار تھا۔تدوین کے دوران مقامی بول چال میں مستعمل ایسے بہت سارے اڑیا الفاظ سے سابقہ پڑا جن کے مترادفات کے انتخاب میں دشواریاں پیش آئیں۔ایسے کئی مواقع پر اسمٰعیل آذر نے موزوں مترادفات کے انتخاب میں رہبری کی اور اپنی لسانی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا۔

وہ ایک خوش فکر شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک شائستہ، خلیق اور ملنسار انسان بھی تھے۔جب بھی ملیے چہرے پر ہلکا سا تبسم اور باتیں بے حد سنجیدہ اور سلجھی ہوئی۔ یہ گمان ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک مزاحیہ شاعر ہیں اور اپنی شاعری میں طنز ومزاح کا ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ لوگ سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجائیں۔ اردو کے علاوہ اڑیا اور انگریزی زبانوں پر بھی ان کی اچھی گرفت تھی۔ڈکشنری کی تدوین کے دوران ان کا یہ جوہر کھل کر سامنے آیا۔

مجھے یاد پڑتا ہے اسی زمانے میں ان کے خلاف دو خطوط فرضی نام سے 'اخبارِ مشرق' میں شائع ہوئے۔انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ ایک آدمی ہر کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا ہے۔ظاہری بات ہے کہ بعض لوگوں کو سکریٹری کی حیثیت سے اسمٰعیل آذر کی کارکردگی سے اختلاف رہا ہوگا۔ایسے لوگوں کے لیے ضروری تھا کہ فرضی نام سے خط شائع کرانے کی بجائے اسمٰعیل آذر سے بنفسِ نفیس مل کر اپنی بات رکھتے تو ان کی شکایتوں کا ازالہ ہوسکتا تھا۔ایک مرنجاں مرنج آدمی کے لیے واقعتاً یہ خطوط خلافِ توقع تھے۔اس بات سے دکھ پہنچنا ایک فطری امر تھا۔وہ بجھے بجھے نظر آنے لگے۔یہ دیکھ کر میں نے ان دونوں خطوں کا جواب اسی اخبار میں شائع کروایا جس میں یہ مشورہ بھی تھا کہ جن حضرات کو شکایت ہے وہ سکریٹری سے براہِ راست مل کر تبادلۂ خیال کرسکتے ہیں۔مگر کوئی ملنے نہیں آیا اور بات وہیں ختم ہوگئی۔اس کے بعد آذر صاحب بھی نارمل نظر آنے لگے۔یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اپنے دور میں انھوں نے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے مثبت اقدامات کیے۔مشاعرے، کانفرنس اور تقسیم ایوارڈ کی تقریبات ان کے دور میں پابندی سے ہورہی تھیں۔اس

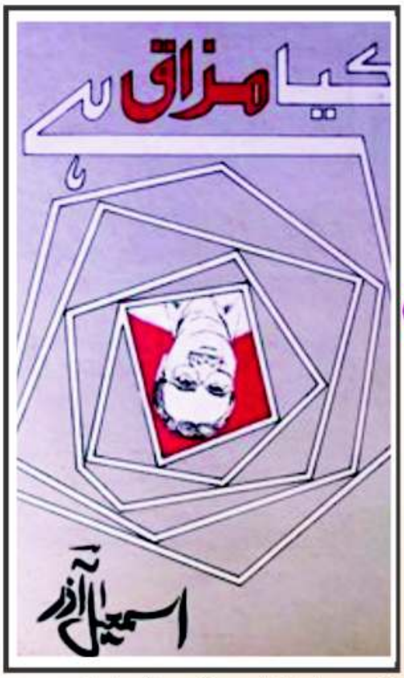

کے بعد یہ سلسلہ طویل عرصہ تک معرضِ التوا میں پڑا رہا۔ خوشی کی بات ہے کہ موجودہ سکریٹری جناب ڈاکٹر سید مشیر عالم نے ان کے دور میں اور تواتر سے سبھی پروگرام انجام پذیر ہو رہے ہیں۔ بہرِ حال اسمٰعیل آذر نے اپنے فرائضِ منصبی کو بحسن وخوبی انجام دیے اور ہر دو منصب پر اپنی خدمات سے لوگوں کو متاثر کیا۔

اسمٰعیل آذر کا شعری سفر 1972 سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدا انھوں نے سنجیدہ شاعری سے کی اور معروف شاعر حرمت الاکرام سے اصلاح لیتے رہے۔ لیکن فطرت میں شوخی اور ظرافت ہونے کے باعث سنجیدہ شاعری انھیں راس نہ آئی۔ وہ بہت جلد اپنے فطری میلان کی جانب رجوع ہو گئے اور مزاحیہ شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ جب وہ آر کیوسٹ کی تربیت کے لیے دہلی میں مقیم تھے، ان کے اس رجحان کو فکر تونسوی اور پدم شری مجتبیٰ حسین کی صحبت نے مہمیز کیا۔ پھر پٹنہ کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں طنز ومزاح کے معروف شاعر رضا نقوی واہی سے ملاقات ہوئی تو ان سے بے حد متاثر ہوئے اور انھیں سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ گہرا مطالعہ اور زبان پر گرفت ہونے کے سبب وہ جلد ہی اس میدان کے شہسوار بن گئے۔ بقول ڈاکٹر کرامت علی کرامت: ''ان کی شہرت کی خوشبو تنگنائے اڑیسہ سے نکل کر پوری اردو دنیا کی فضائے بسیط میں پھیل چکی ہے۔'' 1992 میں ان کا واحد مجموعۂ کلام 'کیا مذاق ہے' منظر عام پر آیا جس کی پذیرائی ادبی حلقوں میں بڑے والہانہ انداز سے کی گئی۔

اصنافِ سخن میں مزاح گوئی کو ایک مشکل صنف تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہنسی ہنسی میں دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ طنز کا نشتر اس طرح چلانا پڑتا ہے کہ اس کی چبھن تو محسوس ہو مگر تکلیف نہ ہونے پائے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ سمجھ لیں کہ مریض کو معلوم نہ ہونے پائے کہ اسے شکر میں لپٹی ہوئی نیم کی گولی کھلائی جا رہی ہے۔ ادب میں مزاح نگاری کی تعریف کرتے ہوئے شوکت سبزواری کہتے ہیں: ''طنز ایک طرح کی تنقید ہے، ایک قسم کا عملِ جراحی ہے اور مزاح عملِ جراحی کے لیے غش آور دوا کی حیثیت رکھتا ہے۔'' رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں: ''بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد اور تعصب سے پاک ہو اور ذہن وفکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔'' ان اقوال کی روشنی میں جب ہم اسمٰعیل آذر کی مزاحیہ شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو اس فن پر ان کی گرفت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھیں معاشرے کی ناہمواریوں کا پورا پورا ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں ان ناہمواریوں کی نشاندہی بڑے فنکارانہ انداز سے کی ہے۔ ان کے مجموعے میں ہزلوں کے علاوہ زیادہ تر مزاحیہ نظمیں ہیں جو ان کے کمالِ فن کا عمدہ ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں جہیز کی لعنت، شعر کی چوری، رہنماؤں کے جھوٹے وعدے، سرکاری بسوں کی حالتِ زار، درمیانی طبقہ کے گھروں میں واحد بیت الخلا سے پیدا ہونے والی الجھنیں وغیرہ۔ غرض کہ ایسے بے شمار روزمرہ کے واقعات ہیں جن میں مزاح کی آمیزش سے نہ صرف ہمیں ہنسانے کا موقع فراہم کیا ہے بلکہ ہمیں ان مسائل پر غور وفکر کی دعوت بھی دی ہے۔ ان کی ظرافت میں طنز کی جو زیریں لہریں ہوتی ہیں ہر صاحبِ دل کو ان کی کسک دیر تک تڑپاتی رہتی ہے۔ اسلوبِ بیان مزاحیہ ہونے کے باوجود سلاست وروانی کہیں بھی مجروح ہوتی نظر نہیں آتی۔ سادگی میں پرکاری بھی ہے، گہرائی وگیرائی بھی۔ کلام پڑھتے جایئے اس میں پرت پرت معنوی تہیں کھلتی جائیں گی۔

ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ اڑیسہ میں طنز ومزاح کے فن کو بڑھاوا ملے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے 'بزم ظرافت' کی طرح ڈالی اور جشنِ ظرافت کے نام سے کٹک میں دو تین بار آل انڈیا مشاعروں کا اہتمام کیا جن میں ملک کے مختلف حصوں سے نامور شخصیتوں نے شرکت کی۔ ان میں مجتبیٰ حسین، پاگل عادل آبادی، ضبغت اللہ بمباٹ اور نریندر لوتھر کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ اسمٰعیل آذر کی کوششوں سے کٹک کے جن شعرا کو مزاحیہ شاعری کی تحریک ملی ان میں عبدالصمد پریمی، ادریس بانکے اور اعظم علی جوکر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ کٹک میں انھوں نے جو آخری مشاعرہ پڑھا اس کا اہتمام یہاں کی معروف ادبی تنظیم 'فیضانِ ادب' نے آل انڈیا مزاحیہ مشاعرے کی صورت میں کیا تھا اور جس میں حیدرآباد کے غوث خوامخواہ، فرید انجم، رؤف رحیم اور وحید پاشا بطورِ خاص مدعو تھے۔

شعر وشاعری کے علاوہ اسمٰعیل آذر کو نثر نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اڑیا کے متعدد مزاحیہ افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کے علاوہ مجتبیٰ حسین کے مجموعۂ مضامین کا اڑیا ترجمہ کرنے میں اڑیا کے معروف مزاح نگار فتورہ نند کی رہنمائی بھی کی تھی۔ اس کے علاوہ دوردرشن کے لیے ایک سیریل بھی لکھا تھا جو 'کیا مصیبت ہے' کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہو کر بے حد مقبول ہوا تھا۔

مختصر یہ کہ اسمٰعیل آذر ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جو اپنے خلوص، محبت اور جذبۂ فرض شناسی کی بدولت برسوں ہمیں یاد آتے رہیں گے۔ انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین فرماتے ہیں: ''اسمٰعیل آذر ان چند گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے ہمیشہ ادب کی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کی... .ان کا سماجی شعور نہایت نکھرا ستھرا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کس پر ہنسنا چاہیے اور کہاں ہنسی سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی لیے ان کے کلام میں ایک ایسی شائستگی ہے جو پڑھنے والے کو سرور عطا کرنے کے علاوہ سوچنے پر بھی مائل کرتی ہے۔''

ان کی پہلی غزل 'شگوفہ' حیدرآباد کے اگست 1976 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا مطلع ہے ؎

بھیس میں شاعر کے قوال آ گئے
شعر کی محفل میں گائک چھا گئے

ان کا مزاج ہزل کہنے سے زیادہ نظم گوئی کی طرف تھا۔ ان کی جن نظموں کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی وہ نہ صرف اعلیٰ معیار کی ہیں بلکہ ان میں ظرافت کے خوش

شعر وشاعری کے علاوہ اسمٰعیل آذر کو نثر نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اڑیا کے متعدد مزاحیہ افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کے علاوہ مجتبیٰ حسین کے مجموعۂ مضامین کا اڑیا ترجمہ کرنے میں اڑیا کے معروف مزاح نگار فتورہ نند کی رہنمائی بھی کی تھی۔ اس کے علاوہ دوردرشن کے لیے ایک سیریل بھی لکھا تھا جو 'کیا مصیبت ہے' کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہو کر بے حد مقبول ہوا تھا۔

رنگ گل بوٹے عوام کی دلکشی کا باعث بنے ہیں۔ساتھ ہی ان نظموں میں طنز کی جو کاٹ ہے وہ قارئین کے دلوں کی تہوں تک اترتی چلی جاتی ہے۔ان نظموں میں سے کچھ کے عنوان اس طرح ہیں: کیا مذاق ہے'شیطان کو ورغلائے بشر' کابلی والا'اب وہ کھڑکی ادھر نہیں کھلتی۔کیا پئیں؟'شادی کی عمر'دانتوں کی خصوصیات'ذکر اس پری وش کا'مہاجن کی پگڑی''قصۂ حضرت خضر'آپ کے منہ پر'آذر نہیں ہوں میں'الکتب فی سبیل اللہ'لالو بھائی کی حجامت'تضاد'دورانِ امتحان'برٹش پالیسی'بلی حج کو چلی'تعزیت نامہ'آہ میرے جوتے'آیا بچوں کا سال'الیکشن کا احترام کرو'دے خدا کی راہ میں'ہکلی نظم'کیا پوتا بولواماں'جھوٹ سچ'خیریت'حوصلہ مند اقدام'گلے پڑی مصیبت'میں کیا کھائی مائی'شاعر کے گھر ایک شاعر کی نقب زنی'عجیب حالت'طوفانی سیوا'شاعر بننا کوئی کمال نہیں'نیا سال مبارک ہو'سیاسی جلسہ میں مشاعرے کا انعقاد وغیرہ۔اس کے علاوہ دکنی غزلیں اور قصے کہانیوں پر مبنی منظومات میں بھی انھوں نے مزاح کا رنگ بڑی کامیابی سے گھولا ہے۔اگر ان سبھی نظموں کے چیدہ چیدہ اشعار کا حوالہ دوں تو یہ مضمون کافی طویل ہوجائے گا۔اس لیے صرف چند نظموں کے ایسے منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں جن میں طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ شاعر کی عصری حسیت اور مطہرہ جذبات بھی ہیں تو معاشرے کی ناہمواریوں پر نشتر زنی بھی کی گئی ہے:

ایک نظم کا عنوان ہے' جھینگا مشتی'۔اس میں جھینگا اور مچھلی کے درمیان مکالمات بڑے لطیف پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں۔نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

ایک جھینگے نے اکڑ کر ایک مچھلی سے کہا
دیکھ کیسا صاف اور شفاف ہے یہ تن مرا
کچھ چمک تجھ میں تو ہے پر یہ نفاست ہے کہاں
پیٹ میں تیرے غلاظت ہی غلاظت الاماں

اس پر مچھلی کا جواب سنیں۔

اس پہ مچھلی کھلکھلانے لگ گئی ڈنکے کی چوٹ
دیکھ کر جھینگے کی صورت ہورہی تھی لوٹ پوٹ
اے موئے گھامڑ یہ تیرا زعم کس چکر میں ہے
گندگی تیری تو اے نادان تیرے سر میں ہے
تلملا کر رہ گیا جھینگا بڑا کاری تھا گھاؤ
آج بھی جب شرم آتی ہے تو بن جاتا ہے واؤ

نظم' کابلی والا' کا ایک بند پیش کرنے سے پہلے یہ بتادوں کہ آج کی نئی نسل کسی کابلی والے سے متعارف نہیں ہے۔اس لیے آج کے نوجوانوں کو اس کے بارے میں زیادہ

> **اردو ادب میں طنز وظرافت کو کافی اهمیت حاصل هے،مگر یه فن ایسا هے که هر کوئی اسے حاصل نهیں کرسکتا۔اگر کوئی کوشش کرے بهی تو خود هی طنز کا نشانه بن جاتا هے۔بعض کی شاعری تو ابتذال کی حدوں کو چهونے لگتی هے۔بهر حال اس میدان کے شهسواروں میں کمی بهی نهیں هے۔ماضی میں میر وغالب نے بهی طنز وظرافت سے کام لیا هے۔علامه اقبال کے یهاں بهی ظرافت کا رنگ پایا جاتا هے۔ جدید دور میں جن شعرا نے اس فن کے دامن کو وسیع کیا ان میں ضمیر جعفری'مجید لاهوری' محمد عاشق' مخمور جالندهری وغیره پیش پیش نظر آتے هیں۔آزادی کے بعد کے شعرا میں شاد عارفی'فرقت کاکوروی' رضا نقوی واهی نے اس فن میں بڑا نام کمایا۔**

جانکاری نہیں۔دراصل کابل سے کچھ لوگ ہندوستان آکر خشک میوے بیچتے تھے اور ساتھ ہی سود کا کاروبار بھی چلاتے تھے۔ان کے خیال میں چونکہ ہندوستان اسلامی ملک نہیں ہے اس لیے یہاں سود لینا جائز ہے۔سود میں رقم قرض لینے والے اکثر لوگ ادائیگی میں ٹال مٹول بھی کیا کرتے تھے۔اس نظم میں اسی خیال کو آذر صاحب نے اس طرح پیش کیا ہے۔

ایک موٹا والا' مچھی والا مردِ سیاہ فام
نام اس کا پھکٹ سنگھ جھاڑ جھنک رام
ٹھگتا ہے رُپی لے کر نچا پنج برس سے
اس قرض کی جھنجھٹ سے چھٹی دینے کو بولا
الّو کا پٹّا کب تلک آئے گا نہ گھر میں
ہم خان کی اولاد ہے بیٹھے گا ادھر میں

نظم' الیکشن آگیا یارو' میں سیاسی لوگوں اور نیتاؤں کے ہتھ کنڈوں کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ایک نیتا کے مشوروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

الیکشن آگیا یارو تم اپنا کام کرو
جلوس وجلسہ وبھاشن کا انتظام کرو
پھر ایک بار'غریبی ہٹاؤ' کا نعرہ
لگا کے کام غریبوں کا تم تمام کرو

ملو ہر ایک سے جھک جھک احمقوں کی طرح
پریم پیار کا کچھ روز ''فیضِ عام'' کرو
کھڑے ہیں راہ میں محتاج ہاتھ پھیلائے
ہر ایک کو وعدۂ رنگیں سے شادکام کرو
مصیبتیں تو اٹھانی ہیں بس الیکشن تک
پھر اس کے بعد کمانے کا انتظام کرو

آخر میں اس ہزل کے چند اشعار پیش ہیں جس کی ردیف ہے: 'کیا مذاق ہے' اور جس کو انھوں نے اپنے مجموعے کا سرنامہ بنایا ہے۔صرف چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

شیطاں کو ورغلائے بشر کیا مذاق ہے
لاحول بھی پڑھے ہے اُدھر کیا مذاق ہے
بیٹا مجھی پہ دھونس جمانے لگا ہے تو
میں تیرا باپ ہوں کہ پسر کیا مذاق ہے
کچھوئے کی چال چلتی ہے گھنٹے میں آدھ میل
سرکاری بس میں کرنا سفر کیا مذاق ہے
آذر اسی ہے زعمِ آزری
چھوڑا ہے ی کمر کیا مذاق ہے

اردو ادب میں طنز وظرافت کو کافی اہمیت حاصل ہے،مگر یہ فن ایسا ہے کہ ہر کوئی اسے حاصل نہیں کرسکتا۔اگر کوئی کوشش کرے بھی تو خود ہی طنز کا نشانہ بن جاتا ہے۔بعض کی شاعری تو ابتذال کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔بہر حال اس میدان کے شہسواروں میں کمی بھی نہیں ہے۔ماضی میں میر وغالب نے بھی طنز وظرافت سے کام لیا ہے۔علامہ اقبال کے یہاں بھی ظرافت کا رنگ پایا جاتا ہے۔جدید دور میں جن شعرا نے اس فن کے دامن کو وسیع کیا ان میں ضمیر جعفری'مجید لاہوری'محمد عاشق'مخمور جالندھری وغیرہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔آزادی کے بعد کے شعرا میں شاد عارفی'فرقت کاکوروی'رضا نقوی واہی نے اس فن میں بڑا نام کمایا۔

بہر حال یہ فن آج کے دورِ پرآشوب کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔آج کا دکھی انسان اسے پڑھ کر کچھ دیر کے لیے اپنی تکلیفیں بھول جاتا ہے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔اسمٰعیل آذر گرچہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ 26 جون 2003 کو آسمان ظرافت کا یہ تابندہ ستارہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔لیکن ان کی شگفتہ تحریریں ہمارے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلاتی رہیں گی۔

■

Sayeed Rahmani
Editor 'Adabi Mahaz'
Deewan Bazar
Cuttack- 753001 (Odisha)

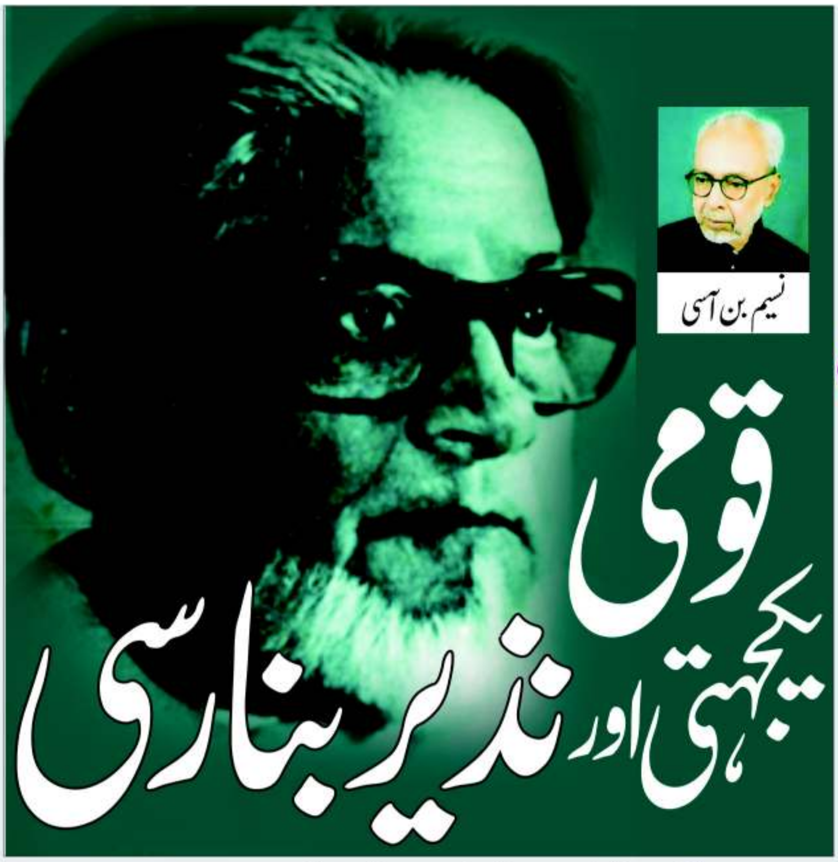

قومی یکجہتی اور نذیر بنارسی

نسیم بن آسی

بنارس بہت قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ اس کی جڑیں رواداری، تصوف، صلحِ کل، حکمت و فلسفہ کی زمین میں گہرائی تک پیوست ہیں۔ اس تہذیب کو آگے بڑھانے میں غنی بنارسی، فائز بنارسی، محشر بنارسی، منشی بیتاب بنارسی اور مسلم حریری نے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی۔ اسی سرزمین میں فارسی کے معروف شاعر شیخ علی حزیں آسودۂ خاک ہیں۔ وہ ایران سے آکر یہاں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ ان کے نام سے بنارس جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

نذیر بنارسی 25 نومبر 1909 - 23 مارچ 1996 نے مدن پورہ کے پانڈے حویلی میں آنکھیں کھولیں— اُن کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں وہ مدرسہ میں داخل ہوئے۔ انھیں شعروشاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ ان کے بڑے بھائی حکیم محمد یٰسین مسیح پختہ کار اور قادرالکلام شاعر تھے۔ نذیر بنارسی نے منشی بیتاب بنارسی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہ اپنی خاندانی وجاہت، انسان دوستی اور قومی خدمات کے باعث بنارس کی محبوب شخصیت تھے۔

نذیر بنارسی کا مکان پانڈے حویلی میں سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس کے اندر پارچون کی ایک دکان بھی ہے۔ اس میں گاہکوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دکان نذیر صاحب کے بڑے بیٹے محمد ظہیر دیکھتے ہیں۔ کبھی نذیر صاحب بھی دکان میں بیٹھتے تھے اور گاہکوں کو سامان وغیرہ دیتے تھے۔ دکان سے ملحق ایک برآمدہ ہے جس کے دروازے باہر سڑک کی طرف کھلتے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں کبھی کبھی نذیر صاحب برآمدہ میں کرسی لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔

حب الوطنی اور قومی یکجہتی سے متعلق ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'گنگ و جمن' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا تھا۔ اس پر فراق گورکھپوری کا فکرانگیز اور وقیع پیش لفظ بھی ہے۔ فراق جتنے بڑے شاعر تھے، اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔

ان دنوں مشاعروں میں نذیر بنارسی کے نام کا بڑا شہرہ تھا۔ میرے والد آسی رام نگری کی سرپرستی میں مغل سرائے نگر پالکا انٹرکالج کے میدان میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں نذیر صاحب بھی مدعو تھے۔

مولانا ابومحمد امام الدین حافظ رام نگری کی صدارت میں مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ نظامت کی ذمے داری رشید بی اے کو سپرد کی گئی۔ وہ مدن پورہ میں رہتے تھے۔ لوگ انھیں رشید بی اے کے نام سے پکارتے تھے۔ بی اے ان کے نام کے ساتھ لازم وملزوم ہوگیا تھا۔

سب سے پہلے راشد بنارسی کو اپنا کلام سنانے کے لیے بلایا گیا۔ انھوں نے اپنی مترنم آواز میں غزل کا مطلع پڑھا

ہے رات بھینی بھینی تاروں کا مسکرانا
اے کاش! کوئی کہہ دے ان سے میرا فسانہ

سامعین غزل کا مطالعہ سنتے ہی وجد میں آئے۔ داد کا سلسلہ غزل ختم ہونے تک چلتا رہا۔ حفیظ بنارسی نے 'صبحِ بنارس' نظم سنائی

بنارس کی صبح حسیں دیکھتا ہوں

انھوں نے صبح بنارس کی جو منظرکشی کی، اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ترنم سے پڑھ رہے تھے اور سامعین انھیں داد سے نواز رہے تھے۔

شوکت مجید حافظ قرآن کمیونسٹ شاعر تھے۔ انھوں نے تحت میں غزل پڑھی۔ ان کی غزل میں بھی، ترقی پسند خیالات کی ترجمانی تھی۔ ان کے پڑھنے کے انداز میں سادگی اور خلوص تھا۔ انھوں نے سامعین کو کافی متاثر کیا۔

اس کے بعد جوہر صدیقی کو دعوتِ سخن دی گئی۔ نوجوان اور نومشق شاعر ان کے شاگرد تھے۔ مسلم حریری ان کے استاد تھے۔ انھوں نے تحت میں پڑھا۔ ان کے پڑھنے کے انداز میں بے حد خوداعتمادی تھی۔ انھوں نے دو تین رباعیاں اور ایک غزل سنائی۔ سامعین نے ان کے کلام کو بہت پسند کیا۔

انور مرزاپوری اپنے ترنم اور غنائی لب ولہجہ کے لیے جانے جاتے تھے۔ ناظمِ مشاعرہ نے انھیں زحمت سخن دی۔ گورا رنگ، سر پر سفید بال کی گول ٹوپی لگائے۔ وہ ترنم ریز ہوئے۔ انھوں نے سامعین کی فرمائش پر کئی غزلیں سنائیں۔ انھوں نے اپنی آواز کے سوز وگداز سے سامعین کا دل جیت لیا۔

سامعین کی تفریح طبع کے لیے سروش مچھلی شہری کو بلایا گیا۔ انھوں نے اپنا مزاحیہ کلام ایکٹنگ کے انداز میں پڑھ کر سنایا اور لوگوں کو لوٹ پوٹ کردیا۔ ان کے بعد کئی اور شاعروں نے اپنے کلام سے نوازا اور داد وتحسین حاصل کی۔

آخر میں نذیر بنارسی کو دعوتِ سخن دی گئی۔ پستہ قد، قدرے فربہ بدن، پتلی مہری کا سفید پاجامہ اور کالی شیروانی، پیشانی پر ساون کی گھٹا کی طرح جھکے کالے بال— نذیر صاحب اپنی مترنم آواز میں غزل سرا ہوئے۔ سامعین گوش برآواز ہوگئے

محبت اے نذیر اس دہر سے ناپید ہوجاتی
محبت کی وہ قسمت تھی کہ پیدا ہوگئے ہم تم

آواز میں شیرینی کے ساتھ گھن گرج تھی۔ ایک سماں بندھ گیا۔ نذیر صاحب غزل پڑھ رہے تھے اور سامعین داد و تحسین کی بارش کررہے تھے۔ بھور میں مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

'گنگ و جمن' کے بعد ان کا دوسرا غزلوں کا ضخیم مجموعہ 'کتابِ غزل' شائع ہوا۔ ان سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میرا ان سے ملنے کا شوق فزوں تر ہوتا جارہا تھا۔ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ان کے صاحبزادے ظہیر گاہکوں کو سامان وغیرہ دینے میں مصروف تھے۔ میں موقع دیکھ کر ان کے پاس گیا۔

میں نذیر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

آپ کہاں سے آئے ہیں؟

میں نے انھیں اپنے بارے میں بتایا— ظہیر نے میرے آنے کی اطلاع اوپر کی منزل پر بھجوا دی۔ نوکر واپس آ کر بولا بھیج دیجیے۔

نوکر مجھے لے کر زینہ چڑھنے لگا۔ جہاں زینہ ختم ہوا، نذیر صاحب ایک گدے دار چوبی تخت پر تکیہ کا ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ تخت پر دھلی ہوئی سفید چادر بچھی تھی۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ پھر وہ مجھے لے کر پاس کے ایک کمرہ میں چلے گئے۔ کمرہ دیکھنے میں ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ اس کے تین طرف صوفے لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے صوفہ پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا اور خود سامنے کے صوفہ پر بیٹھ گئے۔ شیشے کی ایک الماری میں بند کتابیں باہر جھانک رہی تھیں جیسے باہر آنے کے لیے بیتاب ہوں۔

نذیر صاحب نے الماری کھول کر ’کتاب غزل‘ کی ایک جلد نکالی اور مجھے مرحمت فرمائی۔ کچھ دیر میں چائے آ گئی— میں چائے پینے کے ساتھ ’کتابِ غزل‘ کی ورق گردانی بھی کر رہا تھا۔

نذیر صاحب! آپ کے ہاں اضافت کی شاعری نہیں ملتی ہے؟

سمپورنانند نے منع کر دیا تھا۔

آپ نے ان کی بات کیوں مانی؟

وہ فارسی کے عالم تھے اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ آنندان کا تخلص تھا۔

نذیر صاحب! ’گنگ وجمن‘ پر فراق صاحب کا پیش لفظ بہت خوب ہے۔

ہاں! لیکن ان کے ساتھ ایک واقعہ ہو گیا—

کیا—؟

بنارس کے ایک مشاعرہ میں فراق آئے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول ان کا میرے ہاں قیام ہوا۔ بادہ نوشی کا دور چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد فراق شراب کے نشے میں آ گئے اور انھوں نے حضرت محمدؐ صاحب کی شان میں گستاخی کر دی۔ میرے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ میں نے گلاس گھما کر فراق کے منہ پر دے مارا۔ وہ بال بال بچ گئے۔

اُس دن سے میں نے بادہ نوشی ترک کر دی۔

کچھ دیر کے لیے میرے اوپر سکتہ طاری ہو گیا اور میں انھیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

نذیر صاحب! آپ نے اپنی شاعری میں گنگا جل کی پاکیزگی، بنارس کے بت خانوں اور شنکر جی کی عظمت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ آپ نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

کاشی کے مسلماں ہیں نذیر آپ سے ملیے
بت خانے میں ہیں آپ بھی اور آپ کا گھر بھی

اس ضمن میں آپ کے یہ اشعار بھی قابل ذکر ہیں۔

شنکر کی جٹاؤں کی طرح سایہ فگن ہے
ہر سایۂ دیوار بنارس کی گلی میں
گر سورگ میں جانا ہے تو جی کھول کر خرچو
مکتی کا ہے بیوپار بنارس کی گلی میں
ہم نے تو نمازیں بھی پڑھی ہیں اکثر
گنگا تیرے پانی سے وضو کر کر کے

کیا اس سے آپ کے ایمان پر حرف نہیں آتا ہے؟

میں نے قومی یکجہتی کے تحت یہ سب لکھا ہے۔ میں موحد ہوں۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہوں۔ میں نے حج بھی کرلیا ہے لیکن میری شاعری میں صرف گنگا جل اور بنارس کے بت خانوں ہی کا ذکر نہیں ہے۔ اس میں بنارس کی مٹی کی سوندھی خوشبو بھی شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہیں نہیں یہ دیے نہیں ہیں جو بہتے پانی میں جل رہے ہیں
گگن سے تارے اتر اتر کر لہر لہر پر ٹہل رہے ہیں
گنگا کا ہے لڑکپن، گنگا کی ہے جوانی
اترا رہی ہیں لہریں، شرما رہا ہے پانی
بادل برس رہا ہے، بجلی چمک رہی ہے
کھلواڑ کر رہے ہیں، آپس میں آگ پانی

بہت خوب! بہت خوب!

آپ کی شاعری کا خاص وصف حسنِ تغزل اور اس کا والہانہ پن ہے۔

نذیر صاحب! میں آپ سے آخری سوال کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے آپ مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے تھے لیکن اب آپ صرف تحت میں پڑھتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

نذیر صاحب مسکرانے لگے—

ترنم سے پڑھنے والے بہت ہو گئے ہیں۔ مشاعروں میں شاعرات بھی آنے لگی ہیں۔ سامعین ان کے ترنم کو سنتے ہیں اور انھیں دیکھتے بھی ہیں لیکن ستم ظریفی دیکھیے۔ ایکٹر شاعر گلاباز شاعروں اور شاعرات سے زیادہ داد پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

میں ہنسنے لگا۔

چائے ختم ہو گئی تھی۔ ذکر چائے کا کپ اور بسکٹ کا پلیٹ لے کر چلا گیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، شام کا سرمئی اندھیرا دھیرے دھیرے اپنا تعارف کرا رہا

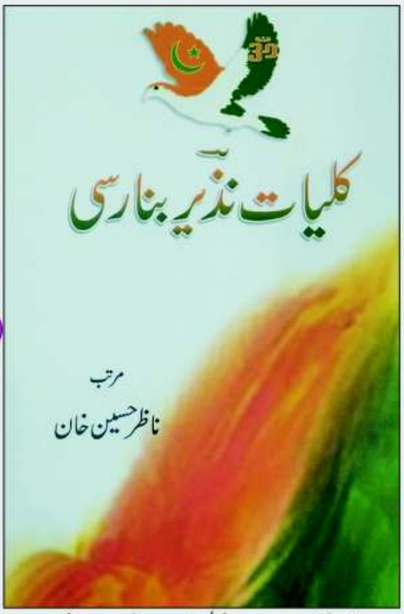

تھا۔ سڑک کی دکانوں میں بجلی کے بلب ٹمٹمانے لگے تھے۔

نذیر صاحب! اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

آپ میرے ساتھ کھانا کھا کر جائیے گا۔

نہیں، بہت دیر ہو جائے گی۔

نہیں نہیں۔ آپ کھانا کھا کر جائیں گے۔

میں ان کے اصرار پر رک گیا۔

تبھی ان کی بہو قمیص شلوار میں ملبوس آ گئی۔

ابو! آج آپ کیا کھائیں گے؟

کباب، بالائی اور اس کے ساتھ کوئی حلوہ بھی۔

ان کی بہو اندر چلی گئی۔ نذیر صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔

میری بہو ہر دن میرے کھانے کے بارے میں پوچھتی ہے۔ میں جو پسند کرتا ہوں، وہ حاضر ہو جاتا ہے۔

آپ بہت خوش قسمت ہیں۔

مجھے اس دن معلوم ہوا نذیر صاحب خوش اخلاق، خوش لباس اور خوش لحن ہی نہیں، خوش خوراک بھی ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے نذیر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور مصافحہ کر کے جانے لگا۔

پھر آئیے گا؟

ضرور آئیں گے۔

میں زینہ سے دھیرے دھیرے نیچے اتر آیا۔

نذیر بنارسی اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کا یہ شعر آج بھی زندہ ہے۔

کوئی نذیر آواز تو دیتا
جاگنے والے سوگئے سب کیا

■

Naseem Bin Asi
C/o Koh-e-Noor General Store
Parmar Katra
Mughal Sarai - 232101 (UP)
Mob.:7348075771

محمد طارق

ترجمہ میں مداخلت اور ثقافت

ترجمہ ذولسانی تعامل ہے۔اصل اور ہدفی دونوں زبانوں کا اپنا مخصوص پس منظر ہوتا ہے۔ ہر زبان کسی نہ کسی مخصوص خطے کے ساتھ موسوم ہوتی ہے۔اس خطے میں بسنے والے افراد کو اس زبان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہر خطہ اور علاقہ اور اس میں بسنے والے عوام یا قوم گونا گوں اوصاف، کیفیات، حالات کے باعث دوسری قوم سے ممتاز و متنوع ہوتی ہیں۔یہ امتیازی شناخت جغرافیائی محل وقوع، تاریخی کوائف، سماجی صورت حال، طرز معاشرت، تہذیب وتمدن اور ثقافت سے قائم ہوتی ہے۔کسی بھی قوم کے علمی، فکری اور تہذیبی ارتقاء کو معلوم کرنے کا ایک اہم وسیلہ وہاں کی رائج زبان ہوتی ہے کیونکہ اصلاً زبان ہی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

ہر دو زبانیں آپس میں مختلف ومتنوع ہوتی ہیں۔ زبانوں میں اختلاف کا بنیادی عنصر تہذیب وثقافت میں پیوست ہوتا ہے۔جن زبانوں میں ثقافتی بُعد زیادہ ہوگا ان میں لسانی تعامل زیادہ مشکل ہوگا اور جو زبانیں ثقافتی اعتبار سے جس قدر قریب ہوں گی ان میں ترجمہ کا عمل قدرے آسان ہوگا۔ ثقافتی اجنبیت کی وجہ سے مترجم کو دوران ترجمہ کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسی مشکل کو حل کرتے ہوئے ترجمہ شدہ متن میں کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوجاتی ہیں۔

ایک زبان کے متن کی دوسری زبان میں منتقلی کے دوران راہ پا جانے والے تغیر وتبدل اور انحرافات جسے علم ترجمہ میں مداخلت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ناگزیر ہیں۔کوئی بھی ترجمہ مداخلت سے مبرا نہیں ہوسکتا ہے۔ قارئین کا وقوفی ماحول یعنی ان کے فہم و ادارک کی سطح، مروج ڈسکورس اور تسہیل متن وغیرہ کئی ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے قصداً یا بلا قصد، شعوری یا غیر شعوری طور پر ترجمے کے دوران مداخلت ہوجاتی ہے یا کرنی پڑتی ہے۔ ان اسباب میں ایک اہم سبب ثقافت ہے۔ترجمے میں مداخلت کی سب سے بڑی وجہ ثقافتی اختلاف ہی ہوتا ہے۔

ترجمہ میں جو کچھ مداخلتیں ہوتی ہیں ان میں ثقافت کا کیا رول ہے اس کو جاننے سے پہلے ہمارے لیے ثقافت کو سمجھنا بایں معنی نہایت ضروری ہے، کہ اس کے بعد ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زبان میں اس کا اثر ونفوذ کس حد تک ہے؟ زبان اور اس کی ساخت میں ثقافتی عناصر کس قوت کے ساتھ پیوست ہیں۔کیوں کہ ترجمہ میں سارا کھیل زبان ہی کا تو ہے۔

ثقافت ایک ایسا لفظ یا ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا سامنا ہر شخص کو ہوتا رہتا ہے، اور تقریبا ہر کسی کے ذہن میں اس کا کچھ خاکہ ہوتا ہے لیکن اگر کسی سے ثقافت کی تعریف کرنے کی بابت سوال کیا جائے تو بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو کما حقہ واضح کرسکیں۔ہیلن اسپنسر اوٹے لکھتے ہیں:

ثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی تعریف انتہائی مشکل ہے۔ 1952 میں امریکی ماہر بشریات کروبر اور کلے کون نے ثقافت کی تعریفات اور تصورات کا تنقیدی جائزہ لیا اور 164 مختلف تعریفات کی ایک فہرست تیار کی۔ Apte (1994-2001) نے السنہ ولسانیات کی دس جلدوں میں شائع ہونے والی انسائیکلو پیڈیا لکھنے کے دوران مسئلے کا اختصار اس طرح کیا ہے: ثقافت کی مناسب تعریف کے لیے ایک صدی تک ہونے والی کوشش کے باوجود 1990ء کی ابتدا تک ماہرین بشریات کے درمیان اس کی نوعیت کے متعلق کوئی اتفاق نہیں ہوسکا تھا۔ 1

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ثقافت کی بالکل متعین تعریف کرنا کتنا مشکل ہے۔ ثقافت کا تصور تو بہت قدیم ہے لیکن ثقافت کا تصور تغیر پذیر ہے۔ وقفے وقفے سے اس کے عناصر یا مشمولات میں کمی، زیادتی یا تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ثقافت اردو زبان کا لفظ ہے جس کا انگریزی متبادل Culture ہے۔عربی میں اس کے لیے الثقافۃ کی اصطلاح رائج ہے۔آئندہ لفظی و اصطلاحی دونوں بنیادوں پر اس کی توضیح کی کوشش کی جائے گی:

ثقافت کی لفظی تعریف:

Oxford Adcanced Learner's Dictionary میں "Culture" کے معنی ہیں۔

رسوم اور عقائد، فن، زندگی گزارنے کا طریقہ اور کسی خاص ملک یا گروپ کی سماجی تنظیم۔

کسی چیز کے متعلق ایسے عقائد اور رویے جو لوگ مخصوص گروپ یا تنظیم میں شیئر کرتے ہیں۔

فیروز اللغات کے مطابق ثقافت کے معنی ہیں:

عقلمند ہونا، نیک ہونا، تہذیب

انگریزی اردو لغت میں Culture کا معنی مذکور ہے:

تہذیب، تمدن، ثقافت، ذہنی تربیت

عربی لغت معجم المعانی میں معنی ہے:

العلوم و المعارف والفنون التی یطلب الحذق فیھا

ایسے علوم و معارف اور فنون جس میں مہارت کی ضرورت ہو۔

ثقافت کی اصطلاحی تعریف:

ثقافت کی بہت ساری تعریفیں کی گئیں ہیں جن کا نہ تو احاطہ ممکن ہے۔ برائے حاصل مقصود چند تعریفات ذکر کی جاتی ہیں جس سے ثقافت کے مفہوم کا ادراک سہل ہوسکتا ہے۔

برطانوی ماہر بشریات ٹیلر کا کہنا ہے کہ:

ثقافت یا تہذیب اپنے وسیع اخلاقی مفہوم کے اعتبار سے اس پورے مجموعے کا نام ہے جس میں علم، عقیدہ، فن، اخلاق، قانون، رسم ورواج، اور سوسائٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے فرد کی حاصل کردہ صلاحیتیں اور عادات واطوار سب شامل ہیں۔ 2

ہافٹیڈ کے مطابق:

ثقافت ذہن کی اجتماعی پروگرامنگ ہے جو ایک

گروپ یا طبقہ کے افراد کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔[3]

ثقافت کے متعلق میٹ سوموکا کہنا ہے کہ:

(ثقافت) رویوں، اقدار، عقائد، اور سلوک کا ایک سیٹ ہے جو ایک گروپ کے لوگوں کے درمیان مشترک ہوتا ہے، لیکن ہر فرد کے درمیان کچھ فرق ہوتا ہے، ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔[4]

اب اسی کے ساتھ ہم یہ غور کریں گے کہ عربی میں ثقافت کی اصطلاح میں کیا معانی پوشیدہ ہیں:

ثقافت ذہن میں زندہ خزانہ ہے۔ یہ علوم، معارف، افکار، عقائد، فنون، ادب، اخلاق، قوانین، رسم و رواج، ذہنی وحسی ادراکات، لسانی و تاریخی ورثے، اور وہ ماحول جس میں انسان کا فکری سانچہ تیار ہوتا ہے، کے نتائج پر مشتمل ہوتا ہے، اور اس کو وہ سابقہ صفات و معاشرتی اقدار عطا ہوتی ہیں جس سے زندگی میں اس کا عملی رویہ وجود میں آتا ہے۔[5]

ان تمام تعریفات کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ثقافت وہ امتیازی وصف ہے جو کسی خاص گروپ، قوم یا نسل میں موروثی طور پر پایا جاتا ہے۔ نیز یہ انفرادی امتیاز بدلتے وقت کے ساتھ تغیر پذیر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے اقدار و معیارات بھی تبدیل ہوجاتے ہیں؛ لیکن یہ ان افراد کا مجموعی خاصہ ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔

زبان اور ثقافت کا رشتہ:

زبان کے متعلق یہ مغالطہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ محض اپنے خیالات و احساسات اور اپنی ضروریات کے بیان کا ذریعہ ہے۔ اصل احساس سے یا خیالات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف خیال کی ترسیل ہے۔ گویا زبان ایک ایسا ظرف ہے جو اپنے مظروف سے جدا ہے۔ اس سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر کسی خطے یا علاقے میں مروج زبان کے بجائے کوئی دوسری زبان بولی جانے لگے تو وہاں کے علاقائی و ثقافتی اقدار و ہیئت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی ٹھیک اسی طرح جیسے پانی کو جس گلاس میں چاہیں منتقل کردیں پانی اور گلاس دونوں کی نوعیت و فطرت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ لیکن زبان کے تعلق سے یہ خیال بایں معنی درست نہیں ہے کہ ثقافت ہر انسان کے تحت الشعور میں پیوست ہوتی ہے۔ انسان کے پاس اسے ظاہر کرنے کا زبان کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ ہی نہیں ہے۔ زبان سے الگ ہٹ کر ہماری قوت اظہار گونگی ہے۔ لہٰذا زبان اور ثقافت کو پانی اور گلاس کے بجائے، گوشت اور ناخن سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہے۔ زبان ثقافت کے بغیر بے رنگ اور ثقافت زبان کے بغیر بے نمو۔ ماہر لسانیات چامسکی نے کہا تھا کہ:

''زبان دراصل تہذیب سے مختص ہے''[6]

یہ بات عام طور پر قبول کی جاتی ہے کہ زبان ثقافت کا ہی ایک حصہ ہے، اور یہ کہ ثقافت میں زبان کا بہت ہی اہم کردار ہوتا ہے۔ چند ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ زبان کے بغیر ثقافت کا وجود ہی ناممکن ہے۔ زبان بیک وقت ثقافت کی عکاسی کرتی ہے، اس کو متاثر کرتی ہے اور زبان کے سہارے ہی ثقافت کی تشکیل ہوتی ہے۔ وسیع مفہوم میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگوں کا علامتی اظہار ہے؛ کیوں کہ اس کے اندر تاریخی و ثقافتی پس منظر ہوتا ہے نیز یہ کہ وہ کس انداز میں زندگی گزارتے ہیں، زندگی کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے، ان کا طرز فکر کیا ہے۔ براؤن نے ثقافت اور زبان کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زبان ثقافت کا جز ہے اور ثقافت زبان کا، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور اگر جبراً الگ کیا گیا تو دونوں میں کسی ایک کا امتیاز ختم ہو جائے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ناقابل تقسیم ہیں۔

زبان ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے کیونکہ زبان کے وسیلے سے ثقافت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ زبان و ثقافت مشترکہ طور پر ایک زندہ جسم کے مانند ہیں، جس میں زبان کی حیثیت گوشت کی ہے اور ثقافت خون کا درجہ رکھتی ہے۔ ثقافت کے بغیر زبان مردہ ہوجائے گی اور زبان کے بغیر ثقافت کا وجود ہی نہیں ہوگا۔ ندا کا یہ نظریہ ہے کہ:

زبان و ثقافت دو علامتی نظام ہیں۔ جب ہم کوئی لفظ بولتے ہیں تو وہ اپنے اندر کچھ معنی رکھتا ہے، خواہ وہ معنی تعیینی ہو یا معاشرتی، دلالتی ہو یا مضمراتی۔ کوئی زبان ہم بولتے ہیں تو اس کا معنیاتی نظام ہوتا ہے اور ہر ایک کا معنی یکساں مفہوم نہیں رکھتا کیونکہ اس کا رشتہ ثقافت سے جڑا ہوا ہے اور ثقافت زبان کے مقابلے میں زیادہ بسیط ہے۔[7]

یہ بات معلوم ہے کہ دو زبانوں کے یکساں معنی رکھنے والے لفظ بھی یکساں مفہوم نہیں رکھتے یا دونوں زبان بولنے والے اس سے یکساں مفہوم نہیں اخذ کرتے یا یکساں مفہوم میں نہیں استعمال کرتے۔ چناں چہ جب ایک انگریز Lunch بولتا ہے تو اس سے پزا یا برگر مراد ہوتا ہے لیکن جب ایک ہندوستانی Lunch بولتا ہے تو اس سے روٹی یا چاول جیسی غذا مراد ہوتی ہے۔ انگریزی لفظ Dog اور اس کا اردو متبادل 'کتا' دونوں علامیوں کا خارجی مظہر ایک ہی جانور ہے۔ بہت سے انگریزوں کے نزدیک کتا بہترین دوست ہوتا ہے، یہ عام طور پر ان کا پالتو جانور ہے۔ ان کے محاورے میں یہ لفظ انتہائی مثبت اور پیارے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً Lucy dog، top dog، وغیرہ۔ جب کہ ہندوستانی ثقافت میں کتا رکھوالی کرنے والا اور بھونکنے والا جانور مانا جاتا ہے۔ اس جانور کو نہ صحیح (گو کہ مغربی ثقافت کے زیر اثر اس کی بھی حیثیت بدل رہی ہے) اس لفظ کو انتہائی مکروہ بلکہ مترادف گالی کے تصور کیا جاتا ہے۔

اسے غصے اور نفرت کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

زبانوں کے اندر الفاظ کی تشکیل و آمد بھی ثقافتی پس منظر میں ہوتی ہے۔ جیسے عربی میں گھوڑے، اونٹ اور شراب کے لیے سیکڑوں سے زیادہ اسما ہیں جس کو وہ بہ آسانی سمجھتے ہیں اور ان الفاظ کے معنوی فرق سے آگاہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہماری زبان میں ان کے لیے بمشکل ہی چند الفاظ مل سکتے ہیں، کیوں کہ ہماری ثقافت میں ان کا وہ مقام یا حیثیت تھی یا ہے ہی نہیں جو عرب ثقافت میں تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان ملک اور کسی بھی طبقے کی ثقافت کی عظیم شناخت کا اہم جز ہے۔

زبانوں کے اندر الفاظ کی تشکیل و آمد بھی ثقافتی پس منظر میں ھوتی ھے۔جیسے عربی میں گھوڑے، اونٹ اور شراب کے لیے سیکڑوں سے زیادہ اسما ھیں جس کو وہ بہ آسانی سمجھتے ھیں اور ان الفاظ کے معنوی فرق سے آگاہ ھیں۔ اس کے مقابلے میں ھماری زبان میں ان کے لیے بمشکل ھی چند الفاظ مل سکتے ھیں، کیوں کہ ھماری ثقافت میں ان کا وہ مقام یا حیثیت تھی یا ھے ھی نہیں جو عرب ثقافت میں تھی۔یہ کہا جاسکتا ھے کہ زبان ملک اور کسی بھی طبقے کی ثقافت کی عظیم شناخت کا اھم جز ھے۔

اب دو چیزیں واضح ہو گئیں، ثقافت کا- لغوی و اصطلاحی- مفہوم، اور ثقافت و زبان کے درمیان تعلق۔ یہ بات معلوم ہے کہ ترجمہ ایک لسانی تعامل ہے جس میں ایک زبان دوسری زبان کے پیکر میں ڈھلتی ہے۔ یہ پیکر ثقافت کے تانے بانے سے بنا ہوا ہے۔ جو کہ اس کے وجود کو لازم ہے۔ مترجم اسی رسا کشی کا عمل انجام دیتا ہے،

اڈھیڑ بن کرتا ہے۔لہٰذااس کی ہیئت ونوعیت میں تبدیلی تو لازمی ہے۔آئندہ اسی عمل کا جائزہ لیاجائے گا۔

ثقافت اور مداخلت

یہ مسلمہ حقیقت ہر ماہر زبان پر عیاں ہے کہ زبان اور ثقافت کا ایک لازم و ملزوم گہرا،اٹوٹ رشتہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ومربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ایک دوسرے کے وجودکونابودکرنے کے مترادف ہے۔زبانوں کے مطالعے سے یہ بات کھل کرسامنے آتی ہے کہ ہر زبان کا اپنا جو خاص امتیازی وصف یاشناخت ہوتی ہے وہ اس کی ثقافت سے جنم لیتی ہے۔اگر زبانوں کا ثقافتی پس منظر ختم کر دیا جائے تو ان کی نیرنگی معدوم ہوجائے گی، ان کا متفرق مذاق وٹیسٹ پھیکا ہوکر رہ جائے گا۔ چناں چہ اگر غور کیا جائے تو ہر زبان اسی خاص شناخت کی وجہ سے دوسری زبانوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ دوسری خصوصیات بھی زبانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں جوان کو علیحدہ شناخت عطا کرتی ہیں۔

ہرقوم اور ہر علاقے کی اپنی مخصوص ثقافت ہوتی ہے، وہ اس قوم یا علاقہ کی شناخت ہوتی ہے، ان کوانھیں ممتاز ثقافتی اوصاف کی بنا پر دوسری قوموں یا دوسرے علاقوں میں بسنے والے افراد سے الگ کیا جاتا ہے۔یہ خصوصیات ان افراد یاافرادقوم کے لیےانتہائی عزیز ہوتی ہیں۔وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں اورخودکوان کاوارث و امین گردانتے ہیں اوراس پرفخر کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ہندوستان میں مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگ بستے ہیں ان کے عقائد ان کے طور طریقے، رسومات، رہن سہن،سلوک ورویے الگ الگ ہیں۔ یہ تمام لوگ الگ الگ اکائی ہیں اوران کے اپنے عقائد،رسومات ہیں،طور طریقے ہیں جوان کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔مثلا ہندوستان کے جنوبی علاقے میں رہنے والے لوگوں کے عادات واطور، رجحانات ومیلانات،ترجیحات الگ ہیں جب کہ شمال میں بسنے والوں کی الگ۔ پھر یہ الگ الگ اکائیاں متحدہ اکائی بناتی ہیں اور ہندوستانی ثقافت جنم لیتی ہے۔اسی طرح اکائی در اکائی اور اکائیوں میں اتحاد و افتراق کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ تہذیبی وثقافتی اتحادو افتراق بھی سفر میں رہتے ہیں۔ ان کے درمیان قربت و بعد میں کمی و زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ جیسا کہ میٹ سومونے کہا تھا کہ (ثقافت) رویوں،اقدار، عقائد، اورسلوک کاایک سیٹ ہے جو ایک گروپ کے لوگوں کے درمیان مشترک ہوتا ہے، لیکن ہر فرد کے درمیان کچھ فرق ہوتا ہے

جس طرح جب دو ثقافت کے لوگوں کی ملاقات ہوتی ہے یا ان کے درمیان معاملات ہوتے ہیں توان کو سمجھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں کیونکہ ان کے درمیان ثقافتی افتراق حائل ہوتا ہے۔اسی طرح جب دو ثقافتوں کی امین دوزبانوں کا آپسی تعامل ہوتا ہے تو ان کے درمیان مسائل ومشکلات کا پیدا ہونا ایک لازمی بات ہے کیونکہ اس بات کا پہلے ہی ذکر ہوچکا ہے کہ زبان کا ثقافت سے بہت ہی گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ثقافتی افتراق یا بعدلسانی لین دین کے میدان کا ایک انتہائی مشکل مرحلہ ہے۔جس کا سامنا مترجم کو ہروقت کرنا پڑتا ہے۔

مترجم کو ہروقت اس دوطرفہ جنگ سے نبردآزما ہونا پڑتا ہے کیونکہ کوئی بھی زبان خواہ وہ علاقائی یا زمانی اعتبار سے کتنی ہی قریب نہ ہو اس میں ثقافتی فرق ہونا لازمی ہے۔مثال کے طور پر ہندوستان کی دوزبانوں، ہندی اور اردوکو ہی دیکھ لیجیے دونوں میں قدریں اس حدتک مشترک ہیں کہ ایک عام آدمی بھی بغیر مترجم کے بلاتکلف بآسانی بات کرسکتا ہے،اپنی بات پہونچا سکتا اور سامنے والے کی بات کما حقہ سمجھ سکتا ہے۔منوررانا نے کہا ہے:

سگی بہنوں کا جو رشتہ ہے ہندی اور اردو میں
کہیں دنیا کی دو زندہ زبانوں میں نہیں ملتا

اس قربت کے باوجودآپ ہندی کا ایک پیرا گراف خصوصا ادبی ٹکڑا لیجیے اور اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کیجیے، دیکھیے کہ کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس وقت آپ کو اندازہ ہوگا کہ اتنی قریب کی دو زبانوں میں ثقافتی بُعد کا یہ حال ہے تو ایسی زبانوں میں جو آپس میں بہت بعد رکھتی ہیں ان کا کیا حال ہوگا۔اوران کے ترجمے میں کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ثقافت سے دوری اوراس سے ناآشنائی مزاح پیدا کردیتی ہے۔ساراالطف ضائع کردیتی ہے۔مثال کے طور پر ابھی قریب میں ایک فلم ریلیز ہوئی 'ڈیڑھ عشقیاں' جس میں مادھوری دیکشت نے 'بیگم ماہ پارہ' کا رول کیا ہے۔ جو ایک نواب مرحوم کی بیوہ ہیں۔فلم کی کہانی اور تقاضے اپنے جگہ لیکن ناقدین ادب کی نگاہ میں یہ ایک کمزور رول ہے، اور اس کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہوا۔اس کردار میں نوابی نزاکت و لطافت معدودم ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فلم کی ہیروئن جاگیردارانہ ثقافت سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔ جب ثقافت کو اسی زبان میں اور فلم کے پردے پر منتقل کرنے میں اس باریکی کی ضرورت ہے تو ادب کے اندر جہاں صرف تحریری منظر نگاری ہوتی ہے اور قارئین کے ذہن سے آنکھ کا کام لینا ہوتا ہے، وہاں کتنی مشکل ہوگی۔اس ثقافت کی اثر انگیزی، اس کی لطافت، اس کی خوبی کومنتقل کرنا کتنا مشکل کام ہوگا۔

آپ غور کریں اگر فلم مغل اعظم کوانگریزی میں تیار کیا جائے یا اس فلم کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو انگریزی ناظرین کے لیے فلم کوقابل قبول بنانے کے لیے مترجم کوکس قدر محنت کرنی ہوگی۔فلم کے مکالموں میں کتنی تبدیلی کرنی ہوگی۔مترجم کو وہ فضا قائم کرنی ہوگی جس سے انگریزی ناظرین اس سے لطف اندوز ہوسکیں۔فلم کی ابتدا میں الگ سے ایک مختصر ڈاکیومنٹری بنانی پڑے گی جو فلم کے پس منظر کے طور پر فضا سازی کا کام کرسکے۔

امراو جان ادا اردو کا شاہکار ناول ہے۔اردو ادب میں خاص امتیاز کا حامل ہے۔اس میں اس وقت کے لکھنو ی مزاج کی پوری پوری عکاسی کی گئی۔اس پورے ماحول کوپیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جواس وقت لکھنؤ کا عام ماحول تھا۔ مشاعرے کی محفلیں ہوتی ہیں، مجرے ہوتے ہیں، نواب امرا، شرفا ان میں شریک ہوتے ہیں دادو تحسین سے نوازتے ہیں،طوائفوں پر اپنی جان چھڑکتے ہیں،طوائفوں کے مہذب وشائستہ نازونخرے ہیں، ان کی دلکش ادائیں، زبان وبیان کا جادو ہے، رسم و راہ کی داستانیں ہیں، تیتر و بٹیر بازی ہے، اجڑتے لکھنؤ کی پرکیف شامیں ہیں۔کیا جس ثقافت میں یہ چیزیں ناپید ہوں وہاں کے قارئین وناظرین کے لیے ان واقعات و کیفیات سے لطف اندوز ہونا، ان سے ثقافتی مذاق ومزاج سے حظ اٹھانا اور درس عبرت لینا ممکن ہے؟ممکن تو کیا ہوگا

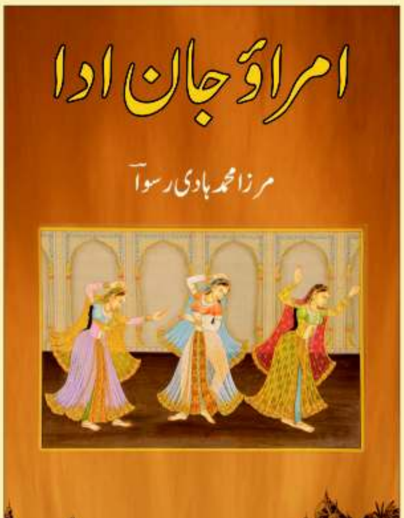

ان کے لیے تو لا ینحل معمہ ہوگا۔

اردو میں ہندو مذہب کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے، صرف سرمایہ ہی نہیں اردو کے ہندو مذہب سے قریب ہونے کی وجہ سے اس کے اساطیر، رسم ورواج، ہندو تشبیہات وتلمیحات بھی اردو کا حصہ ہیں اور بڑی آسانی سے سمجھی جاتی ہیں۔لیکن انھیں علاقوں میں جہاں ہندو اثر ہے۔ جو علاقے ہندو ثقافت سے قدرے دور ہیں ان میں ان تشبیہات وتلمیحات کی تفہیمی سطح کم ہوتی چلی جائے گی گو کہ وہاں کے لوگ اردو سے واقف ہوں۔ خود وہ اردو داں جو ایک دو نسلوں سے مغربی ممالک میں قیام پذیر ہیں ان کے زبان و بیان اور خاص برصغیر میں رہنے والے اردو داں حضرات کے زبان و بیان کا موازنہ کر کے دیکھ لیں تو اس کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ اگر ان میں کچھ فرق ہے تو وہ صرف اور صرف ثقافت کا۔

نیز یہ کہ کسی زبان کے الفاظ اس کے ثقافتی خمیر سے تیار ہوتے ہیں۔ اہل زبان کے مزاج، آب وہوا، سماجی و معاشی پس منظر، سیاسی صورت حال اور مذہبی وابستگی ہر ایک کا اثر ہوتا ہے۔ جیسے ہندی زبان کا لفظ ہے کلش، ظاہر ہے کہ یہ لفظ سراسر ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب کا عکاس ہے۔ اس لفظ کے ساتھ جو تہذیبی وابستگی ہے یا جو مذہبی عقیدت پوشیدہ ہے اسے ایک انگریزی زبان بولنے والا کس طرح سمجھے گا۔

ادب کا کوئی حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جس سے اہل زبان تو خوب محظوظ ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے وہ چیز ثقافتی بعد یا اجنبیت کی وجہ سے بے معنی ہوتی ہے۔ مثلاً امرء القیس کے معلقہ کا ایک شعر ہے:

ترى الآرام فى عرصاتها
و كيعانها كانه حب فلفل

اس کے صحن اور آنگن میں اونٹ کی مینگنیاں ایسے نظر آتی ہیں گویا کہ کالی مرچ کے دانے ہوں۔

مذکورہ بالا شعر میں بیان کردہ مضمون غیر عرب کے لیے توجہ کا باعث نہیں بن سکتا لیکن اہل عرب اور عربی زبان وادب سے شغف رکھنے والے افراد اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔

دنیا کی ہر زبان میں اس کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں جس میں اہل زبان کے لیے خاص آہنگ اور سرور، غنائیت اور نغمگی ہوتی ہے لیکن دوسری زبان بولنے والے افراد کے لیے وہ حظ موجود نہیں ہوتا ہے۔ جیسے یہ مصرع 'چلمن ہو یا نقاب سرکتی ضرور ہے'۔ اس میں استعمال شدہ الفاظ مخصوص ثقافتی پس منظر کے حامل ہیں جسے دوسروں کے لیے سمجھنا قدرے مشکل و دشوار ہے۔ اسی طرح میر تقی میر کا شعر ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر سے مترشح ہونے والے مفہوم کی بنیاد پر سودا نے اسے میر کی والدہ کا شعر قرار دے دیا تھا۔ جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ میر کے چند مشہور زمانہ اشعار میں شامل ہے۔ شعر کے ترجمے سے کیا مقصد حاصل ہوگا نیز یہ کہ دوسری زبان میں میر کی یہ آہ کس حد تک سلامت رہے گی؟ کیا جو کیفیت ولطافت اردو ثقافت کے پروردہ کو اس سے حاصل ہوتی ہے وہ ایک انگریز کو حاصل ہوسکتی ہے۔

مذکورہ گفتگو سے یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ ثقافت کا تعلق صرف ادب سے ہی ہے اور ادبی ترجمہ میں ہی ثقافت کی بنیاد پر مداخلت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ واضح ہونا چاہیے کہ ثقافت کی وسعت علوم، افکار، عقائد سب پر محیط ہے۔ اور یہی صورت حال علمی، فلسفیانہ اور مذہبی تراجم میں بھی پیش آئے گی گو کہ کم۔

مثال کے طور پر قانونی ترجمہ کو ہی لیں، کسی بھی قوم یا ملک میں جو قوانین وضع کیے جاتے ہیں وہ وہاں کے حالات و کیفیات کے مدنظر ہی وضع کیے جاتے ہیں، ان حالات کی تشکیل ثقافت کے زیر اثر ہی ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے قانون کا ترجمہ بالکل اسی رنگ میں کردیا جائے تو دوسری زبان کے لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہوگا۔ چناں چہ یا تو انھیں اس ثقافت سے روشناس ہونا پڑے گا یا ترجمہ میں وہ انداز اختیار کیا جائے گا جس سے ہدفی قارئین کا وقوفی ماحول ہم آہنگ ہو۔

یہی حال سائنسی تراجم کا بھی ہے۔ جب ہم کسی غیر محتاط انداز میں کیے ہوئے ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری طبیعت میں اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ انداز ہمارے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ سائنسی وعلمی تراجم کا بڑا مسئلہ اصطلاحات یا اصطلاحی الفاظ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں دوسری زبان کے الفاظ مستعار لینے پڑتے ہیں کیوں کہ ہماری ثقافت اس درجہ تک نہیں پہنچی ہوتی ہے جو اس مدنیت تک پہنچا سکے۔

یہی فرق ترجمہ میں کھل کر سامنے آتا ہے اور جب مترجم ترجمہ کرتا ہے تو اسے اس خلیج کو پاٹنا پڑتا ہے۔ وہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ جس طرح اصل زبان کے قارئین اس تحریر سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ادبی چاشنی ولذت محسوس کرتے ہیں وہی لذت وہی چاشنی ہدفی زبان کے قارئین بھی محسوس کریں، اصل زبان کے اس فن پارے کی قدر و قیمت اصل زبان کے قارئین کی

دنیا کی ہر زبان میں اس کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں جس میں اہل زبان کے لیے خاص آہنگ اور سرور، غنائیت اور نغمگی ہوتی ہے لیکن دوسری زبان بولنے والے افراد کے لیے وہ حظ موجود نہیں ہوتا ہے۔ جیسے یہ مصرع 'چلمن ہو یا نقاب سرکتی ضرورہے'۔اس میں استعمال شدہ الفاظ مخصوص ثقافتی پس منظر کے حامل ہیں جسے دوسروں کے لیے سمجھنا قدرے مشکل و دشوار ہے۔

طرح ہدفی زبان کے قارئین کی نظر میں بھی قائم رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسے متن میں مختلف عمل انجام دینے پڑتے ہیں۔ وہ ہدفی زبان میں اصل کی مشابہتیں تلاش کرتا ہے۔ ثقافتی ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس خلیج کو ختم کرنے یا کم کرنے کے لیے ثقافتی یکسانیت کا ایک پل تعمیر کرتا ہے۔ اس بات کی از حد کوشش کرتا ہے کہ ہدفی قارئین کو اصل کے قریب سے قریب لے جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا اپنا مذاق بھی برقرار رکھے۔ گویا ایک کشتی تیار کرتا ہے جس میں ہدفی زبان کے قارئین کو سوار کر کے اصل زبان کے دریا کی سیر کراتا ہے۔ درحقیقت یہ پوری کوشش ہی ترجمہ میں ثقافتی پس منظر میں ہونے والی مداخلت سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

1. Helen Spencer-Oatey Compiled by A Compilation of Quotations What is Culture? *(http://go.warwick.ac.uk/globalpadintercultural)*
2. Edward Burnett Tylor (1920), Primitive culture: researches into the development of mythology, philosophy, religion, language, art and custom. Pg. 1
3. Hannah Slavik (2004), Intercultural communication and Diplomacy, Diplofoundation Malta and Geneva. Pg. 26
4. H. Spencer-Oatey and Peter Franklin (2009). Intercultural Interaction: A Multidisciplinary Approach to Intercultural, Communication. Pg. 14
5. http://www.startimes.com/f.aspx?t=30872875
6. خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص 123
7. The relationship between culture and language wenying Jiang. ELT Journal Vol-54/4. October 2000. Oxford University Press.

Mohd Tarique
H.No. 9-4-97/15,
Al Noor Residency, 3rd Floor,
Hakeem Shah Colony, Mini Brindavan Colony,
Tolichwoki, Hyderabad, 500008 (Telangana)

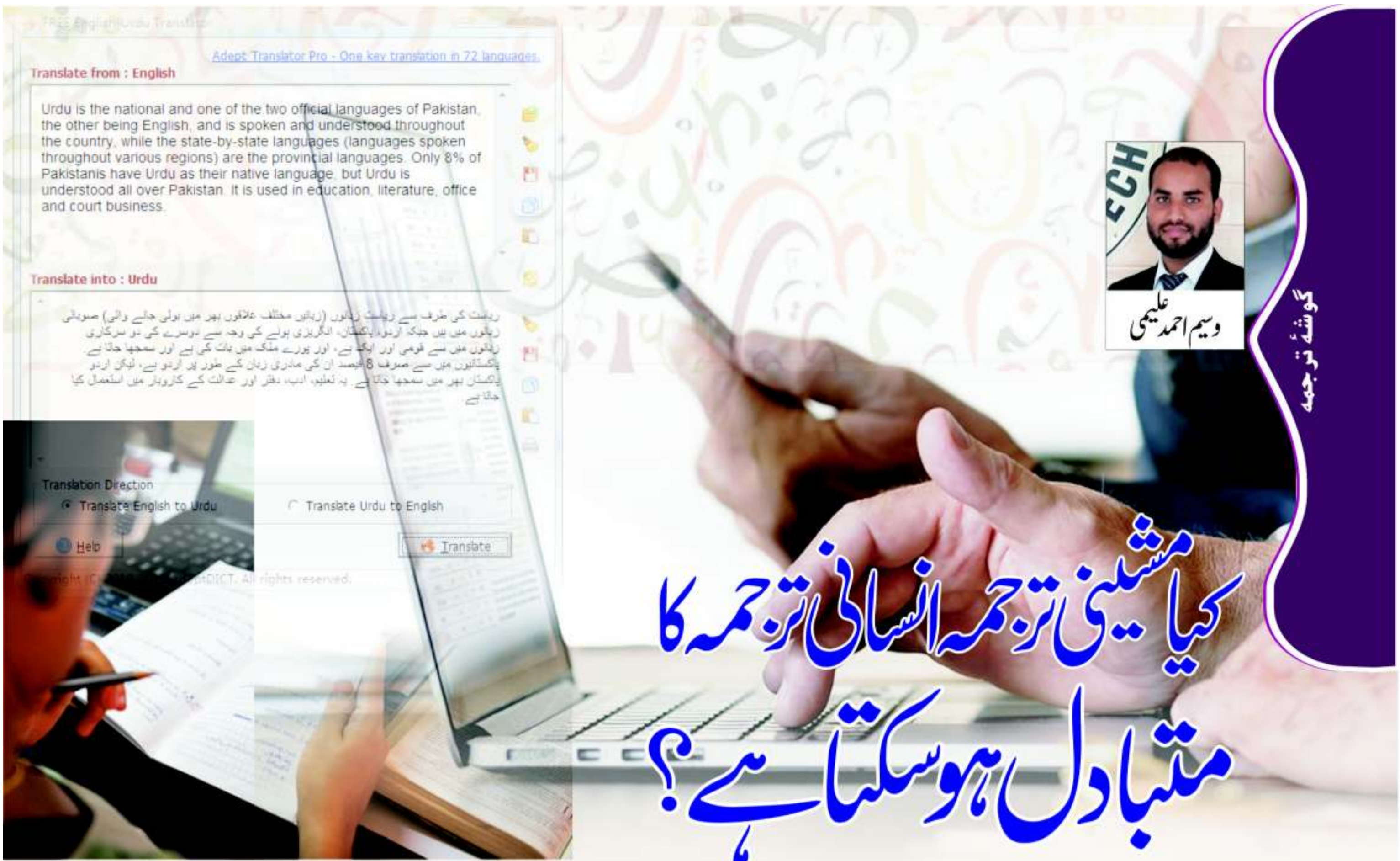

وسیم احمد علیمی

کیا مشینی ترجمہ انسانی ترجمہ کا متبادل ہو سکتا ہے؟

اکیسویں صدی کی ایجادات نے انسانی زندگی کو ہر محاذ پر متاثر کیا ہے۔ خصوصاً مصنوعی شعور (Artificial intelligence) رفتہ رفتہ انسانی دماغ کے قائم مقام بننے کی طرف گامزن ہے۔ کمپیوٹر انسان کی طرح باشعور ہو سکتا ہے یا ہو چکا ہے یہ الگ بحث ہے لیکن کمپیوٹر کی Chips میں برقی سگنلوں کے ذریعے بہم پہنچائی گئی معلومات کا ذخیرہ انسانی شعور کی نقالی کرنے میں کچھ حد تک کامیاب دکھائی دینے لگا ہے۔

ترجمہ لسانیات کی وہ شاخ ہے جو نہ صرف ادبی تناظر میں اہمیت کا حامل ہے بلکہ ترجمہ کی ہی بدولت دنیا کی مختلف تہذیبوں کا تعارف ایک دوسرے سے ممکن ہو سکا۔ یہاں تک کہ موہن جودڑو کی کھدائی میں دریافت ہونے والی ہڑپا زبان کے تحریری آثار سے ہم اس لیے اب تک ناواقف ہیں کیوں کہ ہم اس زبان کا ترجمہ کرنے سے قاصر ہیں۔

دنیا کی بڑی اور ثروت مند زبانوں میں تحریر شدہ ادب عالیہ سے دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کا متاثر ہونا بھی ترجمہ کی ہی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں صحافت اور ادب سے لے کر میڈیکل، قانون، ممالک کے باہمی رشتے، فلم، صنعت و حرفت، چیزوں کی درآمد و برآمد (Import-Export) غرض کہ ملکی اور عالمی سطح کے تقریباً تمام ضروری معاملات میں ترجمہ اور مترجمین کی ضرورت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

اب سوال یہ کھڑا ہوتا ہے کہ کیا مشینی ترجمے کو اس حد تک قابل (Advance) بنا دیا گیا ہے کہ وہ ان تمام یا ان میں سے بعض شعبوں میں انسانی ذہن کی جگہ لے سکے؟ مشینی ترجمہ سے اوپر اٹھ کر صرف کمپیوٹر کی پروان چڑھتی صلاحیتوں کی بات کریں تو 'آج کی سائنس' کے مصنف اظہار اثر کمپیوٹر اور انسانی شعور کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بحث صرف خیالی نہیں، نہ ہی یہ بحث برائے بحث ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے سائنسداں یہ ماننے لگے ہیں کہ مستقبل میں ایسے کمپیوٹر بنائے جا سکتے ہیں جن میں انسانوں کی طرح شعور کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟ کمپیوٹر میں غور و خوض کرنے کی قوت اور شعور پیدا ہو گیا تو کیا ہوگا؟ کیا نئی قسم کا یہ باشعور کمپیوٹر 'مشینی حیات' کا درجہ لے لے گا؟

(آج کی سائنس، اظہار اثر، ص 80، ناشر اردو اکادمی دہلی 2006)

کمپیوٹر یا مصنوعی شعور میں غور و خوض کی قوت پیدا ہونے کے ان امکانات کے باوجود کیا اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ مشینی ترجمہ انسانی ترجمہ کا متبادل ہو سکے گا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قبل آیئے نظر ڈالتے ہیں مشینی ترجمے کی مختصر تاریخ، طریقۂ کار اور (Softwares) سافٹ ویئرس کے عملی نتائج پر۔

مشینی ترجمہ سے مراد ایسا عمل جس میں سافٹ ویئر کی مدد سے ایک زبان کے متن یا آواز کو دوسری زبان کے متن یا آواز میں منتقل کیا جائے۔ سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا جب پہلی بار 7 جنوری 1954 میں نیویارک شہر کے اندر IBM701 نام کے ایک کمپیوٹر نے ازخود ساٹھ روسی جملوں کو انگریزی میں منتقل کیا۔ اس واقعہ کو جارج ٹاؤن ایکسپریمینٹ (Georgetown Experiment) کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد 1966 کے آس پاس مشینی ترجمہ کو غیر درست، ناقابل اعتماد اور مہنگا قرار دے کر مشینی ترجمہ کے بجائے لغت سازی پر مزید توجہ دینے کا رجحان پیدا ہوا جس سے مشینی ترجمہ پر تجربات تقریباً ایک دہائی تک کے لیے موقوف ہو گئے۔

(A history of machine translation from the Cold War to deep learning by IIya Pestov)

لیکن انسان کی طبیعت فطری طور پر متجسس واقع ہوئی ہے۔ تجسس اور نئی چیزیں دریافت کرنے کے اسی شوق نے دھیرے دھیرے کمپیوٹر اور مصنوعی شعور کے مائل بہ ارتقا سفر کو مشینی ترجمہ کی ایجاد سے ہمکنار کر ہی دیا۔ یہ اور بات ہے کہ مشینیں کس حد تک کامیاب ترجمہ کر سکتی ہیں اس پر بحث کی بے پناہ گنجائش باقی ہے۔

آج درجنوں ایسے آن لائن سافٹ ویئرز موجود

ہیں جو دنیا کی مختلف زبانوں کا ترجمہ کرسکتے ہیں۔جن میں گوگل ٹرانسلیٹ (Google Translate)، سسٹران ٹرانسلیٹ (Systran Translate)، بیبل فش (Babelfish)، انٹرٹران (Inter Tran)، ورلڈلنگو (Word Lingo)، اپرٹیم (Apertium)، انوساراکا (Anusaaraka)، نیوٹرانس (Niu Trans)، بنگ ٹرانسلیٹر (Bing Translator)، یانڈیکس ٹرانسلیٹ (Yandex Translate)، بیبلون (Babylon) اور مائزوسافٹ ٹرانسلیٹ (Microsoft Translate) قابل ذکر ہیں۔

گوگل ٹرانسلیٹ کی مدد سے سو سے بھی زیادہ زبانوں کا مشینی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔یہ اس صورت میں ہے جب زبان تحریر شدہ ہو۔ورنہ گوگل ٹرانسلیٹ ان میں سے 37 زبانوں کے عکس، 32 زبانوں کی آواز اور 27 زبانوں کے ویڈیو کا ترجمہ بھی کرنے کے قابل ہے۔

واضح رہے کہ انسانی ذہن کو ترجمہ کرنے میں متن کی نوعیت اور ضخامت کے مطابق وقت درکار ہوتا ہے جب کہ مشینی ترجمہ کے عمل میں متن خواہ مشکل ہو یا آسان، کم ہو یا زیادہ، ترجمہ درست ہو یا غیر درست چند سکینڈ میں نتیجہ سامنے نکل آتا ہے۔اس کے باوجود مشینی ترجمہ انسانی ترجمہ کا متبادل نہیں بن سکتا۔اس کے متعدد اسباب ہیں۔مشینی ترجمہ سے لفظ یا مرکبات یا چھوٹے چھوٹے سادہ اور آسان جملوں کو تو باآسانی منتقل کیا جا سکتا ہے لیکن پیچیدہ اور طویل جملوں کو منتقل کرنے میں مشینی ترجمہ نحوی اور صرفی غلطیوں سے منزہ نہیں رہ سکتا۔

انسانی ترجمہ عموماً تین مراحل سے گزر کر تکمیل کی منزل میں قدم رکھتا ہے: (1) ترجمہ (2) حذف و اضافہ (3) نظر ثانی۔اس کے برعکس مشینی ترجمہ کو ان تین مراحل سے نہیں گزارا جا سکتا جس کی وجہ سے مشینی ترجمہ کو بھی مکمل ترجمہ کا درجہ حاصل کرنے کے لیے انسانی ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔مشینی ترجمہ سے محاورات، کہاوتوں، تخلیقی عناصر، جذبات واحساسات، مترادفات، زبان کی تہذیبی باریکیوں اور متن میں پوشیدہ پرت در پرت ادبی معنویت کو منتقل کرنا ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا ہے۔یوں سمجھ لیجیے کہ ترجمہ کی مشین ایک 'رٹو طوطا' کی طرح ہے یعنی جو پروگرام اس کی چپ میں ڈال دیا گیا ہے اس سے پرے ایک بھی زائد لفظ تلاش کرلانا کمپیوٹر یا ترجمہ مشین کے لیے محال کام ہے۔آج سیکڑوں آن لائن ترجمہ کرنے والے سافٹ ویئر کے زمروں میں میری اپنی تلاش وجستجو کے مطابق درج ذیل پانچ سافٹ ویئر ایسے ہیں جو اردو متحمل (Urdu Supportable) بھی ہیں۔

(1) گوگل ٹرانسلیٹ (2) بنگ مائکروسافٹ ٹرانسلیٹر (3) یانڈیکس ٹرانسلیٹ (4) بیبلون اور (5) سسٹران ٹرانسلیٹ۔

اب میں فعل، فاعل اور مفعول پر مشتمل ایک سادہ سا انگریزی جملہ بنا کر ان پانچوں سافٹ ویئرس کی مدد سے اردو میں ترجمہ کروں گا اور ان میں سے جس کا ترجمہ سب سے زیادہ مکمل معلوم ہوگا اس کے ترجمہ کی مزید تقابلی تحقیق کی جائے گی۔

جملہ یہ ہے: Human brain maintains the beauty of text in translation.

(1) گوگل ٹرنسلیٹ: انسانی دماغ ترجمہ میں متن کی خوبصورتی کو برقرار رکھتا ہے۔

(2) بنگ مائکروسافٹ ٹرانسلیٹ: انسانی دماغ ترجمہ میں متن کی خوبصورتی کو برقرار رکھتا ہے۔

(3) یانڈیکس ٹرانسلیٹ: انسانی دماغ کو برقرار رکھتا خوبصورتی کے متن میں ترجمہ۔

(4) بیبلوں: متن میں انسانی دماغ کا موقف کی خوبصورتی ترجمہ۔

(5) سسٹران: انسانی دماغ ترجمے میں متن کی خوبصورتی کو برقرار رکھتا ہے۔

ان پانچ ترجموں میں سے تقریباً تین میں یکسانیت ہے اور 'سسٹران' کے ترجمہ میں لفظ 'ترجمے' کو امالہ کے ساتھ رکھا گیا ہے۔اگر اسی جملہ کا ترجمہ پانچ الگ الگ

انسانی ذہن کو ترجمہ کرنے میں متن کی نوعیت اور ضخامت کے مطابق وقت درکار ہوتا ہے جب کہ مشینی ترجمہ کے عمل میں متن خواہ مشکل ہو یا آسان، کم ہو یا زیادہ، ترجمہ درست ہو یا غیر درست چند سکینڈ میں نتیجہ سامنے نکل آتا ہے۔اس کے باوجود مشینی ترجمہ انسانی ترجمہ کا متبادل نہیں بن سکتا۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ مشینی ترجمہ سے لفظ یا مرکبات یا چھوٹے چھوٹے سادہ اور آسان جملوں کو تو باآسانی منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن پیچیدہ اور طویل جملوں کو منتقل کرنے میں مشینی ترجمہ نحوی اور صرفی غلطیوں سے منزہ نہیں رہ سکتا۔

ماہرین سے کرایا جائے تو بہت کم ممکن ہے کہ Maintain کا ترجمہ سب کے سب 'برقرار رکھنا' ہی کریں یا لفظ 'Beauty' کا ترجمہ پانچوں مترجمین 'خوبصورتی' ہی کریں۔یہ امکان باقی رہتا ہے کہ ان میں سے کوئی 'Human Brain' کا ترجمہ 'بشری شعور' اور 'Beauty' کا 'حسن' اور 'maintain' کا 'باقی رکھنا، پاس رکھنا، ثابت رکھنا یا لحاظ رکھنا' کرے۔اور پورا ترجمہ یوں ہو کہ ''بشری شعور ترجمہ میں متن کے حسن کو باقی رکھتا ہے''۔خیر یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہوئی۔تخلیقی متن اور شاعری کے انسانی ترجمہ میں ہی کتنے ادیب آج تک الجھے ہوئے ہیں کہ ان کا ترجمہ ممکن ہے یا نہیں چہ جائیکہ ان کے مشینی ترجمہ پر بحث کی جائے۔حسن عسکری لکھتے ہیں:

''یوں کرنے کو میں نے 'مادام بواری' کا ترجمہ کیا ہے۔لیکن اس ناول میں ایک ٹکڑا ہے، جس میں ہیروئن کی چھتری پر برف گرنے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔اگر اردو کے سارے ادیب مل کر ان آٹھ دس سطروں کو اس طرح ترجمہ کردیں کہ اصل کا حسن ویسا کا ویسا ہی رہے تو اس دن سے میں اردو کے علاوہ کسی اور زبان کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔''

(گرترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے، مضمون، حسن عسکری، مشمولہ، ترجمہ کا فن اور روایت، ص 116، مرتب قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2013)

حسن عسکری کی بات کا پس منظر الگ ہے۔وہ ترجمہ کے حوالے سے اردو زبان کی وسعت و تنگ دامانی پر اظہار خیال کررہے ہیں لیکن ان کے ان دہکتے ہوئے جملوں سے یہ نتیجہ بھی آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ تخلیقی متن کے ترجمہ پر جب ادیبوں کی پوری ٹیم کو چیلنج کیا جا سکتا ہے تو مشینی ترجمہ کے لیے ہنوز دلی دور است۔

شاعری کا ترجمہ تو تقریباً تمام بڑے ادیبوں نے ناممکن ہی تسلیم کیا ہے۔مشینی ترجمہ کے حوالے سے مظفر علی سید رقم طراز ہیں:

''جدید زبان شناسی کے ماہرین نے مختلف زبانوں کے اجزائے ترکیبی کا تقابلی مطالعہ کرکے واضح کر دیا ہے کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں۔چنانچہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کمپیوٹر میں لسانیاتی پروگرام بھرنے کے بعد بھی لسانی ماہرین کی ضرورت برقرار رہے گی اور وقت اور سرمایے کی بچت شاید پھر بھی نہ ہو سکے۔تاہم دنیا کے کئی ملکوں میں مزید تحقیق جاری ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ پوری طرح خودکار نہ سہی مشینی ترجمہ کسی قدر آسان ضرور ہو جائے گا تاہم اس کا دائرۂ کار ایسی زبان تک محدود

رہے گا جس میں زبان کو تہ در تہ معنویت کے ساتھ استعمال نہ کیا گیا ہو اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ تو ہوتا ہی ایسی تخلیقات کا ہے جو تہ در تہ معنویت کی حامل ہوں اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن قسم ہے۔''

(فن ترجمہ کے اصولی مباحث، مظفر علی سید، مضمون، مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص 39،40 مرتبہ اعجاز راہی، اشاعت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، پاکستان، 1986)

تخلیقی نثری اصناف مثلاً افسانہ، ناول، انشائیہ، ڈراما وغیرہ اور شاعری کا ترجمہ کرنا کس حد تک ممکن ہے یہ ابھی تک اہل نظر اور اہل علم کے درمیان موضوع بحث ہے کیوں کہ ان متون کے ترجمہ میں فقط معانی و مفاہیم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے سے بات نہیں بنتی بلکہ اساسی متن (Source Language) کی روح یعنی اس متن میں موجود علاقائیت، تہذیب و ثقافت، متن کی شان نزول، ماحول و فضا، زمان و مکان، روزمرہ اور محاوروں کا ہدفی زبان (Target Language) میں مناسب اور قریب ترین متبادل و مترادف پیش کرنے سے ہی ترجمہ کا حق ادا ہوسکتا ہے جو کہ نہایت دشوار اور بے حد جاں فشانی کا کام ہے۔اس مرحلۂ شوق کا طے کرنا جب باشعور قابل اور تجربہ کار انسان مترجم کے لیے چیلنج ہے تو مشین مترجم پھر بھی بے شعور ہی ہے۔اوپر ترجمہ کرنے والے جن پانچ سافٹ ویئرس کا میں نے محاسبہ کیا ہے ان میں سب سے بہتر ترجمہ 'سسٹران' (Systran) کے ذریعے کیا گیا تھا۔لیکن وہ ایک سادہ اور مختصر سا جملہ تھا پھر بھی اس سے کئی درجہ بہتر انسانی ترجمہ کی گنجائش باقی تھی جس کی مثال بھی میں نے پیش کر دی ہے۔اب آیئے ایک غیر تخلیقی نثر کے انسانی ترجمہ اور مشینی ترجمہ کا تقابل کیا جائے تاکہ مشینی ترجمہ کی تاحال اہلیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔

عبارت:

"It is a proof of life and curiosity-curiosity on the part of the brotherhood of novelists, as well as on the part of their readers. Only a short time ago it might have been supposed that the English novel was not what the French call discutable. It had no air of having a theory, a conviction, a consciousness of itself behind it -of being the expression of and artistic faith, the result of choice and comparison.

(The Art of Fiction مضمون ہنری جیمس، شائع شدہ Longman's Magazine4, ستمبر 1884)

مترجم: جمیل جالبی (انسان)

''یہ بات بذات خود زندگی اور شوق و تجسس کا ثبوت ہے۔ناول نگاروں کی برادری کے شوق و تجسس کا بھی اور ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کا بھی۔کچھ ہی عرصے پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ انگریزی ناول کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قابل توجہ ہو۔اس کے پیچھے کوئی ایسا نظریہ، کوئی ایسا عقیدہ اور کوئی ایسا شعور نہیں جس سے کسی فنی عقیدے کا اظہار ہوتا ہو یا یہ معلوم ہو سکے کہ انگریزی ناول کسی انتخاب اور موازنہ کا نتیجہ ہے۔''

(ارسطو سے ایلیٹ تک، از جمیل جالبی، ص 401، ترجمۂ مضمون، ہینری جیمس، شائع شدہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، جون 1977)

مترجم: سسٹران سافٹ ویئر (مشین):

''یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ناول نگار اور قارئین کے درمیان تجسس زندگی اور تجسس کا ایک ثبوت ہے۔کچھ ہی عرصہ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انگریزی کا ناول وہ نہیں ہے جسے فرانسیسی نے مسترد کیا ہے۔ اس میں کوئی ایسا نظریہ، اعتقاد، اس کے پیچھے ذات خود کو ایک شعوری عقیدے، پسند اور تقابل کے اظہار کے پیچھے کوئی احساس نہیں تھا۔''

یہ سافٹ ویئر ایک بار میں زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار حروف پر مشتمل باون زبانوں میں سے کسی بھی زبان کے متن کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کے ترجمہ کی حالت آپ درج بالا مثال سے دیکھ ہی سکتے ہیں۔یہ تو فقط ایک مثال ہے۔میں نے درجنوں روزمرہ، کہاوت، محاورے اور تہذیبی الفاظ مثلاً ہاتھ پیلے کر دینا، نو دو گیارہ ہوجانا، خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول جانا وغیرہ جیسے مشکل الفاظ سے جملے بنا کر ان کا مشینی ترجمہ کر کے اندازہ لگانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں مضحکہ خیز ترجموں کے ٹکڑے ہی حاصل ہو سکے۔ یہاں یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ مشینی ترجمہ انسانی ترجمہ کی جگہ لینے کے قابل ہو گیا ہے یا ہوسکتا ہے۔ہاں! جس رفتار سے ٹیکنالوجی ترقی کی راہ پر گامزن ہے اس سے یہی لگتا ہے کہ مشینی ترجمہ ایک نہ ایک دن زندگی کے دوسرے امور کی طرح انسانوں کی جگہ لے لے گا یا قائم مقام ہو جائے گا۔مگر یہ سب ہونے میں اور کتنا عرصہ لگے گا معلوم نہیں۔

دلچسپ قصہ یہ ہے کہ اس صدی کے منفرد اردو فکشن نگار استاد محترم ڈاکٹر خالد جاوید نے اپنے مشہور ناول 'موت کی کتاب' پر جو طنزیہ فنتاسی مقدمہ تحریر کیا ہے اس میں انہوں نے تصور باندھا ہے کہ دو سو تین سو سال بعد اردو کی حالت کیا ہوگی، پاگل خانہ کے کھنڈرات میں اس کے اس ناول کا نسخہ کسی محقق آثار قدیمہ کے ہاتھ لگے گا اور پھر اس زبان کے رسم الخط کو پڑھنے کی کوشش کی جائے گی۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ نسخہ ایک عجیب و غریب زبان میں لکھا ہوا تھا، جس کا ایک ایک حرف میرے لیے انجان اور مکمل طور پر ناقابل فہم تھا...... میں نے جب اس زبان اور رسم الخط کے بارے میں چھان بین کی تو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ زبان دو سو تین سو سال پہلے تک اس علاقے اور قرب و جوار میں لکھی پڑھی اور بولی جاتی تھی، لیکن اب ساری دنیا میں ڈھونڈنے سے شاید ہی کوئی اس زبان کو سمجھنے والا مل سکے''۔

(موت کی کتاب، مقدمہ، ص 28، عرشیہ پبلی کیشنز، طبع دوم، 2012)

پھر اسی خیالی مقدمے میں انہوں نے خیالی محقق کے خیالی دوست ژاں ہیوگو کا ذکر کیا ہے جو ان کے تصور میں مشہور محقق اور مستشرق گارساں ژاتاثی کی نسل سے ہے۔چونکہ محقق نے اپنے دوست ہیوگو سے اس کے جد اعلیٰ گارساں ژاتاثی کا ذکر بارہا سن رکھا تھا اور یہ بھی سن رکھا تھا کہ دوست کے جد اعلیٰ کو چند مشرقی زبانوں کا علم تھا اس لیے محقق نے وہ دستیاب شدہ نسخہ اپنے دوست ہیوگو کو ارسال کر دیا تاکہ وہ اس کی قرأت کا کچھ انتظام کر سکے۔وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن اس کا خط ملا جس میں یہ اطلاع تھی کہ وہ اس متن کو تقریباً پورے کا پورا پڑھنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔اس کے کمپیوٹر میں اس رسم الخط کی چند پروگرام فائلیں موجود تھیں جو اس نے بڑی مشکل سے دریافت کیں۔ہیوگو نے مجھے اس نسخہ کا مشینی ترجمہ کر کے ارسال کر دیا۔یہ وہی ترجمہ ہے جسے میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔'' (ایضاً، ص 29)

یہ پورا واقعہ یہاں درج کرنے سے میری منشا اپنے قاری کو مشینی ترجمہ کا امکانی مستقبل سمجھانا ہے۔نظریۂ امکانات (Theory of Probability) کی رو سے خالد جاوید کے یہ مفروضات (Assumptions) ہمیں مشینی ترجمہ کا آئندہ دکھا رہے ہیں یعنی دو سو تین سو سال بعد مشینی ترجمہ ممکن ہے اتنا Advance ہو جائے گا کہ اس ترجمہ شدہ متن کی زبان خالد جاوید کی جادو بیاں نثر کی طرح ہوگی۔

■

Waseem Ahmad Alimi
Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Email: wasimahmadalimi@gmail.com

وکاس گپتا

ہے ننگِ خلائق وہ جو شاعر ہو سخن چور

مولوی محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں لکھا ہے۔

''ایک دفعہ قلعہ میں مشاعرہ تھا، حکیم آغا جان عیش کہ کہن سال مشاق اور نہایت زندہ دل شاعر تھے، اُستاد کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ زمینِ غزل تھی، یار دے، بہار دے، روزگار دے۔ حکیم آغا جان عیش نے ایک شعر اپنی غزل میں پڑھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

ان (شیخ ابراہیم ذوق) کے ہاں بھی اسی مضمون کا ایک شعر تھا۔ باوجود اُس رتبہ کے لحاظ اور پاس مروت حد سے زیادہ تھا۔ میرے والد مرحوم پہلو میں بیٹھے تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ مضمون لڑ گیا۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ انھوں نے کہا کیوں نہ پڑھو۔ نہ پہلے سے انہوں نے آپ کا مضمون سنا تھا۔ نہ آپ نے ان کا۔ ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس سے بھی طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک منزل پر دونوں فکر پہنچے مگر کس کس انداز سے پہنچے۔ چنانچہ حکیم صاحب مرحوم کے بعد ہی ان کے آگے شمع آئی انھوں نے پڑھا۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

آبِ حیات: مولوی محمد حسین آزاد، مطبع مفید عام، لاہور، 1887، ص 496-97

***

'سرقہ' اور 'توارد' اردو شاعری کی دو اصطلاحیں ہیں۔ 'سرقہ' کے معنی ہیں: چوری، دزدی، دوسرے کے شعر یا مضمون کو اپنے شعر میں داخل کر لینا (فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، سید احمد دہلوی، ترقی اردو بورڈ ایڈیشن، دہلی، 1974 ص 70) اور 'توارد' کے معنی ہیں: باہم ایک جگہ اترنا، دو شاعروں کا باہم مضمون لڑ جانا، ایک ہی مضمون دو شخصوں کے ذہن میں آنا، شعر لڑ جانا۔ (فرہنگ آصفیہ، جلد اول، سید احمد دہلوی، ترقی اردو بورڈ ایڈیشن، دہلی، 1974، ص 633)۔

'سرقہ' اور 'توارد' کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ جب کوئی شاعر کسی دوسرے شاعر کے مضمون کو جان بوجھ کر اخذ کرتا ہے تو وہ 'سرقہ' ہے اور اگر اتفاقاً ایسا ہوجاتا ہے تو وہ 'توارد' ہے۔ اب یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ شاعر نے مضمون ارادتاً اخذ کیا ہے یا اتفاقاً ایسا ہوگیا ہے؟

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم جس شعر کو سرقہ سمجھ رہے ہیں وہ توارد ہو اور جس شعر کو اپنی خوش فہمی سے توارد سمجھ رہے ہوں وہ دراصل سرقہ ہو۔

مثلاً سیّد امداد امام اثر (1849 تا 1934) کی غزل کا ایک مطلع ہے۔

لوگ جب تیرا نام لیتے ہیں
ہم کلیجے کو تھام لیتے ہیں

دیوانِ اثر: سیّد امداد امام اثر، مطبع سرکاری ریاست، رامپور، 1913، ص 127

یہ مطلع لفظ بہ لفظ عبدالحمید عدم (1910 تا 1981) کی ایک غزل کا مطلع بھی ہے۔

کلیاتِ عدم، ترتیب و تدوین: خواجہ محمد زکریا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2009، ص 719

صفی لکھنوی (1862-1950) کی 1912 میں لکھی گئی ایک غزل کا مطلع ہے۔

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

دیوانِ صفی، مرتب و ناشر: ممتاز حسین جونپوری، لکھنؤ، 1953، ص 134

یہ مطلع لفظ بہ لفظ مبارک عظیم آبادی (1849-1958) کی ایک غزل کا مطلع بھی ہے۔

جلوۂ داغ: مبارک عظیم آبادی، نظامی پریس، بدایوں، 1951، ص 101

دنیا کی ہر زبان کا شاعر اپنے پیش رو اور ہم عصر شاعروں کے کلام سے بعض مقام پر دانستہ استفادہ کرتا ہے اور بعض مقام پر نادانستہ فیض یاب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی مصرع یا کوئی شعر اتفاقاً ٹکرا جاتا ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی مصرع یا کوئی شعر لاشعور (Unconscious) میں رہ جاتا ہے اور جب شاعر شعر کہتا ہے تو وہ مصرع یا شعر لفظ بہ لفظ یا ایک آدھ لفظ کے فرق کے ساتھ اس کے ہاں توارد کر جاتا ہے۔ 'توارد' کی کچھ ایسی ہی مثالیں میں یہاں اپنی کتاب چراغ در چراغ سے نقل کر رہا ہوں۔

اس منہ سے کلام کچھ نہ نکلا   جز تیرا ہی نام کچھ نہ نکلا

شیخ ظہور الدین شاہ حاتم (1699-1783)

دیوانِ زادہ: شیخ ظہور الدین حاتم، مُرتبۂ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،

مکتبہ خیابان ادب، لاہور، مارچ 1975، ص 177

اس منہ سے کلام کچھ نہ نکلا   جز یار کے نام کچھ نہ نکلا

محمد قیام الدین قائم چاند پوری (1725-1793)

دیوانِ قائم: قائم چاند پوری، مُرتبہٗ ڈاکٹر خورشید الاسلام، مطبع جمال پریس، دہلی، 1963، ص 34

***

کلیاتِ قائم (جلد اول): قائم چاند پوری، مرتبہٗ ڈاکٹر اقتدا حسن، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، دسمبر 1965، ص 48

***

دے کے دل ہاتھ ترے اپنے ہاتھ
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیخ ظہور الدین شاہ حاتم (1699-1783)

دیوانِ زادہ: شیخ ظہور الدین حاتم، مرتبہٗ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، مارچ 1975، ص 172

***

پھٹ چکا جب سے گریباں، تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

غلام ہمدانی مصحفی (1747-1824)

کلیاتِ مصحفی (اول): غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہٗ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مجلس اشاعتِ ادب، دہلی، اپریل 1967، ص 158

***

کلیاتِ مصحفی (دیوانِ اول): غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہٗ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، جون 1968، ص 272

***

کلیاتِ مصحفی (اول): غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مطبع کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلّی، 1968، ص 215

***

کر چکے جامہ اصلی صد چاک   ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

محمد جان شادؔ لکھنوی (1805/6-1899)

سخنِ بے مثال (دیوانِ شاد): محمد جان شادؔ لکھنوی، تصویرِ عالم پریس، لکھنؤ، جنوری 1901، ص 76

***

(22 فروری 1920)

کر چکے چاک گریباں جب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی (1882-1935)

انجم کدہ: عزیزؔ لکھنوی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، مارچ 1959، ص 20

***

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

خواجہ میر درد (1721-1785)

دیوانِ خواجہ میر درد، مطبعِ سراجی، 1282 ہجری، ص 28

***

دیوانِ ہندی خواجہ میر درد، مطبع گلشن محمدی، 1289 ہجری، ص 28

***

ڈھان پاں ہے مزاج اس کی تو
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

میرزا ظہیر الدین علی بخت اظفری (1760-1818/9)

دیوانِ اظفری: میرزا ظہیر الدین علی بخت اظفری

مُرتبہٗ محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی، مدراس یونیورسٹی، دسمبر 1939، ص 32

***

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کوچ کر جائیں گے ہم دنیا سے   گر ترا وقتِ سفر یاد آیا

چنبیلی یاسمن (انشاء اللہ خاں کی کنیز)

بہارستانِ ناز از حکیم محمد فصیح الدین رنج، مطبع دار العلوم، میرٹھ، اپریل 1869، ص 69

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقت سفر یاد آیا

مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797 تا 1869)

دیوانِ غالب: مرزا اسد اللہ خاں غالب

مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، نومبر 1873، ص 15

***

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

مرزا محمد رضا خان برقؔ لکھنوی (1791/2-1857)

دیوانِ برق: مرزا محمد رضا خان برق لکھنوی، مطبع سلطانی، لکھنؤ، 1853، ص 362

***

دشمن و دوست کی تدبیر سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

مرزا مسیتا بیگ منتہی لکھنوی (وفات 1871)

کارستان فصاحت: مرزا مسیتا بیگ منتہی، مطبع یوسفی، دہلی، 1311 ہجری 1893، ص 190

***

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

سیّد غلام محمد مست کلکتوی (1896 تا 1941)

شعرائے بنگالہ (حصہ اول)، مُرتبہٗ ڈاکٹر الف انصاری، شبِ نور پبلی کیشنز، کلکتہ، 2006، ص 518

***

ہجر میں تھی کسے امید سحر   رات کاٹی خدا خدا کر کے

سیّد محمد خاں رندؔ لکھنوی (1797-1857/8)

گلدستۂ عشق: دیوانِ رند (حصہ اول): سیّد محمد خاں رند لکھنوی، منشی نول کشور، کانپور، 1895، ص 135

***

گلدستۂ عشق: دیوانِ رند (حصہ اول): سیّد محمد خاں رند لکھنوی، منشی نول کشور، کانپور، اگست 1906، ص 135

***

گلدستۂ عشق: دیوانِ رند (حصہ اول): سیّد محمد خاں رند لکھنوی، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، 1931، ص 199

***

رہ کے مسجد میں کیا ہی گھبرایا   رات کاٹی خدا خدا کر کے

میر مہدی حسین مجروح (1833-1903)

مظہر معانی: دیوانِ مجروح: میر مہدی حسین مجروح، سرفراز پریس، دہلی، 1898، ص 181

***

مظہر معانی: دیوانِ مجروح: میر مہدی حسین مجروح، مرتبہٗ ریاض احمد، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، جون 1978، ص 313

***

اب تم سے کیا کسی سے شکایت نہیں مجھے
تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

نظام شاہ نظام رامپوری (1823 تا 1872)

کلیاتِ نظام: شاہ نظام، مُرتبہٗ قدرت رام پوری، مطبع شمس المطابع، مراد آباد، 1899، ص 50

***

راتیں رہیں وہ راتیں، نہ دن ہی رہے وہ دن
تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

مولوی محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی (1863 تا 1923)

دیوانِ رنجور: رنجور عظیم آبادی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 2000، ص 5

***

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا
کن انکھیوں سے اس کو مگر دیکھ لینا

نواب مرزا خاں داغ دہلوی (1831 تا 1905)

مہتابِ داغ: نواب مرزا خاں داغ دہلوی، مطبع عزیز دکن، حیدر آباد، 1310ھ / 1892، ص 58

***

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا   پھر اُس شوخ کو اک نظر دیکھ لینا

سیّد محمد مرتضٰی بیان میرٹھی (1840-1900)

دیوانِ بیان میرٹھی، مُرتبہٗ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، مطبع سلمان فائن پرنٹر، ناگپور، 2007، ص 76

***

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا   پھراُن کا مجھے اِک نظر دیکھ لینا

خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب (1884 تا 1944)

کشکول مجذوب: خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب، ناشر: ظہور الحسن، ناظم مکتبہ امداد الغرباء سہارنپور، 1964، ص 83

***

اِدھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا   پھرانکی طرف اِک نظر دیکھ لینا

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی (1885 تا 1967)

بہاراں: مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

نظامی پریس، لکھنؤ، اگست 1939، ص 21

***

حیف دستِ دعا و دامنِ ناز   خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی ((1880-1832/3

کلیاتِ قلق: حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی، مطبع انصاری، دہلی، 1883، ص 27

***

کلیاتِ قلق: حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی

مرتبہٗ کلبِ علی خاں فائق، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، دسمبر 1966، ص 38

***

تیری جانب سے مجھ پہ کیا نہ ہوا
خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

سیّد امداد امام اثر (1849 تا 1934)

دیوانِ اثر: سیّد امداد امام اثر، مطبع سرکاری، ریاست رامپور، 1913، ص 17

***

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا
خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (1882 تا 1935)

گلکدہ: مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، 1931، ص 4

***

ہر چند مٹ گیا ہے لیکن جلیس اب بھی
ہر ملک سے ہے بہتر ہندوستاں ہمارا

میر ابو محمد عرف اِبّو صاحب میر جلیس (1858 تا 1907)

خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا: ضمیر اختر نقوی، مرکزِ علومِ اسلامیہ، کراچی، 1994، ص 603

میر ابو محمد عرف اِبّو صاحب میر جلیس، میر انیس کے پوتے اور میر سلیس کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

***

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

محمد اقبال (1877 تا 1938)

بانگِ درا: محمد اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، اشاعت سوم، مارچ 1930، ص 82

***

عشق کو دیجیے جنوں میں فروغ   درد سے درد کی دوا کیجے

شیام موہن لال جگر بریلوی (1890 تا 1976)

پرتوِ الہام (دیوانِ جگر)، مرتبین: مادھو موہن رائے جامی، رادھے موہن رائے، نظامی پریس، بدایوں، اگست 2012، ص 195

***

غم میں کچھ غم کا مشغلا کیجے   درد کی درد سے دوا کیجے

سیّد جعفر حسین منظر لکھنوی (وفات: 1965)

دیوانِ منظر (منظرستان): سیّد جعفر حسین منظر لکھنوی، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، جنوری 1959، ص 107

***

اُمید وصل نے دھوکے دیے ہیں اس قدر حسرت
کہ اُس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

چراغ حسن حسرت (1904 تا 1955)

نقوش غزل نمبر، مُرتبہٗ محمد طفیل، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، مئی، جون 1954، ص 209

***

دلِ ناداں نے کھائے ہیں محبت میں فریب اتنے
کہ اُس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (1899 تا 1978)

کلیاتِ صوفی تبسم: صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری 2008، ص 79

***

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

چراغ حسن حسرت (1904 تا 1955)

نقوش غزل نمبر، مُرتبہٗ محمد طفیل، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، مئی، جون 1954، ص 209

***

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

سید عاشق حسین صدیقی سیماب اکبرآبادی (1880 تا 1951)

کلیمِ عجم: سید عاشق حسین صدیقی سیماب اکبرآبادی، مطبع رفاہِ عام پریس، آگرہ، 1936، ص 284

***

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ 'توارد' شعر میں ہوسکتا ہے، غزل میں نہیں۔ اگر کوئی غزل (یا کسی غزل کے ایک سے زیادہ شعر) دو شاعروں کے یہاں ملتی ہے تو اس کا سبب 'توارد' نہیں ہوسکتا، وہ یا تو 'سرقہ' ہے یا 'الحاق'۔ مثلاً دیوان قائم چاندپوری میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

نخل اُمید کیوں کہ ہمارا ہو آہ سبز
اس باغ میں کبھو نہ ہوا برگِ کاہ سبز

(دیوان قائم: شیخ قیام الدین 'قائم' چاندپوری، مُرتبہٗ فضل الحسن حسرت موہانی، احسن المطابع علی گڑھ، 1905، ص 12)

یہ غزل ایک آدھ لفظ کے فرق کے ساتھ مرزا محمد رفیع سودا کے یہاں بھی ملتی ہے۔ (کلیاتِ سودا: مرزا رفیع سودا، مطبع منشی نول کشور، کانپور، 1873، ص 224)۔ یہ غزل الحاقی ہے۔

قائم چاندپوری، مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ قائم نے اپنے دیگر کلام کے ساتھ یہ غزل بھی اصلاح کے لیے سودا کے پاس بھیجی تھی۔ بعد میں کلیات سودا ترتیب دینے والوں کی غلطی سے قائم کا بہت سا کلام بھی جو بیشتر حکایات و مثنویات پر مشتمل ہے کلیات سودا میں داخل ہو گیا۔ اس پر ستم یہ کہ اس کلام میں ردو بدل کیا گیا اور قائم کے کلام میں جہاں جہاں تخلص قائم تھا وہاں وہاں سودا کر دیا گیا۔

'الحاق' کی ایسی مثالیں فارسی شاعروں کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً فارسی کے عظیم شاعر خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (1320-1388/9) اور خواجہ جمال الدین سلمان ساوجی (1309-1376) دونوں ہم عصر اور آسمان فارسی شعر و ادب کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ دیوان حافظ شیرازی میں ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

ز باغِ وصلِ تو یابد ریاضِ رضواں آب
ز تابِ ہجرِ تو دارد شرارِ دوزخ تاب

دیوانِ حافظ، منشی نول کشور، 1279 ہجری، ص 8

یہی غزل ایک آدھ لفظ کے فرق کے ساتھ خواجہ جمال الدین سلمان ساوجی کے یہاں بھی ملتی ہے۔ یہ غزل بھی الحاقی ہے۔

قدیم شعرائے اُردو و فارسی کے کلیات و دواوین میں ایک دوسرے کے کلام کا خلط ملط ہو جانا عام بات تھی۔ اس قسم کا اشتباہ یا اختلاط عموماً کاتب کی بے توجہی یا لاعلمی کی بنا پر وقوع پذیر ہوجاتا تھا۔

■

Vikas Gupta
Editorial Board, Rekhta Foundation
B-37, Sector-1
Noida- 201 301
E-mail : vikas.gupta_786@yahoo.com
Mobile: 8750 83 85 84

محمد انصر

رپورتاژ 'ایک ہنگامہ' اور 'بمبئی سے بھوپال تک' کا تقابلی مطالعہ

رپورتاژ حالات و واقعات، خیالات ونظریات اور تجربات ومشاہدات کو شوکت الفاظ، حسن بیان، حلاوتِ زبان اور دل کش انداز اور عمدہ اسلوب میں پیش کرنے کا نام ہے اور اس کے اصول وخطوط دیانت داری وحقیقت پسندی اور صداقت کی آئینہ داری کے تحت متعین ہوتے ہیں۔ داستان، افسانہ، ناول وغیرہ میں کردار کا ذکر عموماً فرضی ہوتا ہے، لیکن رپورتاژ میں ایسا نہیں ہے، بلکہ اس میں شامل تمام کردار حقیقی اور یقینی ہوتے ہیں۔

رپورتاژ میں تحقیق وصداقت پر مبنی کسی واقعہ سے متعلق تفصیلی معلومات، اس کے اہم نکات و بیانات، مناظر کی دل کش عکاسی اور مظاہر قدرت کی عمدہ تصویر کشی وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔

رپورتاژ نگار جس اجلاس یا پروگرام یا واقعہ کو اپنا موضوع سخن بناتا ہے، اس میں وہ اس کے پس منظر، درپیش اہم اور قابل ذکر واقعات، ادبی مکالمے، علمی مباحثے، معقول تنقیدات، خوش مزاجیوں، طنز آمیز اور مبنی بر تلخ باتوں، شرکا کی باہمی چشمکوں وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ ساتھ ہی حسب موقع اپنے واقعات ومشاہدات کی روشنی میں تلخ تجربات اور اپنے خیالات ونظریات کا بھی برملا اظہار کرتا ہے۔ اپنے موضوع یا پروگرام سے متعلق مقام، دن، تاریخ، سنہ، وقت وغیرہ کو احاطۂ تحریر میں لاتا ہے اور واقعات کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے دلچسپ اندازِ بیان میں حقیقی معلومات اور اہم دستاویزات بھی فراہم کرتا ہے۔ ساتھ ہی سماجی ومعاشرتی، تہذیبی وثقافتی، ملکی ومعاشی اور قومی وملی منظر نامے کی بھی تصویر کشی کرتا ہے اور اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے موقع بہ موقع تخیل سے بھی کام لیتا ہے۔

صفیہ نے اپنے رپورتاژ 'ایک ہنگامہ' میں بنیادی طور پر بھوپال کی علمی وادبی فضا اور اہالیان بھوپال کی علم دوستی اور ادب پروری کو بیان کیا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے پس منظر، منتظمین کی محنت وکاوش، معاونین کی خدمت ومعاونت اور مختلف طریقے سے کانفرنس میں دلچسپی لینے افراد اور ان کی سرگرمیوں کو بڑی غیر جانب داری کے ساتھ مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ کانفرنس کی از ابتدا تا انتہا پوری روداد اور جملہ اجلاس اور ان کی نشستوں اور ان کے اثرات ونتائج اور کامیابیوں اور کامرانیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ علی سردار جعفری کی گرفتاری اور کانفرنس کے تئیں ان کی ذاتی دلچسپی، شوق ووارفتگی اور لوگوں کو اس جانب مائل کرنے اور ترغیب وہدایت دینے وغیرہ کو بھی بطور خاص بیان کیا ہے اور پھر اخیر میں سیر سانچی اور مہمانان کانفرنس کی روانگی کی پوری داستان کو عمدہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ جب کہ عصمت کے رپورتاژ 'بمبئی سے بھوپال تک' میں علی سردار جعفری کی گرفتاری ورہائی، ممبئی ترقی پسند ٹیم کی سفر بھوپال کی تیاری وروانگی، رفقائے سفر، دوران سفر کے حالات وکوائف، کانفرنس کے تمام اجلاس اور مہمانانِ کانفرنس کے سفر سانچی وغیرہ کا ذکر ہے۔ عصمت نے کانفرنس کے پس منظر اور اہل بھوپال کی علمی دلچسپی اور ان کا ادبی ذوق وشوق اور کانفرنس کے تئیں ان کے جذبات وخواہشات وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور منتظمین کانفرنس میں صفیہ اختر اور اختر سعید وغیرہ دو تین لوگوں کی سرگرمیوں کا ہی ذکر کیا ہے جب کہ صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں کئی منتظمین کے اسما اور ان کے ذمے مختلف امور وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ البتہ عصمت نے جعفری کی گرفتاری کے ساتھ ساتھ ان کی رہائی کا بھی ذکر کیا ہے، جس کا ذکر صفیہ کے رپورتاژ میں نہیں ہے۔ ان میں چند باتوں کو ترتیب وار بیان کیا جا رہا ہے:

✪ عصمت اور صفیہ دونوں نے اپنے رپورتاژ میں دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ کردار نگاری میں بھی مہارت کا ثبوت دیا ہے اور واقعہ میں شامل کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ صفیہ نے اپنے رپورتاژ 'ایک ہنگامہ' میں کردار نگاری میں

کرداروں کے ناموں کے باب میں عموماً مختصرات کا سہارا لیا ہے،یعنی انھوں نے رپورتاژ کے کرداروں میں کسی کے نام کے اول اور کسی کے نام کے اخیر صرف ایک ہی جز کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ مثلاً علی سردار جعفری کے نام میں صرف جعفری، کیفی اعظمی کے نام میں صرف کیفی وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور کردار کی اہمیت وعظمت کا علم بھی ان کے رپورتاژ سے نہیں ہو پاتا ہے جب کہ عصمت کے رپورتاژ میں ایسا نہیں ہے، انھوں نے مکمل نام کے ذکر کا اکثر اہتمام کیا ہے، جس سے عام قارئین کو کرداروں سے صحیح متعارف ہونے یعنی ان کو جاننے اور سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی شک یا شبہ نہیں رہ جاتا، بلکہ اس کی وجہ سے ان کو رپورتاژ کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے میں ایک طرح کی مزید دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور شخصیت کے متعین ہونے اور اس کی پوری تصویر سامنے آنے کے بعد ان کی باتوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔

عصمت اور صفیہ کے رپورتاژوں کے مطالعے سے کانفرنس کے منتظمین وشرکا اور مہمانان ومندوبین کے اسما کی تعداد میں بھی کمی بیشی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں کانفرنس کے منتظمین، معاونین، رضا کاران اور مندوبین سمیت سب کا ذکر کیا ہے، بلکہ بعض منتظمین کی الگ الگ ذمے داریوں اور سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

چناں چہ صفیہ نے منتظمین ومعاونین کانفرنس میں رشید صدیقی، اختر، اختر سعید، احسن، صہبا، قمر جمالی، ظہور ہاشمی، کامتا پرشاد، جلال قریشی، حامد سعید خاں کے اسمائے گرامی کو پیش کیا ہے اور کانفرنس کے شرکا ومہمانان میں علامہ سلیمان ندوی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، مجروح، مہندر ناتھ، ابراہیم یوسف، سندر لال، ادھو کمار، عادل رشید، شاہ میر راہی، تاباں، جوش، عرش، اسد اور عسکری کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح صفیہ کے رپورتاژ میں کانفرنس کے منتظمین اور مہمانان دونوں کی تعداد میں کثرت معلوم ہوتی ہے، جب کہ عصمت کے رپورتاژ میں قلت کی تعداد ظاہر ہوتی ہے۔

عصمت نے اپنے رپورتاژ میں منتظمین کانفرنس میں صرف چند ہی اشخاص یعنی اختر سعید، جاں نثار اختر، صفیہ اختر، اختر جمال، احسن علی کا ہی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ایک نام حمیدہ سلام الدین کا بھی ذکر کیا ہے، غالباً یہ کانفرنس کے منتظمین اور مہمانان میں سے کسی میں نہیں تھیں، جیسا کہ رپورتاژ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ عصمت نے رپورتاژ میں رشید صدیقی، صہبا، قمر جمالی، ظہور ہاشمی، کامتا پرشاد، جلال قریشی اور حامد سعید خاں وغیرہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔

اسی طرح عصمت نے مہمانان کانفرنس میں صرف یوسف، کرشن چندر، شاہد لطیف، مہندر ناتھ، مجروح، عادل رشید، ظفر، ادھو کمار اور عسکری کا ہی ذکر کیا ہے، جو صفیہ کے بیان کردہ اشخاص کی تعداد سے کم ہے۔ عصمت نے اپنے رپورتاژ میں علامہ سید سلیمان ندوی، شاہ میر راہی، تاباں، عرش، اسد وغیرہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ یہ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ان میں علامہ سلیمان ندوی جنھوں نے ترقی پسند کانفرنس کا افتتاح کیا تھا اور ایک اہم خطبہ بھی پیش کیا تھا، جس کا ذکر صفیہ نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے، بلکہ ان کے خطبۂ افتتاحیہ کی اہمیت، طرز گفتگو اور اس کے مثبت نتائج اور منفی اثرات وغیرہ کو دل کش پیرایۂ بیان میں ذکر کیا ہے، ساتھ ہی ان کے خطبے پر اپنا علمی وتنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ لیکن عصمت نے اپنے رپورتاژ میں علامہ ندوی کا کانفرنس میں شرکت کے حوالے سے سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔

اسی طرح عصمت نے اپنے رفقائے سفر میں تاباں کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اپنے رپورتاژ میں کانفرنس کے ذیل میں ان کا کوئی ذکر ہے، جب کہ صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں تاباں کا ذکر متعدد مقامات میں کیا ہے۔ مثلاً ممبئی ٹیم کی آمد اور ان کی رہائش وغیرہ کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''کرشن، تاباں، مجروح، مہندر سبھی اسی گاڑی سے آئے اور حامد سعید خاں کی سپردگی میں پہنچا دیے گئے''۔ (اردو میں رپورتاژ نگاری، ص:122، مرتب: عبد العزیز، مطبع: رہبر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی-2005)

جیسا کہ اسما کے مختصرات کا ذکر آچکا ہے کہ عصمت کے رپورتاژ میں ناموں کے سلسلے میں وضاحت ملتی ہے ؛مثلاً صفیہ کے رپورتاژ میں 'اختر' نام کا بار ہا ذکر آیا ہے،لیکن صحیح طور پر یہ نام متعین نہیں ہو پا رہا ہے کہ اس سے مراد کون ہے؟ البتہ اس کی تصریح عصمت کے رپورتاژ میں ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد اختر سعید ہیں۔ اس لیے کہ 'اختر' کے لاحقے کے ساتھ کل ہند کانفرنس کے شرکا اور میزبانوں میں کئی نام شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصمت نے اختر کے لاحقہ رکھنے والے ناموں کو مکمل نام کے ساتھ ذکر کا اہتمام کیا ہے۔ مثلاً جاں نثار اختر، صفیہ اختر اور اختر سعید۔

عصمت اور صفیہ کے رپورتاژوں کے مطالعے سے کانفرنس کے منتظمین و شرکا اور مہمانان و مندوبین کے اسما کی تعداد میں بھی کمی بیشی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں کانفرنس کے منتظمین، معلونین، رضاکاران اور مندوبین سمیت سب کا ذکر کیا ہے، بلکہ بعض منتظمین کی الگ الگ ذمے داریوں اور سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں علی سردار جعفری کی گرفتاری اور مجبوریِ حالات کی وجہ سے ان کے شریک کانفرنس نہ ہونے کے علاوہ مزید تین نمایاں شخصیات یعنی احتشام، فراق اور مجاز کا بھی ذکر کیا ہے، بلکہ ان کی پرزور دعوت کے باوجود کانفرنس میں ان کی عدم شرکت پر کافی افسوس کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پہ تحریر کرتی ہیں:

''فراق کی آمد کی خواہش سب کو بے اندازہ تھی۔ فراق صاحب آئیں گے۔ اپنی' آہٹوں کی شاعری' سے بھوپال میں جادو جگائیں گے، مقالہ پڑھیں گے، تقریر بھی کریں گے۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو کارآمد بن سکے گا۔ احتشام صاحب کی تنقید سے مارکس کا جدلیاتی فلسفہ اور ان کی شخصیت سے لکھنوی لطافت کی خوشبو کا انتظار تھا۔ شاعر بزم دلبراں مجاز کی شوخ گفتاری کے چرچے ابھی سے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان تینوں کی آمد سے آخر میں کانفرنس محروم رہ گئی''۔ (ایضاً، ص:121)

لیکن عصمت کے رپورتاژ سے معلوم ہوا کہ کانفرنس میں دعوت کے باوجود شریک نہ ہونے والوں میں کیفی اعظمی اور نیاز حیدر بھی شامل تھے جو کسی مجبوری کی وجہ سے کانفرنس میں نہیں آسکے تھے، جیسا کہ عصمت چغتائی نے جعفری کی گرفتاری اور اس کی وجہ سے ترقی پسند مصنفین کے حلقے میں صف ماتم بچھنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے رپورتاژ میں ایک مقام پہ بیان کیا ہے:

''جعفری نے بڑا گھر بسایا۔ کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے نام وارنٹ، بھوپال کے مشاعرے کا تو مرثیہ لکھ گیا''۔ (ایضاً، ص:122)

عصمت کے رپوتاژ سے یہ معلوم ہوا کہ ساحر بھی بھوپال کی کانفرنس میں مدعو تھے، لیکن نہیں پہنچ سکے تھے، جیسا کہ یہ ایک مقام پہ رقم طراز ہیں:

'' مجاز اور ساحر جن کی جوش صاحب کے ساتھ آنے کی اُمید تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ نہ آسکے۔ ساحر کو تو بخار آرہا تھا اور مجاز...... ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی غیر حاضری کا تو اب ہمیں عادی

ہوجانا چاہیے‘‘۔(ایضاً،ص:111)

اس طرح مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ عصمت نے اپنے رپورتاژ میں کانفرنس میں غیر حاضر ہونے والوں میں جعفری کے علاوہ کیفی اعظمی، نیاز حیدر، ساحر اور مجاز چار اشخاص کا ذکر کیا ہے۔البتہ انھوں نے اپنے رپورتاژ میں احتشام اور فراق کی کانفرنس میں شرکت یا عدم شرکت کا کہیں کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جب کہ صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں کانفرنس میں ان کی عدم شرکت پر اظہار افسوس کیا ہے۔تاہم یہ بھی ہے کہ صفیہ نے رپورتاژ میں جعفری کے علاوہ احتشام، فراق اور مجاز یعنی تین ہی ارباب علم وفن کا ذکر کیا ہے اور ساحر، کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کا سرے سے ذکر نہیں کیا ہے۔

✪ علی سردار جعفری کی کل ہند کانفرنس میں عدم شرکت پر افسوس کا اظہار صفیہ اور عصمت دونوں کی تحریروں میں ملتا ہے۔صفیہ نے ذاتی طور پر ان کے بارے میں اظہار افسوس وغم تو کیا ہی ہے، ساتھ ہی صدر انجمن کے خطبے کے اس حصے کا بھی خصوصیت سے ذکر کیا ہے، جس میں جعفری کے حوالے سے خلوص ومحبت اور تعلق خاطر وغیرہ کا بیان ہے۔اسی طرح سے عصمت نے بھی اپنے رپورتاژ میں جعفری کی گرفتاری پر غم وافسوس کرتے ہوئے ترقی پسند مصنفین کے جعفری کے تئیں جذبات واحساسات کو بھی بیان کیا ہے۔

✪ مجروح کی ہونے والی شادی کا ذکر عصمت اور صفیہ دونوں نے کیا ہے اور دونوں نے ہی مجروح پر طنز آمیز تبصرہ کیا ہے اور ان کے ساتھ پر لطف مزاح بھی کیا ہے۔جیسا کہ صفیہ مجروح کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں:

’’مجروح جن کی شادی کو دو چار ہی دن رہ گئے

تھے، عورت کے موضوع سے غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے‘‘۔(ایضاً،ص:132)

اسی طرح عصمت نے بھی اپنے رپورتاژ میں مجروح کی شادی کا ذکر کیا ہے اور سفر کے دوران ان سے تفریح ومزاح کی باتوں کو بھی بیان کرتی ہیں، بلکہ عصمت نے مجروح کی دلہن اور شادی کے بعد کی مشکلات وغیرہ کے بارے میں دلچسپ گفتگو کی ہے۔چناں چہ لکھتی ہیں:

’’مجروح ایک تو ترقی پسند شاعروں کے نمائندے بن کر جارہے تھے، کیوں کہ اللہ کے دیے ایک وہی باقی بچ گئے تھے۔دوسرے دولہا بن کر بھی جارہے تھے، کیوں کہ بھوپال سے انھیں سیدھے اپنی برات میں شرکت کرنے کے لیے جانا تھا۔لیکن وہ نہایت کھرے پن سے جھینپ رہے تھے جیسے اگر وہ دولھا بن گئے تو انقلاب نہ لا سکیں گے۔شادی بذات خود ایک رجعت پسندانہ فعل ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں کہ فریق مخالف گاؤں کی ایک نا خواندہ، الھڑ دلھن ہو، جیسی کہ مجروح کے پلے باندھی جارہی تھی‘‘۔(ایضاً،ص:104)

عصمت نے مجروح کی ہونے والی شریک حیات کے ساتھ اپنی فکرمندی، ہمدردی اور رحم دلی جتاتے ہوئے ان کو نیک مشورے بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں اور مجروح کے غم جاناں کے بارے میں خدا سے دعا والتجا وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

’’میں سوچنے لگی۔یہ کیا بات ہے۔یہ ادیب اور شاعر گاؤں کی بھولی بھالی الھڑ دوشیزہ کو صرف تخیّل کی دنیا میں اچھالتے ہیں اور جو زندگی میں آمنا سامنا ہوجائے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔یہ کیوں......؟ ان مردوں کو اپنے سارے کارناموں کا الزام عورت کے سر تھوپنے میں کیا مزہ آتا ہے......اور میں نے دعا مانگی کہ خدا کرے گاؤں کی ننی نویلی دلھن جلد ہی داؤ پیچ سیکھ جائے اور مجروح کے دل کو دوچار ایسے اڑنگے لگائے کہ ایک بار واقعی غم جاناں پھیل کر غم دوراں ہوجائے‘‘۔(ایضاً،ص:5-104)

✪ دونوں نے مہمانان ومندوبین کی بشری کمزوریوں کو واشگاف کیا ہے اور ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے ان کو ہدف ملامت اور نشانۂ تنقید بھی بنایا ہے۔

✪ جس طرح عصمت نے موقع بہ موقع رپورتاژ میں مندوبین کانفرنس کے اہم بیانات ونکات کو پیش کیا ہے، اسی طرح صفیہ نے بھی اپنے رپورتاژ میں مفید باتوں اور گراں قدر پیغامات کو نذرِ قارئین کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔

✪ ممبئی کے مہمانانِ کانفرنس کو ٹھہرانے کے بارے میں عصمت اور صفیہ دونوں کی باتوں میں تضاد پایا جارہا ہے۔چناں چہ عصمت بیان کرتی ہیں:

’’بھوپال کے اسٹیشن پر لوگ استقبال کو موجود تھے۔میں اور شاہد، جاں نثار اختر کے یہاں پہنچا دیے گئے۔ عادل رشید اپنی سسرال چلے گئے اور کرشن چندر اور مہندر وغیرہ کو اختر سعید لے گئے‘‘۔(ایضاً،ص:105)

جب کہ صفیہ لکھتی ہیں:

’’عصمت آئیں کنبے سمیت اور اپنے میزبان مکرم کو سوتا پایا۔شاہد لطیف کی آمد انجمن کے تقویت کا باعث تھی۔کرشن، تاباں، مجروح، مہندر سبھی اسی گاڑی سے آئے اور حامد سعید خاں کی سپردگی میں پہنچا دیے گئے‘‘۔
(ایضاً،ص:122)

صفیہ کی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ انھوں نے کانفرنس کے حوالے سے انتظامی امور کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

’’حامد سعید خاں صاحب نے اپنے وسیع دامن عاطفت میں بروں بھلوں سب کو پناہ دینے کا وعدہ کر کے قیام اور طعام کا انتظام اپنے ذمے لیا‘‘۔(ایضاً،ص:122)

✪ عصمت نے کانفرنس کی مختلف نشستوں اور ہر ایک کے صدر اور خطبۂ صدارت کا ذکر کرتے ہوئے ہر ایک کے موضوع کی اہمیت وافادیت، سامعین وحاضرین پر اس کے اثرات اور ان کے علمی وادبی پیغامات وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے اور ان پر اپنا علمی نقد وتبصرہ بھی پیش کیا ہے لیکن انھوں نے دوسرے دن کے اجلاس کی ایک نشست کے صدر شاہد لطیف کے منصب صدارت اور ان کے پیش کردہ خطبے کا ذکر تو کیا، مگر اس پر کوئی تبصرہ وغیرہ نہیں کیا اور نہ ہی اس امر کو واضح کیا کہ شاہد نے علی سردار جعفری کی غیر موجودگی میں ان کی صدارت کی ذمے داری انجام دی ہیں۔بلکہ صرف یہ کہہ کر اپنے نوکِ قلم کو روک لیا:

’’دوسرے دن شاہد لطیف نے جلسہ کی صدارت کی‘‘۔(ایضاً،ص:106)

جب کہ صفیہ نے صراحت کے ساتھ جعفری کی غیر حاضری کی وجہ سے شاہد کے ذمے منصب صدارت ہونے کا ذکر اور اظہار کیا ہے۔چناں چہ صفیہ اپنے رپورتاژ میں لکھتی ہیں:

’’26 جنوری......کو جعفری کے گرفتار ہوجانے سے سہ پہر کی میٹنگ کی صدارت کا قرعہ شاہد لطیف کے نام نکالا گیا‘‘(ایضاً،ص: 125)

صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں کانفرنس کی خاص نشستوں میں 'ڈرامہ' کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اس میں حصہ لینے اوراس فن پر اپنے مقالات پڑھنے والوں میں صرف ابراہیم یوسف ہی کا ذکر کیا ہے، ظفر کا کہیں کوئی ذکر نہیں کیا، جب کہ ڈرامہ نگاری پر ظفر نے بھی اپنی نگارشات اورتخلیقات کو پیش کیا تھا، جیسا کہ عصمت دوسرے دن کے اجلاس اورصدارت کے ذیل میں لکھتی ہیں:

''ظفر صاحب نے اپنا ایک ڈرامہ پڑھا۔ لیکن مائیکروفون کا دماغ آج پھر ساتویں آسمان پر تھا۔ دوسرے ڈرامہ ذرا طویل تھا۔ بہتیرے موصوف نے اسے مقررہ وقت میں ختم کرنے کی غرض سے بے حد سرپٹ پڑھا''۔(ایضاً،ص:106)

✪ عصمت کے رپورتاژ سے اندازہ ہوا کہ قومی کانفرنس کے علاوہ کچھ نجی نشستیں بھی ہوئی تھیں۔ مثلاً 29ر جنوری کو حامد سعید خاں کے یہاں شعرا وادبا اور مہمانان کانفرنس کا ایک بڑا تاریخی جمگھٹا ہوا تھا، جس میں مہمانانِ کانفرنس اورترقی پسند ادبا و مصنفین نے اپنے اپنے طور پر اپنے علمی وادبی خیالات ونظریات پیش کیے تھے۔ صفیہ نے اس واقعہ کوتفصیل کے ساتھ رپورتاژ میں جگہ دی ہے۔ لیکن عصمت نے اپنے رپورتاژ میں حامد سعید کے یہاں منعقدہ گھریلو پروگرام پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جب کہ وہ بھی اس جمگھٹے میں شریک تھیں، جیسا کہ صفیہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

اسی طرح صفیہ اختر کے گھر میں ایک ذاتی نوعیت کا مشاعرہ بھی ہوا تھا اور یہ جوش ملیح آبادی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، جیسا کہ عصمت جوش کی صدارت میں صفیہ کے گھر میں ہونے والے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''رات کوقریب کے کمرے سے جوش صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئےگھریلو مشاعرے نے ہم لوگوں کو بھی کھینچ بلایا''۔(ایضاً،ص:112)

لیکن صفیہ نے اپنے رپورتاژ میں خود اپنے یہاں ہونے والے گھریلو مشاعرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح عصمت نے اپنے رپورتاژ میں حامد سعید خاں کے یہاں ادبا و مفکرین پر مشتمل ہونے والی خاص نشست اور اہم مجلس کا ذکر نہیں کیا ہے اوراس میں شامل مختلف اربابِ زبان وادب کے افکارونظریات کے بارے میں کہیں کچھ ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ان کے رپورتاژ میں اس امر کا ذکر ہے کہ ادبی کانفرنس کے علاوہ نجی طور بھی کچھ تفریحی مجلسیں قائم ہوئی تھیں اوران پر تبصرے بھی ہورہے تھے۔

✪ ساتھ ہی صفیہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک اجلاس کے بعد دوسرے اجلاس کے لیے شائقین و ناظرین منتظر رہتے تھے اور گزشتہ اجلاس پر اپنے اپنے تاثرات اورخیالات بھی پیش کررہے تھے۔

✪ کانفرنس کی بعض نشستوں کی ناکامی وغیرہ کے بارے میں بھی انھوں نے اظہارخیال کیا ہے۔

✪ عصمت نے رپورتاژ میں ذکر کیا ہے کہ زنانہ و مردانہ نشستیں اورانتظامات الگ الگ تھے، جیسا کہ بیان کرتی ہیں:

''ہال کے ایک کونے میں پردے کا انتظام تھا۔ مردانے میں بھیڑ کم تھی، مگر زنان خانے میں کافی گہما گہمی تھی''۔(ایضاً،ص:105)

لیکن صفیہ نے اس حوالے سے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

✪ عصمت نے رپورتاژ میں جا بجا صفیہ سے اپنی چشمکوں اوردونوں کے درمیان ہونے والی تفریحی باتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ میں اپنے خیالات و نظریات کواجاگر کرتی ہیں۔ چناں چہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جاتے وقت میری اورصفیہ کی کسی نہایت ہی معمولی بات پر کھٹ پٹ ہوگئی۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے خمیر میں تیزابیت بہت ہے اور میں کہتی تھی کہ اسے بناتے وقت فرشتوں نے مٹی کو بجائے سادہ پانی کے شہد اور دودھ میں گوندھ ڈالا تھا۔ ہم ایک دوسرے کواحمق کہتے سمجھتے ہوئے منٹو ہال پہنچ گئے''۔
(ایضاً،ص:105)

صفیہ جہاں کانفرنس کے شرکا اوراس میں حصہ لینے والوں میں تھیں، وہیں اس کے خاص منتظمین میں سے بھی تھیں۔ کانفرنس کے آغاز واختتام اور بعد کے حالات وواقعات اور اہل بھوپال کے تاثرات وغیرہ کے حوالے سے صفیہ کی باتیں زیادہ اہمیت وخصوصیت رکھتی ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر طلعت گل نے بھی اس کا اظہار کیا ہے۔ چناں یہ لکھتے ہیں:

''بھوپال کل ہند کانفرنس پر ہی صفیہ اختر نے بھی ایک رپورتاژ بعنوان 'ایک ہنگامہ' لکھا۔ اس رپورتاژ کی اہمیت یوں بھی زیادہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر لکھا گیا یہ دوسرا رپورتاژ ہے۔ بھوپال جہاں کل ہند اردو کانفرنس کا انعقاد ہورہا ہے۔ صفیہ اختر اس کے میزبانوں اور منتظمین میں سے ایک ہیں اور بحیثیت میزبان و منتظم ان پر دوہری ذمے داریاں ہیں۔ ان ذمے داریوں کو تمام تر خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہوئے انھوں نے کانفرنس کی بھی تمام کارروائی پر گہری نظر رکھی اور اسے 'ایک ہنگامہ' کے عنوان سے رقم کردیا، چوں کہ وہ منظّم تھیں اور ابتدا تا انتہا

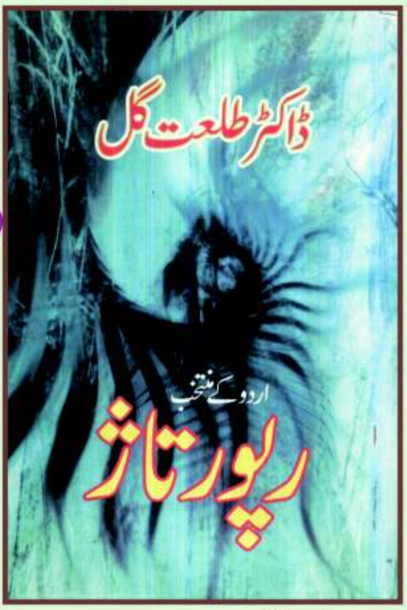

ان کے مدنظر کانفرنس کے بہت سے پہلو رہے۔ لہٰذا ان کے یہاں عصمت کی بہ نسبت زیادہ تفصیل ملتی ہے''۔
(اردو رپورتاژ-تحقیق وتنقید:ص، 127-تصنیف ڈاکٹر طلعت گل، ناشر: کتابی دنیا دہلی-2004)

✪ چونکہ عصمت ایک مہمان تھیں، اس لیے وہ برابر تمام مجلسوں میں شریک رہیں، انھیں لوگوں کی ذہنیت اورفکر ومزاج کو قریب سے دیکھنے اورسمجھنے کا موقع ملا اور پھر انھوں نے ان چیزوں کو صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا۔ خاص طور پر انھوں نے حیدرآباد اور بھوپال کی خواتین کی نفسیات کی جو منظرکشی کی ہیں اور ان کے خلجانات اور شبہات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا ازالہ کیا ہے اوران کے ذہن وفکر کی صفائی کرتے ہوئے جو باتیں بیان کی ہیں، وہ بہت ہی اہم ہیں۔ ڈاکٹر طلعت گل نے تحریر کیا ہے:

''بمبئی سے بھوپال تک' میں عصمت چغتائی جابجا متوسط طبقے کی عورتوں کی نفسیات کی عکاسی کرتی ہیں اور انھیں اپنی تنقید کا نشانہ بناتی نظر آتی ہیں......
(ایضاً،ص:124)

مختصر یہ کہ دونوں ہی رپورتاژ فنی اوراسلوبیاتی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں، کسی پہلو یا واقعے کو اہمیت دینا یا نظرانداز کرنا قلمکاروں کی ذہنی کیفیت یا تحریروں پر منحصر ہے۔ لہٰذا تقابل کا مقصد کسی واقعے یا پیش منظر کو مکمل طور پر پیش کرنا ہے تاکہ ایک دوسرے کے چھوٹے ہوئے پہلوؤں کو مربوط کیا جاسکے۔

■

Mohammad Ansar
D-4/1, First Floor
Shaheen Bagh
New Delhi - 110025

اردو سانٹ میں ہیئت کے تجربے

آیات اللہ آیت

سانٹ اطالوی لفظ 'سانیٹو' سے مشتق ہے۔ 'سانیٹو' کا لغوی معنی مختصر آواز یا راگ ہوتا ہے۔ اصطلاح میں سانٹ مخصوص انداز کی چودہ مصرعوں والی اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص جذبے، احساس یا خیال کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ Rhyme Scheme اور مخصوص ہئیت ہوتی ہے۔ دراصل سانٹ غنائی شاعری کی ایک قسم ہے۔ وحدتِ خیال اور شدتِ احساس سانٹ کے لازمی عناصر ہیں۔ اس میں تسلسل بھی ہوتا ہے جیسا کہ نظم میں ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے سارے اشعار میں ایک طرح کی روانی اور بہاؤ ہوتا ہے۔ عام طور پر سانٹ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چونکہ تسلسل اور مرکزی خیال ہر طرح کے سانٹ میں پائے جاتے ہیں اس لیے اس کی تقسیم ہمیشہ ہئیت اور تکنیک کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ وہ تین قسمیں اطالوی، شیکسپیئری اور اسپنسیری ہیں۔

ان سبھوں میں اطالوی سانٹ سب سے قدیم اور بنیادی ہے۔ اطالوی زبان میں اس کی ایجاد کا سہرا Giacomo da Lentini کے سر جاتا ہے جو Sicilian School کے صدر تھے۔ اس وقت اٹلی میں Frederick 2nd کی حکومت تھی لیکن اس وقت تک سانٹ کی کوئی ادبی اہمیت نہیں تھی۔ Guittone d' Arezzo نے سب سے پہلے اسے ادبی جامہ پہنایا اور تقریباً 250 سانٹ سپردِ قلم کیے۔ اطالوی زبان کے دوسرے مشہور سانٹ نگار Dante Alighieri, Guido Cavalcanti وغیرہ ہیں لیکن اطالوی زبان میں سب سے اہم سانٹ نگار Petrarc ہیں جو انگریزی میں Petrarch کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اس لیے اطالوی سانٹ کو پٹرارکی سانٹ بھی کہا جاتا ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ اطالوی سانٹ کی کوئی ایک ہئیت نہیں ملتی۔ کہیں یہ abba,abba کی پیٹرن میں کہے گئے ہیں کہیں cdecd,cdccdc اور کہیں cdcdcd۔ مثلاً ملٹن کا ایک سانٹ On His " Blindness" abba, abba, cdec, de کی ہئیت میں ہے:

اسی طرح Dante نے بھی بہت سے سانٹ تو پٹرارکی سانٹ کی ہئیت میں لکھے ہیں لیکن کچھ کے لیے انھوں نے نئی ہئیت اختیار کیا۔ مثلاً سانٹ 'O voi che per la via' کے لیے انھوں نے aabaab, aabaab, cddc اور Morte villana کے لیے aabbba, aabbba, cddc,cddc ہئیت اختیار کیا۔ گویا پٹرارکی سانٹ میں ہئیت کے نئے نئے تجربے ہوتے رہے۔ Edmund Spenser نے پھر اس کی ہئیت میں تغیر کیا جو اسپنسیری سانٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے سانٹ abab,bcbc,cdcd,ee کی ہئیت میں ہیں لیکن شیکسپیئر کے زمانے میں جب Thomas Wyatt نے سولہویں صدی میں انگریزی سانٹ کا آغاز کیا تو شیکسپیئر نے ایک نئی ہئیت abab,cdcd,efef,gg کی بنیاد ڈالی۔ اسی ہئیت میں لکھے گئے سانٹ انگریزی یا شیکسپیئری سانٹ کہلائے۔

واضح ہو کہ اردو میں سانٹ دو بندوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پہلے بند میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں اور یہ آٹھ مصرعے آپس میں چار چار مصرعوں کے بند میں منقسم ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا بند مثمن کہلاتا ہے اور دوسرا بند جو چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، مسدس کہلاتا ہے۔ یہ بھی تین تین مصرعوں کے دو بند مثلث میں منقسم ہوتا ہے۔ سانٹ میں کسی ایک جذبہ کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ جذبہ یا خیال کو شاعر مثمن میں پیش کرتا ہے۔ مثمن کے بعد خیال کو ایک نیا موڑ دیا جاتا ہے جس کو گریز کہتے ہیں۔ اگرچہ مثمن میں خیال پوری طرح واضح ہو جاتا ہے لیکن مثلث میں خیال کو پوری شدت اور صداقت سے پیش کیا جاتا ہے۔ گریز کا حصہ نہایت پیچیدہ ہوتا ہے۔ اسی حصے میں شاعر کو اپنی فنی لیاقت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ گریز کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ سانٹ کا مرکزی خیال متاثر نہ ہو اور نہ ہی اس کی دلچسپی میں کوئی کمی ہو۔

اردو میں سانٹ نگاری کی ابتدا عظمت اللہ خان سے ہوئی ایسا کہا جاتا رہا ہے لیکن جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آچکی کہ اردو سانٹ کی ابتدا ڈاکٹر عظیم الدین عظیم آبادی سے ہوئی۔ یہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے بہت سے شعرا اس طرف راغب ہوئے جن میں اختر شیرانی، ن۔م۔راشد، سلام مچھلی شہری، وزیر آغا وغیرہ مشہور ہیں۔ اس وقت کے شعرا صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے سانٹ لکھ رہے تھے۔ یہی وجہ رہی کہ ان میں سے کسی شاعر کا بھی کوئی ایسا مجموعہ نہیں آیا جو خالص سانٹ پر مشتمل ہو۔ ہاں اختر شیرانی کا شعری مجموعہ 'شعرستان' ضرور آیا لیکن اس میں صرف تیرہ سانٹ شامل ہیں جس کو اردو سانٹ کا پہلا شعری مجموعہ نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ اول تو اس میں دوسری اصنافِ شاعری بھی شامل ہیں اور دوم یہ کہ صرف تیرہ سانٹ شامل ہونے کی

بنیاد پر اسے اردو سانٹ کا پہلا مجموعہ نہیں کہا جا سکتا۔ اردو سانٹ کا پہلا مجموعہ 'نغمات' ہے۔ یہ کتاب شائق وارثی کی ہے جو 1942 میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سانٹوں کے خیالات سطحی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان کی سلاست اور روانی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

قابلِ ذکر ہے کہ جب یہ صنفِ شاعری انگریزی سے اردو میں آئی تو اسی زمانے میں اس کی ایک نئی ہیئت abba,cddc,effe,gg وجود میں آئی جو آج تک رائج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ہیئت بہت حد تک انگریزی ہیئت سے ملتی جلتی ہے کیونکہ انگریزی ہیئت میں ہی تھوڑی بہت تبدیلی سے اردو سانٹ کی ہیئت بنائی گئی ہے۔ اردو سانٹ کی ہیئت کو دیکھنے کے لیے اختر شیرانی کا ایک سانٹ 'عورت' ملاحظہ فرمائیں۔

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے! (a)
مصور کی نظر میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں! (b)
ادب کی محفلوں میں اس کی تحریریں پریشاں ہیں! (b)
مغنی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے ! (a)
نقاب ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے ! (c)
نقوشِ آب وگل میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں! (d)
صنم سازوں کے دل میں اس کی تفسیریں پریشاں ہیں! (d)
حریم رنگ و بو میں نشہ بن کر لہلہاتی ہے (c)
ہر اک تصویر کے رنگوں میں نکہت اس کی آوارہ! (e)
حسیں اور خوشنما اشعار شاداب اس کے نغموں سے (f)
ہمارے بربطوں کے تارے خواب اس کے نغموں سے (f)
بتوں کے مرمریں پردوں میں رنگت اس کی آوارہ! (e)
غرض جب تک یہ دنیا ہے اور اس کی خوشنمائی ہے (g)
ہماری زندگی پر صرف عورت کی خدائی ہے (g)

لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ اردو میں صرف اسی ہیئت میں سانٹ لکھے گئے ہیں۔ اردو میں شیکسپیئری ہیئت میں بھی بہت سے سانٹ لکھے گئے ہیں۔ مثلاً ضیا فتح آبادی، ناظم جعفری وغیرہ کے سانٹ شیکسپیئری ہیئت میں ملتے ہیں۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ وہ اردو سانٹ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جس طرح پٹرارکی سانٹ میں ہیئت کے نئے نئے تجربے ہوئے اسی طرح جب سانٹ انگریزی ادب سے اردو ادب میں آیا تو ابتدا میں شیکسپیئری ہیئت کو ہی اپنایا گیا پھر اس کی الگ ہیئت وجود میں آئی جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ مثال کے لیے ناظم جعفری کا ایک شخصی سانٹ 'غالب' دیکھیے جو شیکسپیئری ہیئت میں ہے۔

معترف ہے یہ زمانہ تری دانائی کا (a)
پیکرِ فہم و فراست کوئی ایسا نہ ہو (b)
''سب کو مقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا'' (a)
یہ حقیقت ہے کہ تجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا (b)
''تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام'' (c)
''تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل'' (d)
جس پہ توضیح تصدق ہو وہ تیرا ابہام (c)
''تیرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل'' (d)
تیرا سینہ رہا احساسِ وفا سے لبریز (e)
سرخیِ خونِ جگر سے رہیں آنکھیں رنگیں (f)
'' تو نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز'' (e)
پر نہ پایا اثرِ نالہ دل ہائے حزیں (f)
کون دے تعزیت مہر و وفا تیرے بعد (g)
شعلۂ فکر سیہ پوش ہوا تیرے بعد (g)

دلچسپ بات یہ ہے کہ حنیف کیفی کے سانٹ بھی اردو سانٹ کے فارم میں نہیں ہیں۔ حنیف کیفی نے اسی abba, cddc, effe,gg فارم کو اردو سانٹ کا فارم قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب 'اردو سانٹ تعارف اور انتخاب' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اردو سانٹ کی یہ نئی ہیئت شیکسپیئری سانٹ کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل ہے جو اب اردو سانٹ کی ہیئت ہے۔ جیسا کہ حنیف کیفی لکھتے ہیں:

''اردو سانٹ کے اس ابتدائی دور میں یعنی 1930 کے بعد کے کچھ برسوں میں جبکہ چند شعرا انفرادی طور پر سانٹ نگاری کے تجربے کر رہے تھے، سانٹ کی ایک نئی ہیئت کا وجود ہوا جو بعد میں اردو سانٹ کی معیاری ہیئت قرار پائی۔ یہ شیکسپیئری سانٹ ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ جیسا کہ سانٹ کی اقسام کی ذیل میں ذکر کیا گیا، شیکسپیئری کی ترتیب قوافی یہ ہے: اب اب، ج د ج د، ہ و ہ و، ز ز۔ جبکہ اس نئی ہیئت کی ترتیب قوافی اب ب ا، ج د د ج، ہ و و ہ، ز ز ہے۔ یعنی شیکسپیئری سانٹ کے ہر مربع میں پہلا مصرع تیسرے مصرع کا اور دوسرا مصرع چوتھے مصرے کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ آخری دو مصرعے شیکسپیئری سانٹ ہی کی طرح ہم قافیہ ہوئے ہیں۔ چونکہ اردو میں سانٹ عموماً اسی ہیئت میں لکھے گئے ہیں اس لیے انگریزی سانٹ یا اطالوی سانٹ کی طرح تکنیکی اعتبار سے اسے اردو سانٹ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اردو سانٹوں کے منتشر مواد کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ سانٹ کی اس نئی ہیئت کی ایجاد کا سہرا کس شاعر کے سر ہے۔''1

اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں: پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت گرچہ اردو سانٹ کی یہ ہیئت وجود میں آئی ہوگی مگر اس ہیئت میں کم ہی سانٹ لکھے گئے ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حنیف کیفی صاحب سانٹ کی ہیئت کا بخوبی تجزیہ نہیں کر سکے کیونکہ اگر وہ ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ اردو سانٹ کی ہیئت abba,cddc,effe,gg ہے اور دوسری طرف خود ان ہی کے سانٹ اس ہیئت میں نہیں ہیں تو کہیں نہ کہیں ضرور کوئی چوک ہوئی ہے ان سے۔ ان کی یہی چوک ہمارے ذہن کے دروازے پر بحث کی دستک دے رہی ہے۔ مثلاً ان کا سانٹ ''ماں اپنے معصوم بچے سے'' دیکھیے۔

اے مرے چاند، مری آنکھ کے تارے، مرے لال (a)
اے مرے گھر کے اجالے، مرے گلشن کی بہار (b)
تیرے قدموں پہ ہر اک نعمتِ کونین نثار (b)
ہو ستاروں کی بلندی پہ ترا استقبال (a)
تیری منزل بنے انسان کی معراج کمال (a)
تیری محفل میں ہو دوشیزۂ گیتی کا سنگار (b)
تیرا مقصود ہے لیلائے تمدن کا نکھار (b)
تیرا مشہود ہو محبوبۂ فطرت کا جمال (a)
کس نے دیکھا ہے مگر، آہ! رخِ مستقبل (c)
کب دھواں بن کے بکھر جائے یہ نیرنگِ مجاز! (d)
رنگِ محفل ہی الٹ دے نہ بساطِ محفل! (c)
شدتِ نغمہ ہی بن جائے نہ ویرانیِ ساز! (d)
افردا کے تصور سے لرز جاتا ہے دل (c)
کیا دعا دوں مرے بچے ہو تیری عمر دراز! (d)

حنیف کیفی کا یہ سانٹ abba abba cdcd cd کی ہیئت میں ہے جو اردو سانٹ کی ہیئت نہیں ہے۔ اب اردو زبان سانٹ کو ایک نئی ہیئت یعنی abba, cddc, effe, gg کے ساتھ اپنے اندر جذب کر چکی ہے۔ پھر بھی اس کی اہمیت ابھی تک ایک ذیلی صنفِ شاعری کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی کے بعد بے شمار سانٹ لکھے گئے اور اردو سانٹوں کے کئی مجموعے منظر عام پر بھی آ چکے ہیں۔ مثلاً عزیز تمنائی کا 'برگ نو خیز' 1963 میں، ناظم جعفری کا 'تنویر خیال' 1978 میں وغیرہ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ خوبصورت صنفِ شاعری آج بھی کہنہ مشق اور تجربہ کار شاعروں کی توجہ کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی ہے۔

1: حنیف کیفی، اردو سانٹ تعارف اور انتخاب، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، 1987، ص:30

■

Md. Aayatullah Ashraf
H. No: 18, Gali 05
IInd Floor, Ghaffar Manzil
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 7011055039

رضیہ خاتون

مسرور جہاں
تہذیبی اقدار کے آئینے میں

''گھر کی چہار دیواری میں رہ کر اپنی محنت اپنی لگن، اپنی ریاضت سے مسرور جہاں نے اس منزل کو پالیا۔ جسے پانے کے لیے سب ادیبوں کے دل مچلتے رہتے ہیں'' (خواب در خواب سفر، ص10) رتن سنگھ کا یہ قول مسرور جہاں کی شخصیت کی عقدہ کشائی کے لیے کافی ہے جنھوں نے اپنی مسلسل جہد و کاوش سے واقعی وہ مقام حاصل کرلیا جس تک رسائی ہر کس و ناکس کے لیے ناممکن ہے۔ مسرور جہاں نے 500 سے زائد افسانے اور تقریباً 65 ناول قلم بند کیے جو ان کی زودنویسی کے ساتھ ان کے اعلیٰ ذوق کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ مستورات جن کے لیے سماج میں موجود کٹر لوگوں نے تعلیمی شعبوں کو مقفل کر دیا تھا اور ان کی حیات فقط گھریلو زندگی کو سنوارنے اور گھریلو مسائل میں جکڑ کر رہ جاتی تھی اسی صنف نازک نے جب تعلیمی میدان میں قدم بڑھایا تو اپنی محنت و لگن سے فتح کے ہر اس مقام کو حاصل کرلیا جس کا تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔ عورت کی ذہنی بیداری اور عصری حسیت نے مسرور جہاں کو فکشن کے اس چمکتے ستارے کی مانند بنا دیا جو ہمیشہ اپنی تابناکی بکھیرتا رہے گا۔

مسرور جہاں نے سماج کی دم توڑتی اقدار حیات اور مٹتی تہذیب کا کرب بہت قریب سے محسوس کیا انیسویں اور بیسویں صدی کے لٹتے سرمایے میں جو قیمت مسلم اور خاص کر متوسط طبقے کو ادا کرنی پڑی اس کا احساس مسرور جہاں کو فکشن کی اس دنیا میں لے آیا جہاں انھوں نے تہذیبی زوال اور اخلاقی اقدار کی تصویر سادگی اور حقیقی رنگ میں پیش کی کیونکہ یہی زوال سماجی زندگی سے گزر کر رفتہ رفتہ گھروں کے اندر اس طرح داخل ہو گیا تھا کہ آج سرِ عام اس کے برہنہ مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

اپنی جڑوں سے بے رغبتی اور نئی تہذیب کی جانب عوام کی اندھی دوڑ نے مسرور جہاں کے درد کو مزید گرمایا اور ہر کامیاب ادیب کی مانند انھوں نے اپنی تحریروں میں اپنے دل میں اٹڈ رہے طوفان پر قابو رکھ کر نہایت سادگی کے ساتھ اخلاقی زوال اور دم توڑتی تہذیبی اقدار کو صفحۂ قرطاس پر اتار دیا۔

''برسوں بعد وہ اپنے شہر آیا تھا۔ اسے اپنا ملک چھوڑے نہ جانے کتنے ماہ و سال بیتے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ جب وہ گیا تھا تو بیس، اکیس سال کا نوجوان تھا اور یہ شہر بھی پوری طرح جوان نہیں ہوا تھا۔ عمارتیں، سڑکیں، گلیاں آج کی طرح خوبصورت نہیں تھیں۔ یہ اونچی اونچی عمارتیں، جگ مگ کرتے بازار، پختہ اور ہموار سڑکیں، سرسبز پارک گویا ایک نیا شہر وجود میں آگیا تھا۔ اوبڑ کھابڑ گلیاں کھڑنجہ لگا کر سنواری گئی تھیں۔ انھیں گلیوں میں اس کا مکان تھا۔ لیکن اب یہ گلیاں اجنبی ہو گئی تھیں۔ اور اس کا گھر کہیں کھو گیا تھا ساری نشانیاں غائب تھیں۔'' 1

مسرور جہاں نے چونکہ پرانی متاع حیات کو مٹتے دیکھا اسی لیے ان کے یہاں بدلتے ہوئے کلچر کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پرانی عمارتوں کے انہدام کا کرب، رسم و رواج کی فنا کا ماتم، اخلاقی قدروں کے زوال کا احساس، پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب کا غلبہ، زندگی کے بدلتے آداب و اطوار کا نقشہ ان کی سطروں میں اس لاوے کی مانند موجود ہے جو اندر ہی اندر انسانیت کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ خاص طور پر لکھنؤ کی عظمت پارینہ جو لکھنوی طرز معاشرت کا اقبال بلند کرنے کے بعد رفتہ رفتہ محلات، حویلیوں، بالا خانوں، عشرت گاہوں، شہزادیوں کے آنگن، بارونق بازار، ناز و ادا کی محفلوں کو تابناکی عطا کرنے کے بعد مادی اور مشینی عہد کی نذر ہو گئیں تھیں جس کا برملا اظہار ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

''دونوں فرقے کے بزرگ اس نئی صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ انھیں ان سر پھرے نوجوانوں کے ہاتھوں اس شہر کی پرانی تہذیب اور بھائی چارے کی روایت کا خون ہوتے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ لیکن نیا خون اتنا گرم تھا کہ بزرگوں کے سمجھانے بجھانے سے اس کا ٹھنڈا

ہونامشکل ہی نظر آتا تھا۔''2

''آپس میں بھائی چارہ اورمحبت ایسی کہ شادی بیاہ میں باورچی اورحلوائی آمنے سامنے بیٹھ کر پلاؤ، متنجن، شیرمال، کباب قورمہ بریانی پوری کچوری اورمٹھائی بناتے تھے مگر دیکھنے والوں کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ اصل میزبان کون ہے۔ہولی، دیوالی اور بقرعید کی رونق دونوں فرقوں کے دم سے تھی۔لیکن زمانے کی رفتار بدلی تو سب کچھ بدل گیا۔پھر ایک وقت ایسا آیا، جوصدیوں کے ہمسایے ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے''3

تہذیب کی اسی بدلی ہوئی صورت حال نے ان کو متاثر کیا کیونکہ انھوں نے نہ صرف سماج کو بہت قریب سے دیکھا تھا بلکہ اس میں سانس لیتی ہوئی زندگی کا بغور مطالعہ بھی کیا جس کی عکاسی ان کے افسانوں اور ناولوں ''دھوپ دھوپ سایہ، پل صراط، کہاں ہوتم، خواب در خواب سفر، گردشیں، ہمیں جینے دو، کل کی سیتا، آج کی سیتا، چراغ پھولوں کے، تیرے میرے دکھ، اللہ تیری قدرت، جینے کے لیے، دھوپ چھاؤں، سمندر سیپ اور ساحل، مہکتا آنچل، راستے اور منزل، پرندے کا سفر، میں ساحلوں کی صدا، پاکیزہ آنچل، نامحرم، ناگ پھنی، لیلیٰ مجنوں، سچ کے سوا، پچھلا دروازہ، بوڑھا یوکلپٹس، نئی بستی، درد کے الاؤ، گردشیں، پیار کی خوشبو، دھوپ چھاؤں، آواز نہ دو، آشیانہ، نئی امنگیں وغیرہ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مسرور جہاں نے بڑی ہی سادگی اور دیدہ ریزی سے سماج میں بکھرے ان مسائل کو چنا جن سے معاشرہ جوجھ رہا تھا۔ان کے فکشن کا مواد عام زندگی میں درپیش مسائل پر منحصر ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت جلد شہرت کا تاج ان کو نصیب ہوا۔ بے جوڑ شادی، جہیز کی بڑھتی ہوئی خواہش اوراس کے منفی اثرات، نئی تعلیم کے مثبت اورمنفی پہلو، اپنی اصل سے جدا ہونے کا غم، لاوارث اور نچلے طبقوں میں پل رہے بچوں کے مسائل، شہوت پرستی، شراب نوشی، سود خوری، مسلم سوسائٹی میں بڑھتی ہوئی طبقاتی کشمکش، ضمیر کی موت، انسانیت کا قتل، رشتوں کا خون، غیرمحرم سے نہ صرف کنواری لڑکیوں کی بے راہ روی کے قصے بلکہ شادی شدہ افراد کی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے ناجائز رشتوں کا سہارا لینا، غرض سوسائٹی میں پھیل رہے وہ تمام منفی تصورات جو اخلاق کو پستی کی منزل کا راستہ دکھا چکے ہیں ان پر انگشت نمائی کی ہے چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''سنا ہے کہ تم بہت پڑھی لکھی ہو۔لیکن تمھاری پڑھائی کا گھمنڈ یہاں نہیں چلے گا۔تمہارا کام تو میری اور میرے گھر والوں کی سیوا کرنا ہے۔سواس میں کمی نہ آئے۔ورنہ۔آگے تم خود سمجھ دار ہو۔''

''دوسری بار میرا پاؤں بھاری ہوا تو ساس نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اس بار لڑکی ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔میری نظروں میں مٹی کے تیل کا وہ کنستر ناچ گیا جو رسوئی گھر کے ایک گوشے میں لبالب بھرا رکھا رہتا تھا۔مجھے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا''4

''ڈارلنگ! کچھ نہیں ہوگا۔سب ہی عورتیں ماں بنتی ہیں۔تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔اس کے بعد تم پہلے سے زیادہ حسین ہوجاؤ گی۔

میرے فیگر کا ستیاناس ہوجائے گا۔مجھے تو یہ سوچ کر ہول آنے لگتا ہے۔کرن نے جھرجھری لی۔

کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم فی الحال بچے کا خیال چھوڑ دیں۔

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔اب خیال چھوڑنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تم آدھی ماں بن چکی ہو۔

میرا مطلب ہے کہ میں ابارشن کرالوں۔

وہاٹ۔تمھارا دماغ تو درست ہے؟۔وجے چیخ اٹھا۔''5

سماج میں پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل کو ان کی تحریروں کے ذریعے بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔مشترکہ خاندان جو کسی عہد میں خوشی وغم میں برابر شریک ہوتا تھا آج وہ ایک مکان یا فلیٹ میں اس طرح تبدیل ہوگیا کہ خود مکان مالک کی آواز بھی اسی کے اندر سمٹ کر رہ گئی ہے، تنہائی کے بڑھتے ہوئے احساس کو بھی مسرور جہاں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے خود عوام نے مغربی چمک کو قبول کیا اور دیرینہ قدروں کا اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور نہایت افسوس ہے کہ آج ہم ان قدروں کو دفن کر رہے ہیں اور آئندہ آنے والی جماعت کو احساس بھی نہ ہوگا کہ اس ملک میں کبھی کوئی تہذیب موجود بھی تھی یا نہیں۔مسرور جہاں کا یہ قول حقیقت بر مبنی ہے کہ:

''وقت کتنا تیز گام ہے کہ ایک پل نہیں ٹھہرتا اور ظالم ایسا کہ کسی کے دکھ سکھ کا بھی خیال نہیں کرتا۔ بس آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے، خوشیوں کو روندتا، دکھوں کو سمیٹتا، نہ پیچھے چھوٹنے والوں کی فکر، نہ ساتھ چلنے والوں کا لحاظ، ایک دن پھول بیگم نے حساب کتاب کیا تو پتہ چلا آغا صاحب کو جدا ہوئے برسوں بیت گئے''6

وقت کی تغیر پذیری کا احساس ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے اور خاص طور پر یہ تبدیلی اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ دنیا کس برق رفتاری سے بدل رہی ہے اور ہم غفلت کی چادر اوڑھے پڑے ہیں اسی احساس نے مسرور جہاں کو بے چین کر دیا وہ خود کہتی ہیں ''کیا ہمارا زوال پزیر معاشرہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ ہماری پرانی تہذیب، رسم ورواج، زبان، رہن سہن، اقدار، حد ہے کہ امکانات تک معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔اگر ہم مڑ کر پچاس ساٹھ سال پہلے کے دور پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ فرق نمایاں طور پر نظر آئے گا'' (چہارسو: راولپنڈی میں شائع انٹرویو)

تہذیبی زوال ظاہری عناصر کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ داخلی واندرونی احساسات کا بھی خون کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا فقط بازار مکان اور سازوسامان کا نقشہ ہی تبدیل نہیں ہوا اور نہ ہی قدیم محلات کی دیواروں کو گرا کر نئی عمارتوں کی تعمیر ہوئی بلکہ انسانی زندگی کی وہ اخلاقی اقدار جو تہذیب کا پیش خیمہ تھیں جن میں تہذیبی جڑیں

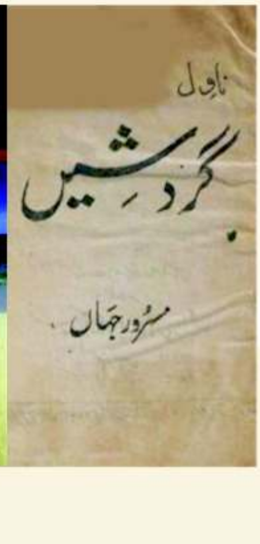

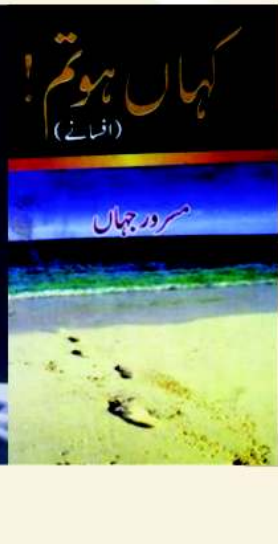

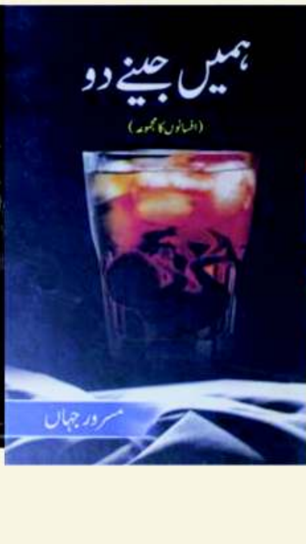

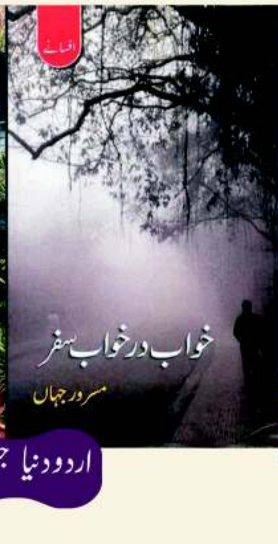

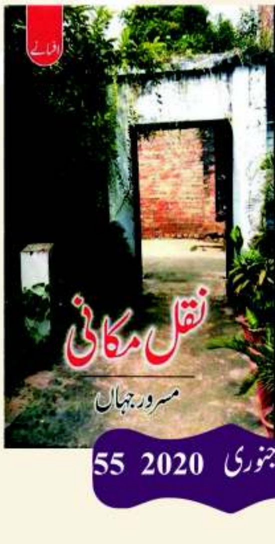

پیوست تھیں اخلاق وتہذیب کی وہ امر بیل جو پورے سماج میں زندگی کی روح پھونک رہی تھی اس کو بھی نئے اور پیچیدہ مسائل اور بدلتی ہوئی اقدار نے کھوکھلا کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر نامہ بدل گیا اسی متبدل سماج میں دن بہ دن پیدا ہوتے مسائل کو مسرور جہاں نے کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے جو ان کی گہری بصیرت کی غمازی کرتا ہے۔ بقول وقار ناصری:

''ان کے افسانوں میں گمشدہ تہذیبی رشتوں سے لے کر عہد حاضر کے مسائل تک ایسے بہت سے موضوعات ہیں جو اس معاشرے میں موجود ہیں بیانیہ کی کسی پیچیدگی کے بغیر وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے وہ رنگ بھرتی رہیں جن سے ان کے افسانے تخلیقی فکر، افسانویت، حقیقت اور وحدت تاثر کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ انہوں نے عہد زوال کی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور اس سماج کی بھی جو تقسیم اور اس کے بعد کی صورت حال کا زائیدہ ہے''۔7

مسرور جہاں کا انداز بیان بھی ان کی شخصیت کو تابناک بنا دیتا ہے ان کی خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی انقلاب و تیکھے انداز کے اپنی کہانیوں کا تانا بانا نہایت سادگی سے بنتی ہیں جس نے ذہنی احتجاج پیدا کرنے کے بجائے دلوں کو مسحور کر لیا ان کی کہانیاں دل کو ٹھیس پہنچانے کے ساتھ ساتھ ایک کسک بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ ماضی کی سادگی اور موجودہ زمانے کے پر پیچ حیاتی مسائل نرم و سبک انداز سے بیان کرنا انہی کا حصہ ہے۔ مسرور جہاں کی شخصیت روایتوں سے پیوست نظر آتی ہے وہ قدروں کو عزیز رکھتی ہیں بقول مسرور جہاں روایت پسندی تو ہمارے خمیر میں شامل ہے کیونکہ روایت ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ انھیں روایتوں نے ہمیں قلم پکڑنا سکھایا۔ نئی راہوں کی نشان دہی کی اور انھیں روایتوں کی روشنی میں ہمارا قلمی سفر جاری رہا۔ روایتوں سے انحراف دراصل سچائی سے انحراف کرنے کے مترادف ہے۔ (چہار سو: راولپنڈی میں شامل شائع انٹرویو)

ایک بڑے افسانہ نگار کی شناخت اس کی بصیرت کی ان سطروں سے ہوتی ہے جو وہ سماجی زندگی اور افراد کے بیچ سے چن کر اپنی بصارت اور فن کے موتی پرو کر قاری کو حقائق سے دوچار کرواتا ہے مسرور جہاں کی تحریریں حقائق کو بغیر کسی بناؤ سنگار کے پیش کرتی ہیں انھوں نے نسوانی مسائل پر بھی نظر رکھی ہے اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ وہ خود ایک عورت ہیں اس لیے خواتین کی زندگی کے مدوجزر کو بخوبی جانتی ہیں انھوں نے صرف مرد سماج کو ہدف تنقید نہیں بنایا بلکہ عورت کے اخلاق کو زک پہنچانے والے عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو بھی اصلاح کی جانب مدعو کیا ہے۔ مسرور جہاں نے جس عورت کو اپنے فکشن کا کردار بنایا ہے اس کے متعلق عائشہ صدیقی کے الفاظ بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

''ان کے افسانوں کا محور عورت ہے انھوں نے اس کے کردار پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مسائل، الجھنیں اور سکھ دکھ کا بیان ان کے کافی افسانوں میں ملتا ہے ایک خاتون افسانہ نگار ہونے کے ناطے وہ اس کی نفسیات سمجھنے کی کوشش بھی کرتی ہیں اور اس کے گھر سنسار پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں ان کے افسانوں میں زیادہ تر عورت کی پروقار شبیہیں نظر آتی ہیں ساتھ ہی اس وقار اور انا کو مجروح کرتی ہوئی تصویریں بھی پیش کی ہیں لیکن ان کا قلم کہیں بہکا نہیں ہے اور زبان و بیان میں اخلاقی قدروں سے تجاوز نہیں کیا ہے''۔8

> **مسرور جهاں کی تحریریں حقائق کو بغیر کسی بنائو سنگار کے پیش کرتی هیں انهوں نے نسوانی مسائل پر بهی نظر رکهی هے اس کی وجه غالباًیه هے که وه خود ایک عورت هیں اس لیے خواتین کی زندگی کے مدوجزر کو بخوبی جانتی هیں انهوں نے صرف مرد سماج کو هدف تنقید نهیں بنایا بلکه عورت کے اخلاق کو زک پهنچانے والے عوامل کو پیش نظر رکهتے هوئے ان کو بهی اصلاح کی جانب مدعو کیا هے۔**

عائشہ صدیقی کا یہ قول بالکل صائب ہے کیونکہ مسرور جہاں نے عورتوں کے مسائل اور کرب کو اپنے فن میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ یہاں چند اقتباسات سے عورتوں کے جذباتی اتار چڑھاؤ اور سماج میں ان کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ان کے قلم اور افکار کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

''یہ بھی سماج کا ایک المیہ ہے کہ ایک کنواری لڑکی کو بڑی آسانی سے پلے پلائے بچوں کی ماں بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن مرد غیر کے بچے کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ مجبور نہیں ہوتا۔ اور عورت مجبور ہوتی ہے یا بنا دی جاتی ہے۔''9

''پتی ہونے کا مطلب یہ بھی تو نہیں ہے کہ وہ اس کی کوکھ میں پلنے والے اپنے بچے کا بھی خیال نہ کرے۔ جسے اس کے نام کے ساتھ اس دنیا میں آنا ہے۔ اور آج اس نام اور حق کو بنائے رکھنے کے لیے ایک ڈاکو کا دل پسیج گیا۔ وہ چاہتا تو اس کو لوٹ سکتا تھا۔ لٹیرا وہ نہیں۔ پر کاش ہے۔ اس کا پتی۔ جو اس کا ریپ کر رہا تھا۔''10

''کیا پتہ تھا کہ مرد کا وعدہ اتنا کمزور اور بودا ہوتا ہے۔ یہ کہ مرد اتنا ناقابل اعتبار ہوتا ہے کہ سب کچھ بھولنے میں چند لمحوں کی دیر نہیں کرتا۔ ایسے ناقابل اعتبار مرد کو وہ کیوں اپنی زندگی کی باگ دوڑ سونپے۔ اپنے ڈھنگ سے جینا کیا برا ہے''۔11

غرض مسرور جہاں کی شخصیت قابل مبارک ہے جنھوں نے اپنے سادگی بھرے قلم سے تہذیبی و اخلاقی اقدار اور سماج میں درپیش مسائل کے دلدوز قصے حقیقی انداز میں اس طرح بیان کیے ہیں جو اعلی ادبی مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں شارب ردولوی کا یہ قول بھی ان کے قلم اور درجۂ عزت کے تعارف کے عین مطابق ہے۔

''مسرور جہاں کے افسانوں کا حسن ان کی سادگی میں پوشیدہ ہے ان کی زبان مثالی طور پر سادہ اور پرکشش ہے وہ بڑی معصومیت کے ساتھ کہانی کہتے کہتے ایک ایسا جملہ لکھ جاتی ہیں جو کہانی کو ایک نیا موڑ دے دیتا ہے اور افسانے کو واقعہ نگاری بننے سے بچالیتا ہے۔''12

حواشی:

1. انتظار کی صدی مجموعہ خواب درخواب سفر، ص 15
2. اندھیارے میں ایک کرن مجموعہ خواب درخواب سفر، ص 187
3. اندھیارے میں ایک کرن مجموعہ خواب درخواب سفر، ص 188
4. کل کی سیتا، آج کی سیتا مجموعہ تیرے میرے دکھ 1987، ص 104
5. ساتھ ساتھ مجموعہ خواب درخواب سفر 2016، ص 97
6. ایک شجر ایسا مجموعہ ہمیں جینے دو ص 27
7. وقار ناصری۔ مسرور جہاں کے افسانے، خصوصی اشاعت اودھ نامہ 9 مارچ 2014
8. عائشہ صدیقی۔ مسرور جہاں۔ ایک منفرد قلم کار، ایک صاحب طرز افسانہ نگار، اودھ نامہ 8 فروری 2016
9. ٹکڑوں میں بٹی عورت مجموعہ خواب درخواب سفر 2016، ص۔
10. لٹیرا مجموعہ خواب درخواب سفر 2016، ص 52
11. واپسی مجموعہ خواب درخواب سفر 2016 ص 91
12. شارب ردولوی، مسرور جہاں کی افسانہ نگاری

■

Razia Khatoon
Research Scholar
Department of Urdu
A.M.U Aligarh 202002
raazia7860@gmail.com

محبوب خان اصغر

تہذیبی اقدار کا شاعر
حمایت علی شاعر

اقدار اور روایات کی اساس پر افکار کا محل تعمیر کرنے والوں میں یوں تو ہمیں بہت سے نام ملتے ہیں مگر اس وقت ہمیں علاقہ صرف حمایت علی شاعر سے ہے جو تخلیقی طور پر ہر آن فعال رہتے تھے۔ ان کی علمی اور عملی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔

عام طور پر کسی غیر معمولی شخصیت اور اس کے فن کو اجاگر کرتے وقت یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کا تعلق کس خطے سے ہے اور ماضی میں اس خطے سے اور کون سی ایسی شخصیتیں وابستہ رہیں جنھوں نے ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں۔ اورنگ آباد مردم خیز خطہ رہا ہے اور وہاں کے باشندے مردم شناس رہے ہیں۔ اردو زبان کی بقاء اور اس کے ارتقاء میں اورنگ آباد نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کے حسن و جمال کی نگہداشت میں ولی، سراج، صفی، وجد اور سلیم کا اہم حصہ رہا ہے۔ حمایت علی شاعر کا خمیر بھی اسی سرزمین سے اٹھا تھا۔ اپنی سخنوری سے زبان و ادب کی آبیاری میں شاعر نے جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے بھی مخفی نہیں ہے۔

حمایت علی شاعر 14 جولائی 1926 کو سید تراب علی کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے فوراً ہی بعد انھیں ملازمت اختیار کرنے پر اس لیے مجبور کیا جانے لگا کہ معیشت کو استحکام ملے۔ ان کا تعلق فوجی گھرانے سے ہونے کے سبب انھیں بھی 1940 میں فوج میں بھرتی کے لیے مجبور کیا گیا لیکن ان کا طبعی میلان سخن گوئی کی طرف تھا۔ وہ ملازمت کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو ان کے شعور نے نئے مسائل کو کریدنا شروع کیا اور ان مسائل کی ترجمانی کے لیے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اور ولی دکنی سے مولوی عبدالحق تک اورنگ آباد کی سرزمین میں اردو کی تاریخ رقم کرنے والوں میں اپنا نام بھی درج کروایا ہے۔ رومانی، جذباتی، حقیقی، واقعی اور سیاسی موضوعات ان کے ہاں بار بار آتے ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی بات کو شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں فلسفہ بھی ہے۔ حکمت اور دانائی کے ساتھ سماجی اور عمرانی امور کی تصویر کشی کا تجربہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

حمایت علی شاعر کو زمین سے اٹھنے اور پیروں پر ٹھہرنے کے لیے وقت ضرور لگا مگر اس کے لیے انھوں نے بیساکھیاں تلاش نہیں کیں۔ وہ خودرو پودے کی مانند پھلے پھولے بلکہ اقبال کے الفاظ میں انھوں نے تعمیر خودی میں بڑی جدوجہد کی۔ تقسیم ہند سے قبل انھوں نے عابد شاپ پر اخبار اور دستی پنکھے بیچے۔ ان کا یہ عمل اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ کام کو بس کام ہی سمجھا جائے۔ کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ ہوس لقمہ تر کا چکر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ انسان چھوٹے کام اور کم اجرت سے عاجز آ کر بڑے اور برے کام اور زیادہ اجرت کا عادی ہو جاتا ہے اور صاحب ثروت بننے کے چکر میں حلال و حرام کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اس چکر سے خود کو ہمیشہ بچائے رکھا۔ ہوس لقمہ تر کا عارضہ نہیں پالا۔ وہ محنت کش رہے۔ ان کی دانست میں محنت شاقہ اور بلند نظری ہی انسان کو اوج و اقبال عطا کرتی ہے۔

حمایت علی شاعر تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے تھے مگر ان کی شاعری میں بالیدگی تقسیم سے قبل ہی شروع ہو گئی۔ تقسیم کے بعد کے حالات سے جو ماحول پیدا ہوا تھا انسانیت جس طرح پٹخنیاں کھا رہی تھی۔ ان تمام واقعات کی ترجمانی شاعر نے بھرپور انداز میں کی ہے۔

سورج کے اجالے میں چراغاں نہیں ممکن
سورج کو بجھا دو کہ زمیں جشن منائے

14 فروری 1949 میں معراج النسا سے منسوب کر دیے گئے۔ انھوں نے ایک مثالی ازدواجی زندگی گزاری۔ دونوں ہی کی یہ کاوشیں رہی کہ زندگی مصرعہ دولخت نہ ہونے پائے۔ انھیں آٹھ اولادیں ہوئیں جن میں چار لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ ان کی شریک حیات حیدرآباد دکن سے جاری ہونے والا ہفتہ وار اخبار 'پرواز' میں صفحہ خواتین کی نگراں رہیں۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے انھوں نے شہرت حاصل کی۔ انڈو پاک کے موقر رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔

حمایت علی شاعر ثلاثی کے موجد ہیں انھیں 1993 میں موجد ثلاثی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ان کی شعری تصانیف میں 'آگ میں پھول' مٹی کا قرض، تشنگی کا سفر، ہارون کی آواز، حرف حرف روشنی اور منظوم خودنوشت، سوانح حیات 'آئینہ در آئینہ' شامل ہیں۔ انھوں نے کئی نثری تصانیف، ڈرامے لکھے اور دیگر زبانوں کے تراجم بھی کیے۔ مظہرالحق صدیقی وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی کہتے ہیں کہ ''حمایات علی شاعر نے آگ کا دریا عبور کر کے عظیم شاعر کا منصب حاصل کیا، وہ قابل رشک شخصیت ہیں۔ ان جیسے شاعر و ادیب کا معاشرے کے سنوارنے میں اہم کردار ہوتا ہے''۔

('بارش سنگ سے بارش گل تک' مرتب، رعنا اقبال)

ہم مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ عظیم شاعر بننے کے لیے آگ کا دریا عبور کرنا پڑتا ہے۔ ان کی شاعری کے فنی اور جمالیاتی پہلو پر اب بھی شباب ہے۔ تشبیہات ہوں کہ استعارے ان میں ایک عجیب تابانی پیدا کی ہے۔ نیز ایک ایسا جہان انھوں نے بنایا ہے جو دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ وہ زبان کے مزاج داں ہیں۔ نت نئے دلخراش واقعات کا مشاہدہ کر کے جاگتی آنکھوں سے ایک بہتر دنیا کا خواب دیکھنا اور سو جانا پھر صبح معمولات زندگی میں مصروف ہو جانا شاعر کو پسند نہیں تھا بلکہ برسوں کی نیند کو خیرآباد کہہ کر راتوں کو جاگ جاگ کر تاریخ کے اوراق کو الٹنا اور انھیں شعری پیکر میں ڈھالنا شاعر کا وطیرہ تھا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

ایک جبر وقت ہے کہ سہے جا رہے ہیں ہم
اور اس کو زندگی بھی کہے جا رہے ہیں ہم
اونچی عمارتوں پہ ہے تعمیر کا گماں
اور اندرون ذات ڈھئے جا رہے ہیں ہم

حمایت علی شاعر کے ہاں اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے 'جواب' ملاحظہ کیجیے۔

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پہ کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر
میں تھا تو اپنی راہ پہ تھی گامزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات
سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ ایک دیا
چپ کے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا

اس کا بنیادی موضوع 'غرور' ہے اور مغرور کو قدرت بہرحال جواب دیتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ناگزیر لگتا ہے کہ عدم نے بہت پہلے اسی بنیادی موضوع کو صرف چار مصرعوں میں بیان کردیا ہے۔ عدم کے تیور ملاحظہ فرمائیں۔

چھپنے لگا جو چاند تو بولا غرور سے
تھا مغتنم جہاں کے اندھیروں میں اپنا دم
اب کون ہے جو رات کو بخشے گا روشنی
جگنو نے مسکرا کے کہا بے وقوف ہم

شاعر نے زندگی کے بعض حقائق کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ چوں کہ وہ کمیونسٹ نظریات سے متاثر تھے اور اس کا اثر بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

یہ شہر سجدہ گزاراں، دیار کم نظراں
یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے

اس شعر سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ شاعر نے مسلمانوں کو شعور و ادراک کے طور پر یتیم دیکھا ہے یا مسلمانوں کو چشم کم سے دیکھا ہے۔

اسی قبیل کا ایک اور شعر ہے جو کہ بہت ہی عمدہ ہے۔ کہتے ہیں۔

جہان فکر و عمل میں یہ میرا زعم وجود
فقط نمائش پوشاک کے سوا کیا ہے

شاعر کے تمام ہی موضوعات عصری نوعیت کے ہیں اس کے باوجود سخنوری کی صحیح قدریں اور شاعری کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

اس دشت سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے
چمکی جو ذرا دھوپ تو جلنے لگے سائے
کس کوچہ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعر
آوازہ کسے ہے تو کوئی سنگ اٹھائے

حمایت علی شاعر نے تقسیم کا کرب جھیلا تھا۔ زندگی اور اس کے تاریخی شعور کو اپنے اندر اتارا تھا۔ زندگی کی تلخیوں کو برداشت کیا۔ مسائل کو سلجھانے اور زندگی کو ایک خوبصورت سانچے میں ڈھالنے کا عزم ان کے اندر تھا۔ اپنے خول سے باہر نکل کر زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھنے میں انھیں لذت ملتی تھی۔ وہ اپنے مداحوں کو بھی اپنی شاعری کے وسیلے سے یہی پیغام دیتے ہیں۔ تقسیم سے قبل ان کے رفقاء میں ممتاز عثمانین جناب عابد علی خان صاحب بانی 'روزنامہ سیاست'، مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، سلیمان اریب، سرینواس لاہوٹی شامل ہیں۔ غالباً شاعر کے دو یا تین حقیقی بھائی اب بھی اورنگ آباد میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

معروف نقاد شمس الرحمان فاروقی کے خط کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیں جو کہ انھوں نے شاعر کو منظوم خودنوشت 'آئینہ در آئینہ' کی اشاعت پر لکھا تھا...... ''اتنی ضخیم خودنوشت اور اتنے مفصل حالات سے بھرپور اور وہ بھی منظوم، میں نے نہیں دیکھی۔ پھر یہ کہ ساری کتاب ایک ہی بحر میں (صرف چند صفحوں کو چھوڑ کر) اور کہیں بھی روانی میں کمی نہیں۔ بھلا میں آپ کی تعریف کیا کرسکتا ہوں۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ آپ نے ذاتی اور سیاسی دونوں طرح کے حقائق سے آنکھ ملانے میں کہیں بھی کمی نہیں کی۔ اس زبردست کتاب کی توصیف میں جو کچھ بھی لکھوں کم معلوم ہوتا ہے''۔ ان سطور کی روشنی میں شاعر کے قد کا پیمانہ ناپا جاسکتا ہے۔ تب ہی تو انھیں مشاعروں کے ذریعے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایات کا بھرپور التزام اور لفظیات کے بعد اس بات کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے کہ شاعر کو قدرت نے ایک وہبی دماغ کے ساتھ قوت باصرہ سے بھی مالامال کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

جنہیں خود اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا
میری نگاہ میں ایسے بھی دیدہ ور ہیں بہت

تدریس سے وابستگی کے سبب ان کے ذہن و دل کی کھڑکیاں تازہ ہواؤں کے لیے کھلی رہتیں۔ ان میں ایک عجیب طرح کا بانکپن اور شان کج کلا ہی تھی۔ انھیں حیدرآباد کے ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی کل ہند مشاعروں میں کلام سنانے کا بھی اعزاز حاصل رہا۔ وہ خوش سلیقہ اور نفاست پسند تھے۔ شاعر نے اپنی شاعری کو صرف سیاسی موضوعات تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ کہیں کہیں اپنے عہد کے مسائل اور سرمایہ دارانہ نظام کو بھی انھوں نے اپنی گفتگو کا محور بنایا۔ ہر شاعر کی طرح شاعر بھی حسن پرست تھے۔ فضاؤں میں محبت کے نغمے بکھیرے۔ رومانی شاعری تخلیق کی۔ ان کے آس پاس حسن ہی حسن تھا مگر ڈگمگائے نہیں۔ گھر کو گھر رہنے دیا۔ انھوں نے بیوی بچوں کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزاری۔ حمایت علی شاعر کی نشو و نما جن حالات کے سائے میں ہوئی تھی اس کا اثر موت تک ان کی شخصیت پر دکھائی دیتا تھا۔ تقسیم ہند اور پھر پولیس ایکشن کے وقت جو موج خون ان کے سر سے گزری تھی اور انسانی خون پانی کی طرح بہایا گیا تھا کسی کیمرے کی طرح ان کی آنکھوں میں سارے مناظر مقید تھے۔ انھوں نے تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ زوال اور انحطاط کا زمانہ ایک عام آدمی کو عسرت اور مفلسی سے دوچار کردیتا ہے چنانچہ شاعر اپنی حساس طبیعت کے باعث جذباتی ہوگئے تھے اور انھوں نے انفرادیت کے خول سے نکل کر انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجتماعی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش میں شعر کہنا شروع کیا اور بہت جلد مشاعروں کے لیے ناگزیر ہوگئے۔ انھوں نے تقریباً دنیا کے کئی خطوں میں مشاعرے پڑھے۔

نظم 'سیاست'

یہ سیاست بھی کیا عجب شے ہے
میں سمجھتا ہوں میں بھی حق پر ہوں
تم سمجھتے ہو تم بھی حق پر ہو
میں تمہیں ماردوں تو تم ہو شہید
تم مجھے ماردو تو میں ہوں شہید
میں ہوں یا تم، یہاں بہ فضل خدا
سب شہیدوں کی صف میں شامل ہیں
سب یزیدوں کی صف میں شامل ہیں

حمایت علی شاعر ہمارے عہد کے ایک بالغ نظر شاعر تھے۔ ان کا فکری عمل سماجی تحریکات اور ایک پورے تہذیبی شعور سے منسلک تھا۔ ان کی شاعری دو ملکوں کی تاریخی اور تہذیبی اقدار کی آئینہ دار ہے۔

16 جولائی 2019 منگل کی صبح ٹورنٹو میں انتقال کر گئے اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مگر ان کے فکر وفن کا رنگ اور شخصیت کا اثر صدیوں تک ہمارے دل و دماغ پر رہے گا۔

تم کو لگ جائیں گی صدیاں ہمیں بھلانے میں

■

Mahboob Khan Asghar
11-1-1049, Second Floor
Mallepally
Hyderabad - 500001 (Telangana)
Mob:9246272721

ضیاء الرحمن غوثی

سیرِ گلِ فروشاں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

دہلی کو ہندوستان کا دل کہا جاتا ہے جس کی ہر دھڑکن سے سارا ملک متاثر ہوتا ہے۔ یوں تو راجدھانی ہونے کے ناطے دلی میں ہر روز ریلیوں، جلسوں، جلوسوں، میلوں ٹھیلوں اور طرح طرح کی تقاریب سے کوئی نہ کوئی رونق بنی ہی رہتی ہے۔ فیسٹول اور میلے دلی کی روزمرہ کی زندگی کے اہم پہلو ہیں دلی کے متعلق ٹھیک ہی کہا گیا ہے کہ یہاں ہفتے میں سات دن اور آٹھ میلے یا مہینے میں تیس دن اور چالیس میلے لگتے ہیں۔ دلّی میں بعض اوقات میلوں اور تقریبات کے موقع پر سارا ہندوستان کچھ اس طرح امنڈ پڑتا ہے کہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتی ہیں۔ ایسی کئی اہم ترین تقاریب میں شامل ہیں سرچشمۂ فیضانِ نور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اجمیر شریف میں عرس کے موقع پر مہرولی میں حضرت بختیار کاکی کے آستانے پر لاکھوں عقیدت مندوں کا اجتماع اور اکتوبر کے مہینے میں 'پھول والوں کی سیر' کا میلہ۔

پھول والوں کی سیر کو سیر گل فروشاں اور پنکھوں کا جلوس بھی کہا جاتا ہے یہ دلی کا ایک رنگا رنگ پھولوں سے مہکتا تاریخی میلہ ہے جس سے دلی کی قدیم یگانگت کی روایات وابستہ ہیں۔ جو دلی والوں کے لیے ایک قیمتی، ثقافتی ورثے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے یہ میلہ برسات کے دنوں یعنی بھادوں میں لگتا تھا لیکن اب عموماً برسات ختم ہونے پر اکتوبر کے وسط میں لگتا ہے۔ میلے کے موقعے پر دلی والے دلہن کی طرح سجی مہرولی میں امنڈ پڑتے ہیں۔ خاص طور پر غیر ملکی سیاح اس میلے سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں، جنھیں اس موقعے پر پرانی و نئی دلّی کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ یہ میلہ مغل حکمرانوں کی اعلیٰ جمالیاتی حِس کی نشاندہی کرتا ہے۔

مہرولی کی تاریخ اور اس کی روحانی عظمت مسلمہ ہے، جہاں ایک طرف مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ مرجع خلائق ہے، تو دوسری طرف تھوڑی ہی دور پر یوگ مایا جی کا قدیم مندر بھی ہے۔

'پھول والوں کی سیر' کی تاریخ مغل حکمراں اکبر شاہ ثانی کے زمانے (1806-1837) سے شروع ہوتی ہے جو بے حد دلچسپ ہے۔ بادشاہ اپنے بڑے شاہزادے سراج الدین ظفر (بہادر شاہ ظفر) سے زیادہ انسیت نہیں رکھتے تھے اور اپنے چھوٹے شاہزادے مرزا جہانگیر کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بات لال قلعے میں مقیم ریزیڈینٹ مسٹر آرکیبالڈ سیٹن (Archibald Seaton) کو منظور نہ تھی۔ شاہزادہ مرزا جہانگیر مصاحبوں کی خوشامد اور بادشاہ کے لاڈ و پیار میں بگڑ گئے تھے اور گستاخیوں کی حد تک بے باک تھے۔ ویسے نہایت دلیر اور طویل ہیکل بھی تھے۔ نشانہ بازی اور گھوڑسواری میں بلا کی مہارت رکھتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر محض 17 سال تھی۔

مرزا جہانگیر کو مسٹر سیٹن ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور انھیں اپنی ولی عہدی کے راستے کا کانٹا سمجھتے تھے۔ انھیں نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ساتھ ہی اکثر انھیں 'لولو' کہہ کے چڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن مسٹر سیٹن دربار میں بادشاہ سے مل کر واپس جا رہے تھے تبھی مرزا جہانگیر نے پیچھے سے پھبتی کسی— ''لو لو ہے بے لولو ہے'' یہ بات سیٹن کو بہت ناگوار گزری اور وہ چراغ پا ہو گیا۔ دوسری طرف مرزا کے مصاحبوں نے قہقہہ لگا دیا۔ مسٹر سیٹن نے تجاہل عارفانہ سے اپنی خفت مٹانے کے لیے پوچھا۔ ''صاحب عالم کیا کہتے ہیں؟'' مصاحبوں نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا کہ صاحب عالم کہتے ہیں۔ ''آپ آبدار موتی کی طرح چمکتے ہیں''۔ اس پر سیٹن یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ''ہم صاحب عالم کو بھی لولو بنائے گا''۔ یہ طنز مرزا جہانگیر برداشت نہ کر سکے اور ایک دن اپنے طمنچہ سے مسٹر سیٹن پر گولی چلا دی۔ لیکن نشانہ چوک گیا اور مسٹر سیٹن بال بال بچے۔

اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ بادشاہ پر کمپنی سرکار کا کافی دباؤ تھا۔ حکومت بادشاہ کی تھی لیکن حکم انگریزوں کا چلتا تھا۔ بادشاہ اکبر ثانی کی حکومت کی عملداری کا دائرہ پالم سے لال قلعے تک ہی سمٹ کر رہ گیا تھا۔ انھیں

صرف دولاکھ روپئے ماہوار بطور وظیفہ ملا کرتے تھے۔ مسٹر سیٹن نے انتقامی جذبے کے تحت ایک دن دیوانِ خاص میں سپاہیوں کے ساتھ زبردستی داخل ہوکر مرزا جہانگیر کو گرفتار کرلیا۔ بے بس بادشاہ کوئی مدافعت نہ کرسکے۔ مسٹر سیٹن نے بادشاہ کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ شاہزادے کو حکمرانی کی تربیت کی ضرورت ہے۔ اس خیال سے انھیں تربیت کے لیے الہ آباد بھیج دیا گیا ہے۔ تربیت مکمل ہونے پر دہلی واپس بلا لیا جائے گا۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ الہ آباد میں شاہزادے کی حیثیت ایک نظر بند سیاسی قیدی کی ہی تھی۔ اس بارے میں عرش تیموری نے اپنی کتاب۔ 'قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں' میں شاہزادے کی گرفتاری کے عمل کا ذکر کرتے ہوئے باضابطہ جنگ کی سی کیفیت بیان کی ہے۔ جس میں کافی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ دونوں طرف سے مقابلہ بھی ہوا تھا۔

مرزا جہانگیر کی گرفتاری کے صدمے میں ان کی والدہ ملکہ نواب ممتاز محل کا رو رو کر برا حال ہوگیا۔ انھوں نے مہرولی جاکر حضرت خواجہ بختیار کا کی کی مزار پر حاضری دی اور منت مانگی کہ شاہزادے کی بخیر و عافیت واپسی پر وہ آستانہ پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گی۔

دوسری طرف لال قلعے سے شاہزادے کی رہائی کی کوششیں جاری رہیں۔ ادھر الہ آباد میں شاہزادے کے مزاج میں بھی خوشگوار تبدیلی آگئی تھی اور حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ خود مسٹر سیٹن کی مداخلت اور سفارش سے ہی مرزا جہانگیر رہا ہوکر واپس دہلی آگئے۔ دربار اور رعایا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملکہ ممتاز محل کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بادشاہ سلامت بھی ملکہ کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔

چنانچہ بیگم ممتاز محل نے اعلان کرایا کہ وہ حضرت بختیار کا کیؒ کے آستانہ پر اپنی مانی ہوئی منت کی چادر چڑھانے جائیں گی۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ منت کی چادر کا جلوس لال قلعہ سے روانہ ہوا۔ رعایا بھی جوق در جوق بادشاہ، ملکہ، شاہزادوں اور شاہزادیوں کے ساتھ چل پڑی۔ ایسی دھوم دھام اور ایسی رونق دلّی والوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھولوں سے سجی چادر بڑی فنکاری اور نقاشی سے تیار کی گئی تھی۔ مسہری میں پھولوں سے لگا ایک پنکھا بھی لگا دیا گیا تھا۔ جس سے اس کی خوبصورتی اور بھی دوبالا ہوگئی تھی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے پنکھے اور اس میں پنہاں باہمی محبت اور بھائی چارے کے جذبے کو بڑے خوبصورت انداز میں اس طرح بیان کیا ہے— ''بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی پھچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا جو پنّی چڑھا، آئینے لگا، پھولوں سے سجا، ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا گیا تھا۔ یہ محض پنکھا نہ تھا بلکہ جوش و محبت اور یگانگت کا نشان تھا۔ جس نے چھوٹوں بڑوں، غرباء و امرا، ہندوؤں اور مسلمانوں، غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقے کی رعایا کو ایک جگہ جمع کردیا تھا۔ خود بادشاہ کو قلعے سے مہرولی لے آیا تھا۔ یہ مہرولی نہ تھی بلکہ ایک لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا پروانے۔''

جلوس میں خود بادشاہ نے بڑی عقیدت سے اس منت والی چادر کو اپنے سر پر رکھا ہوا تھا جو درگاہ شریف پر بڑی عقیدت اور احترام سے چڑھائی گئی۔ ہندو رعایا نے بادشاہ سے اپنی عقیدت کا عاجزانہ اظہار کرتے ہوئے قریب ہی واقع یوگ مایا جی کے مندر میں 'چھتر اور پنکھے' بھی چڑھائے۔ دھوپ اور اگربتی کی خوشبو اور ناقوس کی آواز سے مندر میں سماں بندھ گیا۔ اس موقع پر لال قلعہ سے مہرولی تک کا راستہ ایسا نظر آیا گویا ایک نیا شہر بس گیا ہو۔

اس طرح 1812 میں بادشاہ اور ملکہ بیگم ممتاز محل نے حضرت بختیار کا کیؒ کی مزار پر منت کی پہلی چادر چڑھا کر 'پھول والوں کی سیر' کے میلے کی روایت کی بنیاد ڈالی تھی۔ بادشاہ اکبر ثانی کو یہ میلہ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اعلان کردیا کہ اب ہر سال بھادوں کے شروع میں اس دن کی یاد میں ایسا ہی شاندار میلہ لگا کرے گا۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کو ساتھ لے کر یوگ مایا جی کے مندر پر پنکھا اور چھتر پیش کریں گے اور ہندو اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ حضرت بختیار کا کیؒ کی مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گے۔

اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں پھول والوں کے سیر کی رونق اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اپنی ولی عہدی کے زمانے میں وہ اس میلے کے انعقاد میں خاص دلچسپی لیتے رہے۔ یہاں تک کہ 1857 کے پر آشوب دور میں بھی جب دلی پر انگریز قابض تھے، بہادر شاہ ظفر اس تقریب کو منانے کے لیے تین دنوں تک مہرولی میں قیام پذیر رہے۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں سیر و سکون کے ساتھ ساتھ اس روایت کو پوری دلچسپی سے برقرار رکھا اور سرپرستی کی۔

بہادر شاہ ظفر نے پھول والوں کی سیر کے دوران چڑھائے جانے والے پنکھے کی تعریف میں درج ذیل نظم بھی لکھی تھی۔

'پنکھا' کی تعریف میں بہادر شاہ ظفر کا یادگار کلام

نورِ الطاف و کرم کی ہے یہ سب اس کی جھلک
کہ وہ ظاہر ہے مِلک اور ہے باطن میں مَلک
اس تماشہ کی نہ کیوں دھوم ہو فلک تلک
آفتابی سے خجل جس کے ہے خورشیدِ فلک
یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا
شائق اس سیر کے سب آج ہیں با دیدہ و دِل
واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشم انجم ہو نہ اس سیر پہ کیوں کر مائل
سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگمِ والا منزل
جس کے دیواں کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا
رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک
ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگین ہے رعیت سے لگا شاہ تلک
زعفراں زار ہے اک بام سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اِس رنگ سے خلقت پنکھا

بادشاہ کی دلچسپی کو دیکھ کر عوام نے بھی اس روایت کو جوش و خروش سے برقرار رکھا۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ساون ختم ہوتے ہی بادشاہ کے خاص درباریوں میں سے دو مسلمان اور دو ہندو عمائدین شہر بادشاہ سلامت سے میلے کی تاریخ مقرر کیے جانے کی درخواست اس طرح کرتے۔ ''جہاں پناہ! ساوَن ختم ہونے کو ہے، بہار کی آمد آمد ہے۔ شمسی تالاب کٹورے کی طرح بھر چکا ہے، جھرنے کا منظر دیکھنے کے لائق ہے۔ مہرولی کی نظر دلی پر ہے کہ کب میلے کی تاریخ طے ہو'۔

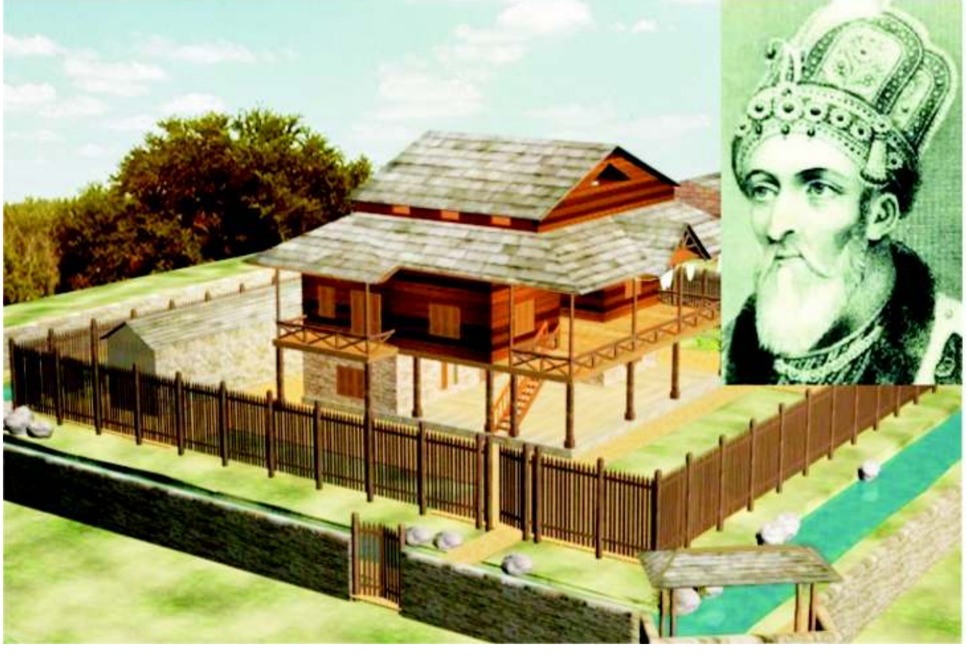

اور بادشاہ بھی بخوشی تاریخ مقرر کر دیتے تھے۔ دلّی کے کوچہ و بازار میں ڈھول پیٹ پیٹ کر تاریخ کا اعلان ہو جاتا۔ تب لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ مہرولی میں بازاروں کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ دلی والے آج بھی ساون کی جھڑی ختم ہوتے ہی عموماً اکتوبر کے وسط میں ہر سال یہ جشن مناتے ہیں اور تب مہرولی دلہن کی طرح سج جاتی ہے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ باہم شیر وشکر ہو کر باہمی یگانگت کا بے مثال نمونہ پیش کرتے ہیں۔

1857 کے پر آشوب دور میں بھی بہادر شاہ ظفر 'پھول والوں کی سیر' کے میلے میں شریک ہوتے تھے۔

1942 کی 'بھارت چھوڑو تحریک' کے دوران سیر گل فروشاں میلے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ 20 برسوں بعد 1961 میں پنڈت جواہر لال نہرو، بیرسٹر نورالدین احمد، لالہ شام ناتھ، بیگم تیمور جہاں، یوگیشور دیال، لالہ جگن ناتھ وغیرہ کی کوششوں سے پھر سے 'پھول والوں کی سیر' کی روایت چل پڑی۔ اس میں بطور خاص لالہ یوگیشور دیال ہمیشہ پیش پیش رہے۔

صدور جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، فخر الدین علی احمد، شنکر دیال شرما، ونکٹا رمن، نارائن سوامی اور ڈاکٹر عبدالکلام جیسی شخصیتوں نے بھی 'پھول والوں کی سیر' کی تقریبات کی سرپرستی کی ہے۔ آج بھی اکتوبر کے مہینے میں کئی دنوں تک دلی اور خاص طور پر مہرولی میں 'پھول والوں کی سیر' کی چہل پہل رہتی ہے۔

'پھول والوں کی سیر' کا میلہ بدلتے وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ کاش ایسے خوبصورت جشن سال کے بیشتر مہینوں اور ملک کے بیشتر حصوں میں منعقد ہوتے رہتے، تاکہ ملک میں گنگا جمنی تہذیب کے تانے بانے اور مضبوط ہو جاتے اور بھائی چارے اور قومی اخوت کے جذبے کو مزید تقویت ملتی!

آخر میں پیش ہے سیر گل فروشاں پر علامہ خضر برنی (مرحوم) کی یہ نظم۔

سیرِ گل فروشاں

دوش پر اپنے صبا خوشیوں کی لائی ہے بہار
آج مہرولی میں جاکر دیکھیے نقش و نگار
قہقہہ بردوش ہے حد نظر تک روشنی
اہل دہلی پا رہے ہیں اک بہارِ زندگی
ہر ادا میں ایک مستی، رنگ و نکہت جوش ہے
ہر نفس اپنی جگہ خود بے پیے مدہوش ہے
رِند و صوفی، شیخ و پنڈت ہو گئے مستی سے چور
یہ بھی مہرولی میں شاید پا گئے کیف و سرور
گوشہ گوشہ ہے منور اس کی گلیاں مشک بو
ہر طرف رقصاں نظر آتی ہے گویا آرزو
موتیا، چمپا، چمیلی، موگرہ، نرگس، گلاب
ہر کلی محوِ ترنم اور گلوں پر ہے شباب
پتہ پتہ صحن گلشن کا طرب انگیز ہے
ڈالی ڈالی دیدنی، مستی ادا نو خیز ہے
شاخِ گل کی ڈالیاں رنگین ہیں شاداب ہیں
گھاس کے یہ فرش بھی تو اطلس و کمخواب ہیں
جھومتی شاخوں کو بخشا ہے سجاوٹ نے سنگھار
نکہتِ گل نے بہاروں کو دیا ہے اِک خمار
میکدہ میں جاگ اٹھا ہے جام و پیمانے کا شوق
ہو گیا ادراک پر حاصل جنوں کو آج فوق
سنسناتی کیفیت ہے، روح افزا ہے فضا
دور تک شہنائیوں کا ایک تانتا سا بندھا
جانفزا اور روح پرور ہے بہاروں کا سماں
اِک تبسم زار ہے یہ لالہ زاروں کا سماں
مسکراتے ہیں یہاں شاداب نسرین و سمن
رقص پیرا ہیں شمیم و یاسمین و نسترن
شام کی ہلکی سیاہی میں چراغاں ہو گیا
ہر نفس جوشِ محبت کی ادا میں کھو گیا
اہل دِل کو میری دِلّی بخشتی ہے تازگی
اس کو فطرت نے عطا کی ہے عجب اک دلکشی
ہے روپہلی صبح صادق اور سنہری اس کی دھوپ
شہر دہلی ہے بذاتِ خود ہی اک دلہن کا روپ
دیکھنے والوں کے دل میں اس کا اک افسانہ ہے
یہ ہمہ اوصاف بستی خود عجائب خانہ ہے
بن کے بگڑی سج کے اجڑی پھر وہی رونق رہی
اس کی گلیوں میں محبت کی بسی ہے تازگی
ہے قلعہ کیسا حسیں جمنا کا منظر دیکھیے
جامع مسجد دیکھیے اور برلا مندر دیکھیے
یہ قلعہ ہے آخری شاہِ ظفر کی یادگار
اس مجاہد کی ہے اپنی زندگی خود لالہ زار
اس کے پہلو میں ہیں خوابیدہ قطب ابدال بھی
سو رہے ہیں اس کی مٹی میں جواہر لعل بھی
اک طرف گاندھی سمادھی پر لگی ہے بھیڑ سی
گود میں ہیں نونہالانِ وطن اور شاستری
اس کے سینے میں نہاں ہے آرزوؤں کا بھرم
اس کے سائے بن گئے ہیں ایک بنیاد کرم
ہم اسی باعث مناتے ہیں یہ رنگیں یادگار
کیوں کہ ہم خود آج ہیں اپنے وطن کے تاجدار
ایک پنکھا وہ بھی پھولوں کا بنا ہے زر نگار
اہل دہلی کی مسرت کا ہوا آئینہ دار
نذرِ خواجہ کے لیے اس کو سجاتے ہیں بہت
شانِ خواجہ ہے حقیقت میں عظیم المرتبت
فیض پاتے ہیں اسی در سے ہمیشہ خاص و عام
ہندو مسلم سب ہی کرتے ہیں یہاں آ کر سلام
اتحاد باہمی کی یہ نئی قندیل ہے
قومی یکجہتی کے سنگم کی بجا تشکیل ہے
اتحاد باہمی سے پھوٹ نکلی ہے کرن
ایک ہی گلشن کے غنچے ہیں چمیلی، نسترن
قومی یکجہتی سے روشن ایک عنواں ہو گیا
شیخ و پنڈت کو بھی 'سیر گل فروشاں' ہو گیا
الغرض پھیلی ہوئی ہیں عیش کی پرچھائیاں
اِک طرف گلکاریاں ہیں اِک طرف رعنائیاں
ایک پنکھا گل بداماں پرچم رازِ نہاں
اکبرِ ثانی کی دہراتا ہے رنگیں داستاں

■

Zeyaur Rahman Ghausi
K-94 (G.F.) A.F. Enclave-I
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mob.9312481982

رانچی کے مشاعروں کی تاریخی حیثیت

نصیر افسر

جھارکھنڈ نہ صرف قدرتی مناظر کی وجہ سے بلکہ صحت افزا مقام ہونے کی وجہ سے بھی ملک اور بیرون ملک کافی مشہور رہا ہے۔ جھارکھنڈ جو پہلے بہار کا جنوبی حصہ تھا جو 15 نومبر 2000 کو ایک نئی ریاست کے طور پر منظر عام پر آیا۔ نئی ریاست جھارکھنڈ کی تشکیل کے ساتھ ہی رانچی راجدھانی بن گئی۔ رانچی دور مغلیہ اور پھر انگریزی حکومت کے زمانے سے ہی ایک قدیم شہر رہا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ صرف قبائلیوں کا مسکن تھا مگر تلاش رزق اور روزگار میں دوسری ریاستوں سے پڑھے لکھے لوگوں نے یہاں قدم جمانے شروع کر دیے تھے اور ان کی تعداد اب اتنی ہوگئی کہ یہاں کی قدیم قبائلی آبادی اب اقلیت میں ہوگئی۔ یہاں کے قبائلی نہایت ہی سیدھے سادے اور بے حد معصوم ہوتے تھے۔ انھیں صرف اپنے کام سے ہی مطلب ہوتا تھا۔ ان کی روزمرہ کی زندگی فطرت سے قریب تھی۔ ان کی زندگی کا دائرہ جل، جنگل اور زمین تک ہی محدود ہوتا تھا۔ نیم برہنہ حالت میں ہی ان کی زندگی گزرتی تھی۔ شام سے قبل ہی وہ اپنی کٹیا میں داخل ہوجاتے اور علی الصباح بیدار ہوکر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ ناخواندگی کی وجہ سے وہ جسمانی محنت سے حاصل کیے رزق پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ہاں ان کے یہاں ایک نشیلی مشروب جسے ہڑیا کہتے ہیں عام طور پر صبح سے شام تک استعمال ہوتا ہے جو موسم سرما میں بطور خاص جسم میں گرمی پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ اب بھی قبائلی آبادی کی اکثریت تقریباً 80 فیصد گھنے جنگلوں میں ہی بسر کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم کی روشنی نے ان کی حقیر آبادی کو ڈھنگ سے جینا سکھا دیا ہے اور شہروں میں تعلیم سے آراستہ ہونے کی وجہ سے کافی مہذب ہوکر سرکاری وغیر سرکاری نوکری سے جڑ گئے ہیں۔ انھیں مرکزی وریاستی حکومتوں کی جانب سے ہر طرح کی مراعات حاصل ہیں۔ جو واقعی ان کے حقوق ہیں۔

دیکھا جائے تو رانچی کے مشاعروں کی تاریخی حیثیت اس لیے ہے کہ یہاں باضابطہ ہندوستان کی آزادی سے قبل سے ہی مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ آزادی سے قبل جب اتر پردیش، دہلی، پنجاب کے اردو داں حضرات نے رانچی میں تجارت و ملازمت کے سلسلے میں اپنے قدم جمانے شروع کر دیے تو ذہنی لطافت و سکون کے لیے، مشاعروں کا انعقاد شروع کر دیا تھا جن کی خوب پذیرائی ہونے لگی اور اردو طبقہ محظوظ ہونے لگا تھا۔

سب سے پہلے آنند بیکری والوں نے جو پنجاب سے ہجرت کر کے رانچی میں مقیم ہوگئے تھے۔ کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔

رانچی کے کل ہند مشاعروں کا جب بھی ذکر ہوگا تو اکاؤنٹینٹ جنرل، بہار (صدر دفتر رانچی) کا نام ضرور لیا جائے گا جس نے دس تاریخی مشاعرے 1965 سے لے کر 1975 تک اہل رانچی کو دیے۔ 1974 میں ماحول سازگار نہ ہونے کی وجہ سے مشاعرے کا انعقاد نہیں ہو سکا تھا۔ ان تمام مشاعروں کی نظامت عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب نے کی تھی اور رانچی کے شائقین مشاعرہ کو مشاہیر شعرائے کرام سے رو برو کرایا گیا تھا۔ ایک مرتبہ تو فرقہ وارانہ ماحول ہونے کی وجہ سے ضلع حکام نے رات میں مشاعرہ منعقد نہ کرنے کی سخت تاکید کی تو اگلی صبح 10:00 بجے سے انعقاد عمل میں آیا اور لوگوں نے محسوس کیا کہ دن میں بھی مشاعرے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس خاکسار کو نواں اور دسواں کل ہند مشاعرہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

انھیں دہائیوں میں ایچ ای سی (ہیوی انجینئرنگ کارپوریشن) کی بزم 'اردو دنیا' کے ذریعے بھی ہر سال دھروا کے شہید میدان میں کل ہند مشاعروں کا اہتمام ہوتا تھا جس میں اردو داں ملازمین وافسران بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور مشاعروں کو کامیابی سے ہمکنار کرتے تھے۔

حکومت ہند کے اس کارپوریشن میں بڑے عہدہ پر فائز جناب اکبر حسین رنداللہ آبادی پیش پیش ہوتے تھے جنھیں ہندوستان کے بیشتر مشاہیر شعرائے کرام ذاتی طور پر جانتے تھے۔ رانچی کے ڈورنڈہ علاقہ میں حکومت ہند کی ایک کمپنی ہندوستان اسٹیل لمیٹیڈ (راؤ کیلا، بھلائی، درگاپور، بوکارو، اسٹیل پلانٹس کا صدر دفتر) تھی جہاں خاکسار ملازم تھا۔ ایک دن چیف نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ 31 مارچ 1973 کمپنی کا آخری دن ہوگا اور یہ یکم اپریل 1973 سے دو کمپنیوں (SAIL اور MECON) میں تقسیم ہوجائے گی۔ ہندوستان اسٹیل لمیٹیڈ کے 31 مارچ 1973 کے اس مشاعرے میں ملک کے مشاہیر شعرائے کرام نے اپنی شرکت سے اس مشاعرے کو بے حد کامیاب کیا تھا۔ جس میں پروفیسر وسیم بریلوی، امیر آغا قزلباش، ساحرہ قزلباش، کرشن بہاری نور، دل لکھنوی، تسنیم فاروقی، ناظر خیامی، نذیر بنارسی، حفیظ

بنارسی، راحل دہلوی، اجمل سلطانپوری، رمزعظیم آبادی، مہجورشمسی، مختار عاصی، رندالہ آبادی، سنتو کھ سنگھ معصوم کے علاوہ مقامی شاعروں میں نظر رانچی، اثر رانچی، توحید رانچی، ڈاکٹر صدیق مجیبی، پرکاش فکری، وہاب دانش، قمر حمید، حبیب احمر، شمیم فاروقی، پرویز رحمانی اور نصیر افسر کے نام خاص طور پر دیے جاسکتے ہیں۔ اسی دفتر کے زیر اہتمام 8 مئی 1976 کو بھی ایک شاندار کل ہند مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا تھا اور بے حد کامیاب مشاعرہ ثابت ہوا تھا۔ جس میں بطور خاص شعری بھوپالی، نوراندوری، اجمل سلطان پوری، حفیظ بنارسی، طارق بدایونی، اکرام شبنم، مقرب حسین مقرب، سنتو کھ سنگھ معصوم، مختار عاصی، جوگا سنگھ انور، اسلم بدر، کملیش کمار کمل، نشاط انصاری کے علاوہ مقامی شعرائے کرام کی شرکت نے مشاعرے کو کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ واضح ہو کہ اس موقع پر بھی ایک شاندار سوونیر کی طباعت ہوئی تھی جس کی دستاویزی حیثیت آج بھی ہے۔

اسی طرح کئی سال SAIL,MECON کے اسپات کلب کے زیرانتظام کل ہند مشاعرے منعقد ہوئے جن میں بیکل اتساہی، گوپال داس نیرج جیسے نامور شاعروں کی شرکت ہوتی رہی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد کل ہند مشاعروں کا سلسلہ پھر چل پڑا ریاست جھارکھنڈ کی تشکیل سے ڈیڑھ ماہ قبل 2 اکتوبر 2000 کا گاندھی جینتی کے موقع پر رانچی ضلع اسکول کے میدان میں راشٹریہ ایکتا منچ کے زیراہتمام ایک شاندار کل ہند مشاعرے کا انعقاد پدم شری جناب بیکل اتساہی صاحب کی صدارت میں صبح کے 5 بجے تک چلتا رہا۔ جس کا خاکسار نائب صدر تھا اور بہار کے موجودہ DGP جناب گپتیور پانڈے اس کے روح رواں تھے جو اس وقت رانچی کے SSP تھے۔ پدم شری بیکل اتساہی کی صدارت میں منعقد ہوئے اس کل ہند مشاعرے میں شریک ہونے والے شعرا میں حبیب ہاشمی، ڈاکٹر نسیم نکہت، ریحانہ نواب، سنیل کمار تنگ، نیلو میگھ کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے اپنی شرکت سے اس کل ہند مشاعرے کو بے حد کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔

رانچی میں کل ہند مشاعروں کے لیے انجمن بقائے ادب (قائم شدہ 1970) کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے۔ انجمن بقائے ادب، رانچی کے 20 نومبر 2005 کے مشاعرے کو بھی نہیں بھلایا جاسکتا ہے۔ اسی کے تحت ایک نومبر 2008 کے مشاعرے میں حبیب ہاشمی، ریحانہ نواب، ناصر فراز، مظفر ابدالی کے علاوہ مقامی مگر معتبر و معروف شاعروں میں سے ڈاکٹر صدیق مجیبی، حیرت فرخ آبادی، ڈاکٹر سرور ساجد، قمر الزماں قمر، صابر بہاری، اظفر جمیل، نصیر افسر، حبیب احمد، مجیب الرحمٰن بزمی وغیرہم کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح انجمن بقائے ادب کا 15 مئی 2010 کا مشاعرہ جو 4 بجے صبح تک میکن کمیونیٹی ہال میں چلا جو بے حد کامیاب ثابت ہوا۔ شعرائے کرام میں معتبر نام منور رانا، حبیب ہاشمی، علیم صبانویدی، رؤف خیر، شبینہ ادیب، اشوک ساحل، جمیل خیر آبادی، عثمان انجم، خوشبو رام پوری، ناصر فراز، سید نفیس دسنوی، سنیل کمار تنگ، خورشید طلب، سلام نیر قادری، قیصر ضیا قیصر کے علاوہ معتبر مقامی شعرائے کرام کی بھی شرکت ہوئی تھی۔

انجمن بقائے ادب رانچی کے .11.11 یعنی 11 نومبر 2011 کے مشاعرے کا وقار اس واسطے بھی بڑھ گیا تھا کہ اس کے مہمان خصوصی ریاست جھارکھنڈ کے ہر دلعزیز گورنر ڈاکٹر سید احمد تھے جو اخیر تک مشاعرے کا لطف لیتے رہے۔ شریک ہونے والے شعرائے کرام میں معتبر نام شکیل اعظمی، تنویر نمازی، ابرار کاشف، (ناظم) عزم شاکری، اشوک ساحل، اشوک مزاج، مظفر ابدالی، عمران راقم، سہیل عثمانی، فرمود الہٰ آبادی، شگفتہ سہسرامی، محفوظ انصاری اور عروسہ عرشی کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کی شرکت سے کل ہند مشاعرہ بے حد کامیاب ہوا۔ مذکورہ مشاعروں کے موقع پر دیدہ زیب سوونیر کی طباعت بھی ہوئی تھی۔

واضح ہو کہ خاکسار اس انجمن کا جنرل سکریٹری ہے اور جناب حیرت فرح آبادی صدر ہیں۔

3/مارچ 2013 کو منعقد ہوئے، روزنامہ عوامی نیوز کا کل ہند مشاعرہ لوگوں کے ذہن میں اب بھی محفوظ ہے جس کے مہمان خصوصی عزت مآب گورنر ڈاکٹر سید احمد تھے اور جن کی خواہش پر بطور خاص 40 سالوں بعد ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ اس خاکسار نے اس مشاعرے کے لیے بھی بڑی محنت کی تھی۔ اس شاندار کل ہند مشاعرے میں شریک ہونے والے شعرائے کرام میں بطور خاص ملک زادہ منظور احمد، منور رانا، شبینہ ادیب، تحسین منور، حبیب ہاشمی، شکیل اعظمی، رفعت جمال، سنیل کمار تنگ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ معتبر مقامی شاعروں نے بھی اپنے کلام سے سامعین کو محفوظ کیا۔

18/مارچ 2017 کا رانچی کے اربا میں منعقد ہوئے اس مشاعرے کو بھلا کون بھول سکتا ہے جس کی نظامت بین الاقوامی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ جناب انور جلال پوری صاحب نے رانچی میں پہلی مرتبہ کی تھی اور ہزاروں شائقین مشاعرہ اس کے گواہ بنے تھے۔ خاکسار اس مشاعرہ کا کنوینر تھا اور اسے کامیاب کرنے کے لیے بڑی محنت کی تھی۔ جن شعرائے کرام نے اس کل ہند مشاعرے کو کامیابی سے ہمکنار کیا ان میں انور جلال پوری (ناظم) ماجد دیوبندی، اشوک ساحل، شبینہ ادیب، نواب آرزو، سنیل کمار تنگ، بسنت جوشی، ابھیلاش، کامیشور ترنکش اور نصیر افسر کے نام شامل ہیں۔

اب تو کل ہند مشاعروں کا اہتمام مشاعروں کے مشہور و معتبر شعرائے کرام کے زاد راہ و نذرانہ کی رقم میں بے تحاشہ اضافے کی وجہ سے مشکل ہوتی جارہی ہے جس کی خانہ پری بڑے ہندی اخبارات ہی کر رہے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ ریاست جھارکھنڈ میں اب تک اردو اکیڈمی کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا ہے ورنہ کل ہند مشاعروں کے اہتمام میں بڑی آسانیاں ہوسکتی تھیں۔

■

Naseer Afsar
D-1, Friends, Compound, Rahmat Colony
Doranda, Ranchi - 834002
Mob.:9431583915
Email: nasirafsar508@gmail.com

جلیل بازید پوری

عظیم شاعر جمشید مسرور سے ایک پرکیف مصاحبہ

اُوسلو ناروے کی زبان اردو نہیں ہے لیکن اردو کے متوالے وہاں بھی موجود ہیں۔ اب وہاں کی گلیوں میں اردو رات کی رانی کے پھول کی طرح مہک رہی ہے۔ جمشید مسرور شاعری کے اعتبار سے International ہیں اور مضمون کی حیثیت سے National ہیں ناروے سے اردو رسالہ بازگشت برسوں نکالتے رہے۔ خدا حافظ، انشاء اللہ کا شاعراللہ اور لاحول ولا قوت جیسے الفاظ جب غیراردو داں کے ہونٹوں پر مچلتے ہیں تو ان کے ہونٹ چوم لینے کو جی چاھتا ہے۔ یہ جمشید مسرور کا کمال ہے کہ اوسلو کی گلیوں میں اردو گوریا چڑیوں کی مانند پھدک رہی ہے اس لیے میری شدید خواہش تھی کہ جمشید مسرور بھائی سے پوچھوں کہ مرزا داغ دھلوی سے آپ کو کس حد تک اتفاق ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

لیجیے قارئین اردو دنیا کی عدالت کے کٹھرے میں ان کو کھڑا کررہا ہوں۔ یہ اردو کے متوالے ہیں، اردو سے لگاؤ انہیں دیوانگی کی حد تک ہے۔

جلیل بازید پوری: ناروے اوسلو کی ثقافت میں اردو کی کہیں گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی آپ نے وہاں سے بازگشت رسالہ جاری کرنے کی جسارت کیوں کر کی؟

جمشید مسرور ناروے: اوسلو کی ثقافت میں درحقیقت اردو کی گنجائش نہ تھی لیکن 1930 کے بعد صورت حال میں تبدیلی آچکی تھی۔ رفتہ رفتہ وہاں برصغیر کے تارکین وطن کی تعداد ہزار کے لگ بھگ ہوچکی تھی جن میں تارکین وطن کی پہلی نسل کی وجہ سے فی الحال اردو کی بہت گنجائش ہے۔ اوسلو کی تمام لائبریریوں میں اردو کی تمام مشہور کتابیں دستیاب ہیں۔ شہر میں کہیں نہ کہیں اردو میں لکھے ہوئے اشتہارات بھی نظر آجاتے ہیں۔ میں خود اوسلو یونیورسٹی میں نائب استاد کے طور پر نارویجین شاگردوں کو اردو پڑھاتا ہوں، لہٰذا بازگشت کی بہت ضرورت تھی۔ آئندہ کے کیا حالات ہوں ان کا سایہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ تارکین وطن کی نسلیں اردو سے پیار تو کرتی ہیں لیکن لکھنے پڑھنے میں کوتاہی برتتی ہیں۔

جلیل: کیا اوسلو میں بھی ہندوستان کے غیراردوداں طبقوں کی طرح اردو شاعری کی لوگ گنے کی مانند چوس رہے ہیں؟

جمشید: اردو کا ناروے کی مقامی آبادی سے یقیناً کوئی تعلق نہیں۔ البتہ بہت سے صحن اور بہت سے گھر اب بھی ایسے ہیں جہاں اردو قائم ودائم ہے۔ اگرچہ یہ گھر اور صحن تارکین وطن کے ہیں چند ایک نارویجین نژاد خواتین وحضرات ایسے ضرور ملتے ہیں جو اردو بے تکان بولتے ہیں یا اپنی دلچسپی کی وجہ سے اور یا تو شادی کی وجہ سے۔

جلیل: دیوارِ ہوا پر آئینہ۔ ہم عصر نارویجین شاعر لارِش سوبیئے کرسٹن کی منظوم تخلیقات کو آپ نے اردو شاعری کا لباس کس طرح پہنایا۔ کیا آپ کو اس زبان پر دسترس حاصل ہے؟

جمشید: مجھے نارویجین زبان بھی اچھی لگتی ہے۔ اس کی اپنی خوبصورتیاں ہیں۔ میں اس زبان میں شاعری بھی کرتا ہوں۔ 'دیوارِ ہوا پر آئینہ' میری طرف سے ایک کوشش تھی تاکہ اردو دانوں کو نارویجین زبان سے بھی واقفیت حاصل ہو۔ لارش سوبیئے یہاں کے مشہور ادیب ہیں البتہ ان کی حیثیت ادیب کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے شاعر کے لحاظ سے نسبتاً کم۔

جلیل: 'مجھے تو دیوارِ ہوا پر آئینہ' پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ آپ نے من وعن نارویجین شاعر کی منظوم تخلیقات کو اردو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ روح میں گداز پیدا کرتی ہے:

وہ روشنی کہ میرے بچپنے کی دوپہریں
وفورِ نور سے بھرتی رہی زمانوں کو
کہاں سے لاؤں اسے کس طرح بلاؤں اُسے
وہ ایک پنکھے کی صورت تھی میرے ہاتھوں میں

یہ سارے اشعار دل کے تار کو جھنجھناتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جمشید: لارش ایک شہری بچہ تھا اس کا بچپن اور لڑکپن اوسلو کی گلیاں ناپتے گزرا۔ اس کی شاعری میں ایک ترقی

یافتہ معاشرے کے تنہا تنہا بچوں اور لڑکوں کا دکھ دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی بات ان کی نظموں کی جان ہے۔

جلیل: آپ زیادہ شاعر ہیں یا صحافی؟

جمشید: میں اوّل اور آخر شاعر ہوں۔ صحافی نامہ نگار، سفرنامہ نگار ادیب اور ہدایت کار یہ ثانوی مشاغل ہیں۔

جلیل: آپ کن شاعروں سے متاثر ہوکر شاعر بنے؟

جمشید: اپنے والد ڈاکٹر مسرور کپورتھلوی کی صحبت اور رہنمائی نے شاعر بنا دیا۔ ہر اچھے شاعر کو پسند کرتا ہوں۔ البتہ گرویدہ بیدل، غالب اور فیض کا ہوں۔

جلیل: آج کس قسم کی شاعری کی ضرورت ہے کیونکہ آج کا انسان روحانی اعتبار سے مردہ ہے؟

جمشید: انسان روحانی اعتبار سے نہ آج مردہ ہے نہ پہلے کبھی تھا۔ البتہ دنیا میں بدی کی قوتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ تناسب ہزاروں سال پہلے بھی تھا آج بھی ہے۔ ہمیں اپنے گڑھے سے جتنا آسمان نظر آئے ہم اسے ہی زندگی کی حقیقت سمجھتے ہیں اور زندگی کا دورانیہ لیکن بات اس سے زیادہ ہے۔

جلیل: ادب میں آج کل دو ذہنی رویے میں ترقی پسند انحراف کی شاعری اور جدید Alienation بیگانگی اور خود نفسانیت کا شکار آپ نے کس کا اثر زیادہ قبول کیا اور کیوں؟

جمشید: ترقی پسند انحراف کی شاعری یا جدید اجنبیت زدہ یا جو بھی ہے اسے اچھی شاعری ہونی چاہیے۔ بالعموم ایسا ہے کہ بے شمار شعرا اپنے کام میں کچھ ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی روش کو شعوری طور پر اپناتے ہیں اور مضحکہ خیز شاعری کرتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ شاعری کے متعدد حصے کو لاشعوری مزاحیہ اور بے معنی شاعری سمجھتا ہوں۔ جو محض عشق سخن ہے سخن نہیں ہے۔

جلیل: شاعر کون ہے؟

جمشید: شاعر اپنی جنم بھومی میں ایک گم کردہ اجنبی ہے اگر وہ تلمیذ الرحمٰن نہیں ہے تو وہ بھانڈ بدزبان، چغل خور حاسد اور علم مسخرہ ہے۔

جلیل: ہم عمر شاعروں میں کون پسند ہیں؟

جمشید: میرے ہم عمر شعرا میں کئی شاعر بہت اچھی شاعری کرتے ہیں، نام لینا مشکل کام ہے۔

جلیل: اپنی تخلیقات کا نام بتائیے اور پہلی منظوم تخلیق کا عنوان کیا تھا؟

جمشید: بے شمار منظوم تخلیقات اپنی ہی تنقید کی نذر ہوگئیں لہٰذا پہلی منظوم تخلیق کسے کہوں۔

جلیل: آپ شاعری کیوں کرتے ہیں؟

جمشید: میں شاعری صرف اس وقت کرتا ہوں جب شاعری مجھ پر کیفیت کی طرح وارد ہو۔ کیوں کرتا ہوں اس کا جواب مشکل ہے شاید فطرت کی طرف سے یہ فریضہ ہے۔

جلیل: سوئے جاناں، روئے جاناں اور موئے جاناں کی شاعری کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جمشید: ہر کوئی اپنی ہمت اور وجدان کے مطابق شاعری کرتا ہے۔ بری شاعری خود بخود ضائع ہوجاتی ہے۔ اس کے بارے میں چنداں تردد کی ضرورت نہیں پڑتی؟

جلیل: لکھتے وقت کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے؟

جمشید: اس مخصوص پکار کے بغیر میں شاعری کر نہیں پاتا شاید اس لیے ابھی تک بیس اور پچیس دیوان تیار نہیں کر پایا وہ کیفیت اور ہوتی ہے جب میں اپنی بستی میں راہِ گم کردہ اجنبی ہوتا ہوں۔

جلیل: اپنی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جمشید: میری شاعری میری روح کا عکس ہے۔ میں کبھی وہ شعر نہیں کہتا جو خود بخود میرے جسم و جاں کی گہرائیوں سے پیدا نہ ہو، شاید وہاں دکھ ہی دکھ ہیں اور تنہائیاں ہی تنہائیاں۔

جلیل: آج کی زندگی کے بارے میں آپ اوسلو میں رہ کر کیا سوچتے ہیں جہاں معاشی استحکام ہے کیا یہ سچ نہیں کہ عام انسان کیڑا مکوڑہ بن کر رہ گیا ہے، سیاسی میدانوں میں بدبو ہی بدبو زندگی کے ہر قدم پر مذہبی عصبیت کی ہم سڑاند محسوس کرنے پر مجبور ہیں۔ اقربا پروری ظالمانہ استحصال، رشوت خوری اور گروپ بندی ایک قہر ہے کیا یہ سچ نہیں ہے،

جمشید: آپ کے سوال میں بہت کچھ سچ ہے لیکن کچھ سچ بعض پس منظر میں زیادہ سچ لگتے ہیں اور بعض میں ادھورا سچ۔

جلیل: کیا آج کا شاعر عام آدمی کا آئیڈیل ہے تو کس طرح؟

جمشید: شاعر کبھی عام آدمی کا آئیڈیل نہیں ہوتا اپنے ملکوں میں تو عام شاعر اپنی قیمت بھی اتنی کم سمجھتا ہے کہ اس کی قیمت ادا کرنے والے بھی اس کی عزت نہیں کرپاتے۔

جلیل: اوسلو کی ثقافت، تہذیب، معاشرہ اور سماجی زندگی سے آپ مطمئن ہیں؟

جمشید: ناروے دنیا کے نہایت ترقی یافتہ ممالک میں آتا ہے اور گنتی کے چند امیر ترین ممالک ہیں۔ یہاں کی تہذیب معاشرہ اور سماجی زندگی اتنی اچھی ضرور ہے کہ بظاہر مغربی اقدار پسند کرنے والے بھی یہاں آکر واپس

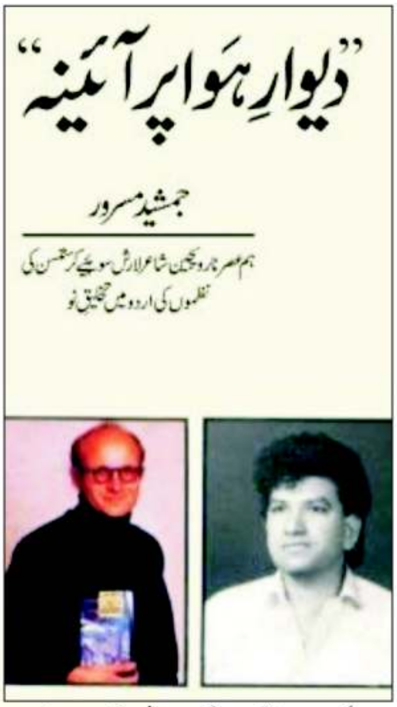

اپنے ملکوں کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ یہی ان کے دوغلے پن اور منافقت کی واضح ترین علامت ہے۔

جلیل: آپ کی سرگرمیاں کیا ہیں؟

جمشید: ریسرچ کونسل آف ناروے اور اوسلو یونیورسٹی میں کام کرتا ہوں۔ رسالہ بازگشت شائع کرتا تھا۔ مشاعرے اور موسیقی کے کنسرٹ بھی کروالیتا ہوں۔

جلیل: آپ کی زندگی کے خواب کیا ہیں؟

جمشید: بہت سے خواب تھے بہت سے خواب ہیں۔

جلیل: آپ نے اب تک کن ملکوں کا دورہ کیا کہاں کی تہذیب کہاں کے لوگ پسند آئے؟ اور کیوں؟

جمشید: میں نے مغربی یورپ کے بہت سے ممالک کے علاوہ کینڈا، امریکہ اور بھارت کو دیکھا ہے سبھی جگہ اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لہٰذا میں عموماً تبصرے سے گریز کرتا ہوں۔

جلیل: میں ممبئی سے آپ کے پیار، خلوص اور اپنا پن کو سونگھ رہا ہوں جو میرے لیے آپ کے دل کی گہرائیوں میں ہے۔ ہزاروں میل دور رہ کر اردو کے رنگا رنگ پھول اگانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ خدا حافظ۔

جمشید: میں بھی وہی محسوس کررہا ہوں جو آپ محسوس کررہے ہیں اردو کی خدمت آپ بھی کررہے ہیں۔ خدا حافظ۔

■

Jalil Bazidpuri
C/o Dr. Gayan Parkash Ary
Ayurvedic Shop
Khand Par
PO Distt: Sheikhpura - 811105 (Bihar)

تبصرے اور حوالہ جات (References)

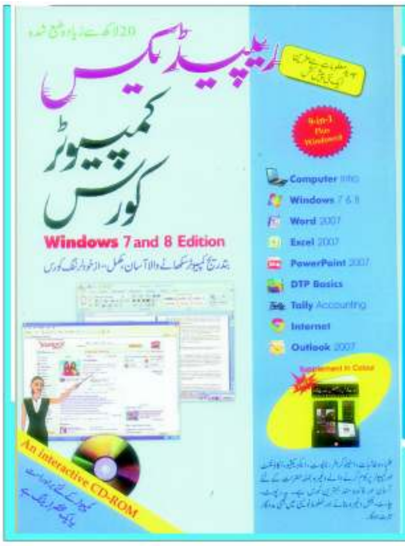

فٹ نوٹ حصہ (Footnote Section)

References ٹیب کے فٹ نوٹ حصہ کے ذریعے آپ اپنی دستاویز میں فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ جوڑ سکتے ہیں۔ یہاں فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ کے درمیان بنیادی فرق جان لینا چاہیے۔ فٹ نوٹ ٹیکسٹ کے نیچے یا جس صفحہ پر ٹیکسٹ ہے، اس صفحہ کے نیچے جوڑا جاتا ہے۔ اینڈ نوٹ دستاویز کے اخیر میں یا سیکشن کے اخیر میں جوڑا جاتا ہے۔ ایم ایس- ورڈ میں آپ آسانی سے اپنی دستاویز میں فٹ نوٹ یا اینڈ نوٹ جوڑ سکتے ہیں۔ References ٹیب کے Footnote حصہ میں کل چار بٹن ہوتے ہیں۔ فٹ نوٹ جوڑنا (Insert Footnote)، اینڈ نوٹ جوڑنا (Insert Endnote)، اگلا فٹ نوٹ (Next Footnote) اور نوٹس دیکھنا (Show Notes)۔ ان سبھی بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) فٹ نوٹ جوڑنا (Inserting Footnote): ورڈ کی دستاویز میں فٹ نوٹ جوڑنا ماؤس کے بٹن کو کلک کرنے کی طرح ہی آسان ہے۔ سب سے پہلے آپ جس لفظ یا الفاظ کے گروپ میں فٹ نوٹ جوڑنا چاہتے ہیں، اس کا انتخاب کیجیے۔ اس کے بعد References ٹیب کے Footnotes حصہ میں Insert Footnote بٹن پر کلک کردیجیے۔ بٹن پر کلک کرتے ہی منتخبہ ٹیکسٹ کے اوپر (سپر اسکرپٹ کی طرح) ایک نمبر لگ جائے گا اور جس پیج پر وہ ٹیکسٹ ہے، اس پیج کے نیچے وہی نمبر لگ کر نقطہ شمول (Cursor) وہاں پہنچ جائے گا۔ آپ اپنی خواہش کے مطابق فٹ نوٹ ٹائپ کیجیے اور فٹ نوٹ علاقہ سے باہر پوری دستاویز میں کہیں بھی کلک کیجیے۔ فٹ نوٹ فوراً جڑ جائے گا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جس بنیادی ٹیکسٹ کے لیے آپ نے فٹ نوٹ دیا ہے، اس پر ماؤس پوائنٹر لے جاتے ہیں اس سے جڑا فٹ نوٹ نظر آتا ہے، جیسا کہ آپ تصویر WD-8.8 میں دیکھ سکتے ہیں۔

تصویر WD-8.8: فٹ نوٹ جوڑنا

(ii) اینڈ نوٹ جوڑنا (Inserting Endnote): اینڈ نوٹ جوڑنا فٹ نوٹ جوڑنے کی ہی طرح ہے۔ اس کے لیے References ٹیب کے Footnote حصہ میں Insert Endnote بٹن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اینڈ نوٹ دستاویز کے اخیر میں جڑتا ہے۔ جیسے جیسے آپ دستاویز میں فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ جوڑتے جاتے ہیں، ویسے ویسے ان میں خود ہی نمبر جڑتے جاتے ہیں۔ آپ کو الگ سے نمبر جوڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ فٹ نوٹ یا اینڈ نوٹ کو ہٹانے کے لیے ٹیکسٹ میں لگے نمبر (سپر اسکرپٹ) کا انتخاب کر کے Backspace کنجی دبائیں۔ نمبر مٹنے سے اس سے جڑا فٹ نونٹ یا اینڈ نوٹ بھی مٹ جاتا ہے اور باقی سبھی فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ کے نمبر اپنے آپ ہی ری سیٹ ہوجاتے ہیں۔

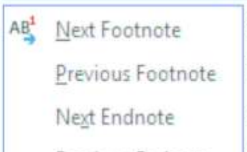

تصویر WD-8.9: فٹ نوٹ مینو

(iii) نوٹس دیکھنا (Navigating through Notes): Insert Endnote کے نیچے دیے گئے Next Footnote بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کرنے سے ایک چھوٹا پل- ڈاؤن مینو کھلتا ہے (تصویر WD-8.9)، جس میں Next Footnote، Previous Footnote، Next Endnote اور previous Endnote نامی چار آپشنز ہوتے ہیں۔ ان آپشنز پر کلک کرکے آپ بالترتیب اگلے فٹ نوٹ، پچھلے فٹ نوٹ، اگلے اینڈ نوٹ اور پچھلے اینڈ نوٹ پر جاسکتے ہیں۔ Next Footnote بٹن کے نیچے دیے گئے Show Notes بٹن پر کلک کرنے سے View Footnotes نامی ایک چھوٹا ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-8.10) کھلتا ہے، جس میں مناسب آپشن چن کر آپ فٹ نوٹ علاقہ یا اینڈ نوٹ علاقہ دیکھ سکتے ہیں۔

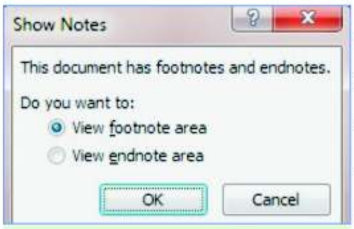

تصویر WD-8.10: فٹ نوٹ دیکھنے کے لیے ڈائیلاگ باکس

تصویر WD-8.11: فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ ڈائیلاگ باکس

فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ ڈائیلاگ باکس (Footnote and Endnote Dialog Box): References ٹیب کے Footnotes حصہ کے ڈائیلاگ باکس لانچر

پر کلک کرنے سے Footnote and Endnote ڈائیلاگ باکس تصویر WD-8.11 کی طرح کھلتا ہے۔ اس کے ذریعے آپ فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ کی جگہ اور فارمیٹ وغیرہ طے کرسکتے ہیں۔

Footnote and Endnote ڈائیلاگ باکس میں Location عنوان کے نیچے Footnotes آپشن پر کلک کرنے سے اس کا لسٹ باکس ایکٹو ہوجاتا ہے، جس کے ذریعے آپ فٹ نوٹ کی جگہ صفحہ کے اخیر میں یا اس ٹیکسٹ کے اخیر میں سیٹ کرسکتے ہیں۔ اسی طرح Endnote آپشن پر کلک کرکے اس کے لسٹ باکس کے ذریعے آپ اینڈ نوٹ کی جگہ دستاویز یا سیکشن کے اخیر میں سیٹ کرسکتے ہیں۔ Location میں ہی دیے گئے Convert بٹن کی مدد سے آپ سبھی فٹ نوٹوں کو اینڈ نوٹ، اینڈ نوٹوں کو فٹ نوٹ، یا فٹ نوٹوں اور اینڈ نوٹوں کو آپس میں تبدیل کرسکتے ہیں۔

اس ڈائیلاگ باکس میں Format عنوان کے نیچے دیے گئے Number Format لسٹ باکس کے ذریعے آپ فٹ نوٹ اور اینڈ نوٹ کے نمبروں کا فارمیٹ طے کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے Custom Mark کے سامنے دیے گئے Symbol بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے Symbol ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے۔ آپ کوئی بھی نشان چن کر OK بٹن پر کلک کردیجیے۔ ایسا کرنے پر Custom Mark کے بغل میں دیے گئے ٹیکسٹ باکس میں چنا ہوا نشان آجاتا ہے اور آپ کی دستاویز میں جڑنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ Start at اسپن کنٹرول باکس کے ذریعے آپ یہ طے کرسکتے ہیں کہ آپ فٹ نوٹوں اور اینڈ نوٹوں کے نمبر کہاں سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح Numbering لسٹ باکس کی مدد سے آپ یہ طے کرسکتے ہیں کہ آپ یہ نمبر پوری دستاویز میں لگاتار دینا چاہتے ہیں، یا ہر سیکشن یا ہر پیج سے نئے نمبر شروع کرنا چاہتے ہیں۔ جب آپ اپنی ضرورت کے مطابق ساری تبدیلیاں کرلیں، تو Apply بٹن پر کلک کردیں۔

کیپشن حصہ (Caption Section)

تصویر WD-8.12: کیپشن ڈائیلاگ باکس

References ٹیب کے کیپشن حصہ میں دیے گئے بٹنوں کے ذریعے آپ اپنی دستاویز میں دی گئی تصویروں کو مناسب کیپشن بھی دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ مشمولات کی فہرست کی طرح دستاویز میں تصویروں کی فہرست بھی شامل کرسکتے ہیں اور ان کے لیے آسان حوالہ جات دے سکتے ہیں۔ References ٹیب کے Captions حصہ میں چار بٹن ہوتے ہیں۔ کیپشن جوڑنا (Insert Caption) تصویروں کی فہرست کا ڈائیلاگ باکس (Table of Figures Dialog Box) تصویروں کی فہرست اپڈیٹ کرنا (Update Table of Figures) اور حوالہ جات (Cross-References)۔ ان سبھی بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) **کیپشن جوڑنا (Inserting Caption)**: اگر آپ دستاویز میں تصویر جوڑتے ہیں، تو ان کو کیپشن دینے کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے۔ ایم ایس-ورڈ میں یہ کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے، آپ جس تصویر کے لیے کیپشن جوڑنا چاہتے ہیں، اس پر کلک کرکے اس کا انتخاب کریں۔ اس کے بعد References ٹیب میں Captions حصہ کے Insert Caption بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر Caption ڈائیلاگ باکس تصویر WD-8.12 کی طرح کھلتا ہے۔

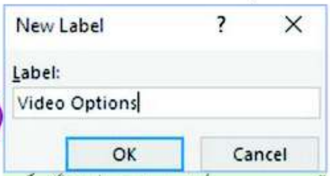

تصویر WD-8.13: نیا لیبل جوڑنے کے لیے ڈائیلاگ باکس

اس ڈائیلاگ باکس میں آپ دیکھیں گے کہ سب سے اوپر Caption: ٹیکسٹ باکس میں Figure1 لکھا ہوا ہے اور اس میں کرسر ٹمٹما رہا ہے۔ آپ اپنی خواہش کے مطابق Figure 1 کی جگہ پر کوئی دوسرا ٹیکسٹ بھی ٹائپ کرسکتے ہیں۔ Caption آپشن کے نیچے Options موجود ہے، جس کی مدد سے آپ کیپشن کا لیبل اور اس کا مقام وغیرہ متعین کرسکتے ہیں۔ Label لسٹ باکس کو کلک کرنے پر ایک پل-ڈاؤن مینو کھلتا ہے، جس میں تین آپشن ہوتے ہیں۔ Equation، Figure اور Table۔ آپ ان میں سے کوئی بھی آپشن چن کر لیبل سیٹ کرسکتے ہیں۔

اگر آپ ان تینوں آپشنز سے الگ ٹیبل سیٹ کرنا چاہتے ہیں، تو New Label... بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے New Label ڈائیلاگ باکس تصویر WD-8.13 کی طرح کھلے گا۔

آپ Label: ٹیکسٹ باکس میں من چاہا لیبل ٹائپ کرکے OK بٹن پر کلک کردیجیے۔ نیا لیبل سیٹ ہوجائے گا۔ Options دیے گئے Position لسٹ باکس کے ذریعے آپ کیپشن کو چنی ہوئی تصویر یا ٹیبل کے اوپر یا نیچے جوڑ سکتے ہیں۔

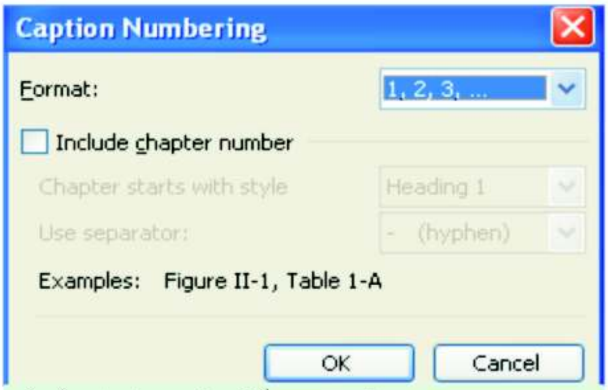

تصویر WD-8.14: کیپشن میں نمبر جوڑنے کے لیے ڈائیلاگ باکس

Exclude label from caption چیک باکس میں کلک کرنے سے کیپشنز میں کوئی لیبل نہیں دیا جائے گا اور تصویروں کو صرف نمبر دے دیا جائے گا۔ New Label... بٹن کے بغل میں دیے گئے Delete Label بٹن کی مدد سے آپ کوئی لیبل ہٹا بھی سکتے ہیں۔ اس کے لیے Label لسٹ باکس میں مطلوبہ لیبل بھریے اور Delete Label بٹن پر کلک کردیجیے۔ لیبل فوراً ڈلیٹ ہوجائے گا۔ یاد رکھیں، آپ صرف وہی لیبل ڈلیٹ کرسکتے ہیں، جن کو آپ نے خود بنایا ہے، ورڈ میں پہلے سے موجود لیبل آپ ڈلیٹ نہیں کرسکتے۔

ورڈ میں کیپشنز کا نمبر فارمیٹ 1,2,3... اس طرح سیٹ کیا گیا ہے۔ آپ اس فارمیٹ کو بدل کر a,b,c... i,ii,iii... وغیرہ کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے Caption ڈائیلاگ باکس میں Numbering..... بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے Caption Numbering ڈائیلاگ باکس تصویر WD-8.14 کی طرح کھلے گا۔ Format لسٹ باکس میں مناسب فارمیٹ چن کر OK بٹن پر کلک کیجیے۔ فارمیٹ سیٹ ہوجائے گا۔

Caption ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-8.12) کے 'Auto Caption...'

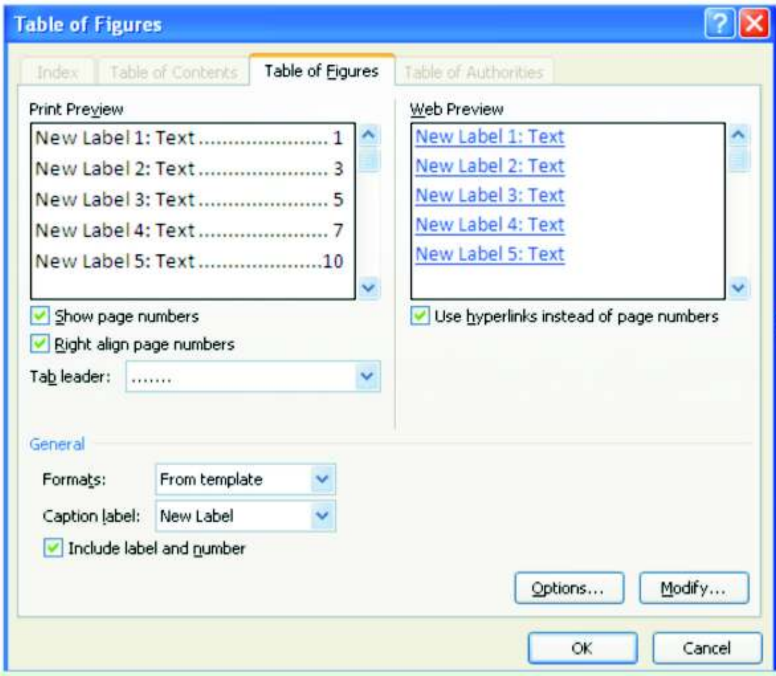

تصویر15 WD-8:تصویروں کی فہرست جوڑنے کے لیے ڈائیلاگ باکس

بٹن کی مدد سے آپ چنے ہوئے عناصر (Elements) میں ورڈ کے ذریعے ہی کیپشن جڑوا سکتے ہیں۔ جب آپ مطمئن ہوجائیں، تو OK بٹن پر کلک کر دیجیے۔

(ii) تصویروں کی فہرست کا ڈائیلاگ باکس (Table of Figures Dialog Box): مشمولات یا موضوعات کی فہرست کی طرح آپ دستاویز میں تصویروں کی فہرست بھی بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے Insert Caption کے بغل میں دیا گیا Table of Figures Dialog بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے Table of Figures ڈائیلاگ باکس تصویر WD-8.15 کی طرح کھلے گا، جو Table of Contents ڈائیلاگ باکس سے کافی ملتا جلتا ہوگا۔ اس میں آپ Table of Contents ڈائیلاگ باکس کی طرح تبدیلی کرکے OK بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر نقطہ شمول کی جگہ پر تصویروں کی فہرست جڑ جائے گی۔

یاد رکھیں، یہ تصویروں کی فہرست تبھی جڑ سکتی ہے، جب آپ نے Insert Caption بٹن کے ذریعے تصویروں کے کیپشن دیے ہوں۔ موضوعات کی فہرست کی طرح تصویروں کی فہرست کی سبھی ہیڈنگ بھی ہائپرلنک کا کام کرتی ہیں۔

(iii) تصویروں کی فہرست اَپڈیٹ کرنا (Updating Table of Figures): اگر آپ تصویروں کی فہرست جوڑنے کے بعد اپنی تصویروں کی جگہ، کیپشن وغیرہ بدلتے ہیں، تو تصویروں کی فہرست کو اَپڈیٹ کرنے کے لیے صرف فہرست کو چن کر Table of Figures Dialog بٹن کے نیچے دیے گئے Update Table of Figures بٹن کلک کیجیے۔ فہرست خود ہی اپڈیٹ ہوجائے گی۔

(iv) باہمی حوالہ دینا (Giving Cross-reference): دستاویز میں کبھی کبھی آپ کو باہمی حوالہ دینے کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے کہ جب آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی دستاویز کا قاری جب ایک خاص پیراگراف پڑھے، تو اسی دستاویز میں کسی دوسرے صفحہ پر دی گئی تصویر کو بھی دیکھے۔ اس کے لیے آپ 'See Sec، Picture، Figure Below'، 'Turn to Page7' جیسے باہمی حوالے دیتے ہیں۔ ایم ایس- ورڈ میں یہ کام References ٹیب کے Captions حصہ میں Cross- reference بٹن کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

Reference type لسٹ باکس میں باہمی حوالہ دیے جانے والے عنصر (Element) کو طے کریں۔ یہ عنصر ہیڈنگ، فٹ نوٹ، تصویر، ٹیبل وغیرہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آپ لسٹ باکس سے موزوں آپشن چن سکتے ہیں۔ مان لیجیے، آپ کسی ہیڈنگ کے لیے باہمی حوالہ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے لسٹ باکس میں Heading آپشن چنیے۔ آپشن چنتے ہی ڈائیلاگ باکس کی خالی ونڈو میں پوری دستاویز میں دی گئی ہیڈنگ آجائیں گی۔ آپ ان میں سے مطلوبہ ہیڈنگ چنیے۔ اس کے بعد Insert reference to لسٹ باکس کھولیے۔ اس کے ذریعے آپ یہ طے کرسکتے ہیں کہ آپ باہمی حوالہ میں کیا دینا چاہتے ہیں۔ اس لسٹ باکس میں متعدد آپشن ہیں، جن کی مدد سے آپ باہمی حوالہ میں ہیڈنگ کا عنوان، صفحہ نمبر، ہیڈنگ نمبر یا صرف اوپر/ نیچے دے سکتے ہیں۔ مناسب آپشن کو چن کر Insert بٹن پر کلک کیجیے اور ڈائیلاگ باکس Close بٹن (x) کے ذریعے بند کردیجیے۔ باہمی حوالہ جڑ جائے گا۔

ریفرنسز ٹیب کی دیگر خصوصیات (Other Features of References Tab)

References ٹیب کی مدد سے آپ متعدد پیچیدہ کام آسانی سے کرسکتے ہیں۔ اوپر بتائے گئے کاموں کے علاوہ آپ اپنی دستاویز میں کتابیات (Bibliography)، مقتدرہ کی فہرست (Table of Authoities) وغیرہ بھی جوڑ سکتے ہیں لیکن یہ سبھی آپشن زیادہ استعمال میں نہیں لائے جاتے۔ سبھی آپشنز پر تفصیلی جانکاری دینا یہاں ممکن نہیں، اس لیے یہاں عام اور زیادہ استعمال میں آنے والے آپشن سمجھائے گئے ہیں۔ دیگر آپشنز کے بارے میں جاننے کے لیے آپ Help سہولت کی مدد لے سکتے ہیں۔

■

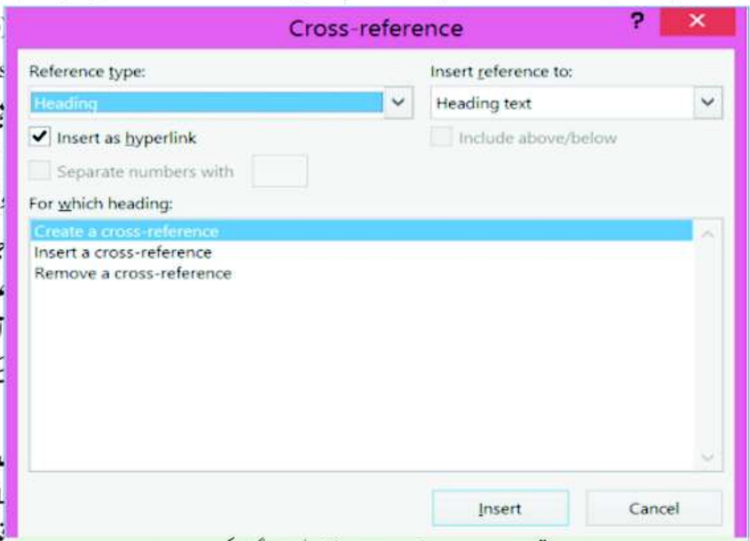

تصویرWD-8.16:باہمی حوالہ دینے کے لیے ڈائیلاگ باکس

ہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز7 اور 8/آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015،
اشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
ون نمبر: 011-23275434,23262683

مقدمہ کلام آتش

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

صفحات: 134، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2019

پبلشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی 25

مبصر: ثمرین، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خلیل الرحمٰن اعظمی بیسویں صدی میں اردو شعروادب کے منظر نامہ پر ایک عہد ساز شخصیت بن کر ابھرے۔ ترقی پسند تحریک کی ہمنوائی میں انھوں نے اپنے فکروفن کے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ انھوں نے اپنے تنقیدی رویوں سے مستقبل میں تنقید نگاروں کے لیے اور شعروادب کے دیگر پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور ان کے گوشوں کو اجاگر کرنے اور اس کے معیار کو متعین کرنے کی راہ ہموار کی۔

زیر نظر کتاب 'مقدمہ کلام آتش' خلیل الرحمٰن اعظمی کے تحقیقی کارناموں میں سب سے پہلا تحقیقی مقالہ ہے اور تمام تصانیف میں سب سے پہلی تصنیف بھی ہے اور اس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ کارنامہ اس وقت انجام کو پہنچا جب موصوف طالب علم تھے اور بی اے کر رہے تھے۔ یہ زمانہ 49-1948 کا تھا اور قسط وار نگار سے شائع ہوا۔ اس مقالے نے نیاز فتح پوری جیسے انا پسند اور سخت گیر نقاد کو بھی دادو تحسین دینے پر مجبور کر دیا۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں: ''جناب اعظمی جس دقت نظر اور امعان نظر سے کام لے رہے ہیں وہ آتش کے باب میں اب تک کسی صاحب علم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی ہے''۔ بہت سے ادبا نے اس اولین کارنامہ کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا اور دادو تحسین سے نوازا۔ اسی مقالے کی وجہ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو 'آتش پرست' کا خطاب دیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے بیشتر تنقیدی مضامین شاعر اور شاعری کے متعلق ہیں چونکہ وہ ایک شاعر تھے اس لیے انھیں فطری طور پر شاعری سے دلچسپی تھی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'کاغذی پیرہن' 1955 میں، دوسرا مجموعہ 'نیا عہد نامہ' 1965 میں، تیسرا اور آخری مجموعہ 'زندگی اے زندگی' 1983 میں ان کی وفات کے بعد شائع ہوا نیز ان کی بے شمار نثری تحریریں 'فکروفن'، 'مضامینِ نو'، 'زاویہ نگاہ'، 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' اور 'نوائے ظفر' وغیرہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف نثر و نظم کے اعلیٰ نمونے پیش کیے بلکہ ادب کو ایک نئی سمت و رفتار سے روشناس کرایا۔ خلیل الرحمٰن نے آتش اور کلام آتش کو بغور پڑھا اور ہر پہلو سے مطالعہ کیا۔

کتاب کا پیش لفظ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر جناب شیخ عقیل نے تحریر کیا ہے، حرفِ چند کے عنوان سے خلیل الرحمٰن اعظمی کی اہلیہ نے دو باتیں کتاب کے اور اپنے شوہر سے متعلق کہی ہیں۔ ساتھ ہی خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا کتاب کے بارے میں اظہارِ خیال 'احوالِ واقعی' کے نام سے درج ہے اور اس کے بعد تمہید کا نمبر آتا ہے جو کہ مشہور و معروف ناقد آل احمد سرور کا تحریر کردہ ہے۔ جس طرح اس کتاب کی اہمیت ہے اسی طرح یہ تمہید بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کا پہلا باب 'تذکرہ' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے اس میں آتش کے حالات زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان 'چھان بین' ہے۔ اس سے خلیل الرحمٰن اعظمی نے تمام تنقیدی آرا کو یکجا کیا ہے جو اب تک آتش کے کلام اور ان کی شخصیت کے سلسلے میں دی گئی ہیں۔ اس باب میں خلیل الرحمٰن اعظمی مختلف ناقدین کی آرا کو ردو قبول کرتے ہوئے اپنی رائے قائم کرتے ہیں اور مناسب نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ تیسرا باب 'آتش کا فن' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب تین قسطوں پر مشتمل ہے اور کتاب کا سب سے اہم اور غیر معمولی حصہ ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے آتش کے شخصی مزاج اور ماحول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے فکروفن، فنکاری کے رموز اور کارنامے کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے اور ہمیں اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ شاعری میں، خصوصی طور پر غزل کی شاعری میں وہ کون سے عناصر اور علاماتی خصوصیات ہیں جو اس دور کے پہلے یا اس دور کے شاعر میں نہیں پائی جاتیں اور جو آتش کی شاعری کے فن میں اجزائے ترکیبی کی شناخت کا درجہ رکھتی ہیں۔

چوتھے باب کا عنوان 'عشقیہ شاعری' ہے۔ آتش واقعی عشق اور رندی و سرمستی کے شاعر تھے۔ آتش کے یہاں عشق زندگی کے جذبے کا نام ہے اور جس کو ہجر و وصال میں منقسم نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ عشق کو زندگی کا ہمزاد تصور کرتے ہیں۔ آتش کا عشق بازاری عشق نہیں ہے بلکہ سچی اور پر خلوص محبت ہے۔

پانچواں باب 'خمریات' ہے۔ آتش کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں خمریات اور شراب وغیرہ کا ذکر ہے۔ آتش کی خمریات کا انتخاب بہت مختصر ہے مگر ایک انفرادیت رکھتا ہے۔

اس کتاب کا چھٹا باب 'تصوف' کے عنوان سے ہے جس میں آتش کے کلام میں تصوف کے عناصر سے بحث کی گئی ہے۔ صوفیانہ شاعری میں کیفیت کے جو اوصاف ہونے چاہئیں وہ آتش کے یہاں نہیں پائے جاتے اس لیے آتش کی صوفیانہ شاعری کا یہ پہلو کمزور نظر آتا ہے۔ آخر میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ آتش کی فنی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے اس دور کے دوسرے شعرا خصوصاً ناسخ پر بڑے ہی لطیف انداز میں طنز کیا ہے۔ آتش کے فن کے اس تیسرے حصے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے آتش اور ناسخ کا موازنہ کیا ہے۔ ساتھ ہی تصوف، خمریات اور مسائل حیات کے عنوانات کے تحت خلیل صاحب نے آتش کے اچھے اشعار کو یکجا کر دیا ہے۔

'مقدمہ کلام آتش' اس اعتبار سے اہمیت تصنیف کی حامل ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ادبی سرمائے کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور غور و فکر کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے۔

بقول آل احمد سرور ''یہ مطالعہ آتش کے متعلق خصوصاً اور ہمارے قدیم ادب کے متعلق عموماً سنجیدہ، پرخلوص اور مفصل جائزوں میں مدد دے گا اور آتش پر گفتگو کرتے وقت اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔'' بے شک یہ تصنیف آتش کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

تحقیق و تنقید

سوز و گداز زندگی

مرتب: پروفیسر عبدالحق

صفحات: 300، قیمت: 500، اشاعت: 2019

ناشر: اقبال اکیڈمی (ہند)، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد شاہد خان، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، یوپی

پروفیسر عبدالحق کی ہر نئی کتاب کی حیثیت اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک اضافے کی ہوتی ہے اور اسی اضافے کی ایک اہم کڑی یہ کتاب بھی ہے۔ یہ کتاب پروفیسر عبدالحق کی زندگی کے گونا گوں قلمی واردات کا بیش بہا نمونہ ہے۔ شاید اسی لیے اس کا عنوان 'سوز و گداز زندگی' ہے لیکن یہ زندگی کا صرف وہ سوز و گداز نہیں ہے جو نشیب وفراز کی شکل میں ابھرتا ہے۔ بلکہ ادبی زندگی کا سوز و گداز ہے۔ جو آج اردو ادب کے افق پر ایک ستارے کی مانند اس طرح درخشاں ہے، جس طرح ایک روشن ستارہ اندھیری رات کے مسافر کا راہرو ہوتا ہے۔ یہی مثال پروفیسر عبدالحق کی ادبی زندگی کی بھی ہے کیونکہ پروفیسر عبدالحق کی ادبی زندگی کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ انھوں نے ہمیشہ نو وارد طالب علم کی رہبری اور رہنمائی کی ہے۔ اور یہی فعل زندگی کا ثمرہ بھی ہوتے ہیں۔ اب یہ فعل چاہے ادبی ہوں، لسانی ہوں، معاشرتی ہوں، طبقاتی ہوں یا پھر اقتصادی ہوں، ان کی مقبولیت پر حرف نہیں آتا اور پروفیسر عبدالحق کی مقبولیت تو اردو ادب کی تاریخ میں مسلم ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں اور یہ کوئی مبالغے کی بات بھی نہیں اور نہ ہی میں مبالغے کی بات کرتا ہوں کیونکہ

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

تاہم اس کتاب کے مطالعے سے پروفیسر عبدالحق کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی نشیب وفراز کی بھی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کتاب کی اہمیت و افادیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ جن کے مطالعے سے پروفیسر عبدالحق کے تقریباً تمام ادبی پہلو کی وضاحت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں مختلف نوعیت کے کل اکیس مضامین ہیں۔ یہ تمام مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ چونکہ ہر مضمون میں پروفیسر عبدالحق کی ادبی خدمات کو اسی تناظر میں دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔ جس تناظر میں موصوف نے خامہ فرسائی کی ہے۔ تاہم اس کتاب کا پہلا مضمون 'اپنے قلم سے' جو کہ خود مصنف کا تحریر کردہ ہے، بڑا معلوماتی اور انکشافاتی نوعیت کا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر عبدالحق نے اپنی ادبی دنیا کی تقریباً پچاس سالہ زندگی کے سفر کو اس عمدگی کے ساتھ قلمبند کر دیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے ادبی سفر میں پروفیسر عبدالحق کو جن مصیبتوں، آفات اور حوادث اور رنج و الم سے دوچار ہونا پڑا اس کا ذکر نہایت شائستہ انداز میں اس طرح کیا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن ان واقعات کے اثرات ایک قاری کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ یہ اثرات بڑے عمیق اور دیرپا ہیں۔ تاہم حیران کن امر یہ ہے کہ پروفیسر عبدالحق نے ان تمام لوگوں کو معاف بھی کر دیا بلکہ تحریری ضمانت بھی دے دی جو تمام عمر ان کی جان، مال اور تعلیمی ترقی کے دشمن رہے۔ حالانکہ یہ بڑا صبر آزما کام ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں اس لیے ہر کسی کی شخصیت ایسی صفات کی متحمل بھی نہیں ہوتی اور آج تو ہمارے اردو ادب کا دامن ایسی صفات کی حامل شخصیات سے بالکل عاری ہے۔

چنانچہ اس کتاب کی اہمیت ان معنوں میں دوگونہ ہو جاتی ہے کہ اس میں ضمیمے کے طور پر پروفیسر عبدالحق کی دیگر تصانیف کی پوری فہرست موجود ہے۔ ساتھ ہی ان کی ادبی خدمات پر اب تک کتنی پی ایچ ڈی اور ایم فل کی ڈگریاں تفویض ہو چکی ہیں، ان کی فہرست بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ خطوط کا عکس بھی منسلک کیا گیا ہے۔ گویا اس کتاب میں پروفیسر عبدالحق کی زندگی کے اچھے برے تمام تجربات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جو ان کی زندگی میں پیش آئے۔ گویا پروفیسر عبدالحق نے ہر طرح کے تجربات اور واقعات کو تحریر کا جامہ پہنا دیا ہے جسے ہر ادب کا بڑے سے بڑا ادیب و ناقد اپنی رسوائی کا سامان سمجھ کر اسے تحریر کرنا تو دور ان کا ذکر کرنا بھی معیوب سمجھتا ہے لیکن یہ پروفیسر عبدالحق کی ایمانداری کی وہ مثال ہے جو تحریری شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ ورنہ اس دشت خار میں لوگ سمجھ کر ہی قدم رکھتے ہیں۔ تاہم یہ دیانت داری صرف ان کی تحریروں میں ہی نہیں بلکہ ان کی پوری شخصیت اور رویے میں بالکل صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کے مطالعے کے بعد میرے ذہن میں میر تقی میر کا یہ بار ہا شعر گردش کرتا رہا جو کہ پروفیسر عبدالحق کی شخصیت پر صادق آتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

الغرض اس کتاب کے جملہ مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں اور پروفیسر عبدالحق کے ادبی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے اس کتاب کی اہمیت تحقیق کے طالب علم کے لیے مشعلِ راہ کی سی ہے کیونکہ اس کتاب میں پروفیسر عبدالحق کے سوانحی کوائف کا اجمالی تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ گویا یہ کتاب پروفیسر عبدالحق کی ادبی زندگی کی ایک دستاویز ہے جس کے تقریباً تمام مضامین عمدہ، صاف، سادہ اور سلیس زبان میں رقم کیے گئے ہیں اور کسی کتاب کی کامیابی کا راز اس کے اندازِ اسلوب، زبان اور بیان میں پوشیدہ ہوتا ہے اور یہی اس کتاب کا خاصہ بھی ہے۔ امید ہے کہ اردو ادب کی دنیا میں اس کتاب کا فراخ دلی سے استقبال کیا جائے گا۔

تلامذہ داغ دہلوی (پہلی جلد)

مرتب: شاہد احمد جمالی

صفحات: 320، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور

مبصر: سلمان فیصل، 370/6A ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

اردو شاعری میں داغ دہلوی کو شہرت دوام حاصل ہے۔ یہ ان کی شاعری کا ملکہ ہے جس کی وجہ سے ان کا علم بلند ہے۔ داغ کی مقبولیت کی ایک وجہ اور ہے، وہ ان کے شاگردوں کی تعداد ہے۔ کیونکہ جس کثرت سے داغ کے شاگرد ہیں شاید ہی اس تک کسی اور شاعر کے شاگردوں کی تعداد پہنچتی ہو۔ داغ دہلوی کی مقبولیت بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے۔ کیوں کہ اُس زمانے میں ہر شاعر اپنے آپ کو داغ سے وابستہ کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا داغ کی شاعری اور ان کے فن کا جس طرح مطالعہ و محاکمہ کیا گیا ہے، ان کے شاگردوں پر بھی ریسرچ کی گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ڈاکٹر شاہد احمد جمالی کی مرتبہ کتاب 'تلامذہ داغ دہلوی' بھی ہے۔ یہ کتاب عنقریب ہی منظر عام پر آئی ہے۔ ڈاکٹر شاہد جمالی کی ادبی شخصیت راجستھان میں مقبول عام و خاص ہے۔ انھوں نے راجستھان کی اردو تاریخ پر بہت کام کیا ہے۔ تقریباً بیس کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ ان کی

مشہور تصانیف میں غالب اور راجستھان، تذکرہ اولیاء راجستھان، تذکرہ شعرائے راجپوتانہ، نظیر حسن سخا دہلوی، قیسی رامپوری اور تلامذہ داغ کی شعری خدمات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔اس وسیع کینوس پر داغ کے شاگردوں کے احوال اور ان کے نمونۂ کلام منظّم اور احسن طریقے سے پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں تو اس سے قبل بھی تلامذہ داغ پر کام ہوا ہے مثلاً احسن مارہروی نے 'جلوۂ داغ' میں 32 تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح محمد اکبر افسوں نے اپنی کتاب 'یادگار داغ' میں 91 تلامذۂ داغ کی فہرست مہیا کرائی ہے۔مزید یہ کہ اسعد بدایونی نے داغ کے مشہور گیارہ شاگروں پر 'داغ کے اہم تلامذہ' میں خامہ فرسائی کی ہے۔ایک کتاب ڈاکٹر اصغر کمال کی 'شاگردان داغ کی ادبی خدمات' بھی ہے۔ڈاکٹر شاہد جمالی نے اپنی اس کتاب میں 'سبب تالیف' کے تحت لکھا ہے کہ داغ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیاد ہے۔انھوں نے تمکین کاظمی کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ ان کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں ہیں۔خود احسن مارہروی نے اپنی کتاب 'جلوۂ داغ' میں شاگردان داغ کی تعداد آٹھ سو سے زائد کی نشاندہی کی ہے جو کہ ایک رجسٹر میں تلامذہ داغ کی فہرست کے مطابق ہے۔اس بات کا تذکرہ شاہد جمالی نے بھی کیا ہے۔اسی کے پیش نظر شاہد جمالی نے یہ قدم اٹھایا کہ کیوں نہ داغ کے تمام شاگردوں کے احوال کو اکٹھا کیا جائے اور انھوں نے اس پر خوب محنت کی ہے۔جس کے نتیجے میں انھیں تین سو کے قریب شعرا کے احوال اور نمونۂ کلام دستیاب ہو گئے، جو مختلف تذکروں میں بکھرے ہوئے تھے۔انھیں تذکروں سے شاہد جمالی نے ان تمام شعرا کے احوال کو یکجا کر کے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کی ہے اور اس طرح انھوں نے 256 تلامذۂ داغ کا تذکرہ کیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ ''راقم کے تذکرے 'تلامذۂ داغ' (پہلی جلد) میں 256 تلامذہ میں سے 20 یا 22 ایسے ہیں جن کے حالات و آثار نہیں مل سکے، لیکن نمونۂ کلام اور شہر کا نام ضرور درج کیا ہے۔......راقم کو ایک سکون قلب حاصل ہے کہ شاید پہلی بار حضرت داغ کے تلامذہ اتنی بڑی تعداد میں ایک ساتھ نظر آرہے ہیں۔'' شاہد جمالی اس بات پر خوش ہیں کہ وہ پہلی مرتبہ اتنی بڑی تعداد میں تلامذہ داغ کو یکجا کر کے ان کے احوال کو ایک ہی کتاب میں پیش کر رہے ہیں۔انھوں نے اس ترتیب میں یہ کام بھی کیا ہے کہ جس شاعر کے بارے میں جس تذکرے یا رسالے سے مواد حاصل کیا ہے اس کو من وعن اس کتاب میں نقل کر دیا اور حوالہ درج کر دیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں شاہد جمالی نے تلامذۂ داغ کے احوال کو الف بائی ترتیب سے پیش کیا ہے اور اس ترتیب میں تخلص کو پیمانہ مقرر کیا گیا ہے۔اس کتاب کے ابتدائی حصے میں پیش لفظ شکیل الرحمٰن نے لکھا ہے۔مقدمہ کے عنوان سے ڈاکٹر معین الدین شاہین نے خامہ فرسائی کی ہے۔نذیر فتح پوری کا 'ندی بہتی ہے..' کے عنوان سے ایک مختصر مضمون شامل ہے۔ان حضرات نے اس کتاب اور شاہد جمالی کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔گویا کہ ابتدائی تیس صفحات میں شاہد جمالی اور کتاب کا تعارف شامل ہے جس سے کتاب کی اہمیت اور شاہد جمالی کی ادبی قدر و منزلت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کی ظاہری صورت خوبصورت سروق کے ساتھ غیر مجلد ہے۔گلوبل پبلکیشن جے پور کی جانب سے عمدہ طباعت پیش کی گئی ہے۔ پروف ریڈنگ کی غلطیاں شاذ و نادر ہی ہیں۔تلامذۂ داغ کے سلسلے میں ایک اچھی اور تحقیقی کتاب منظر پر عام آئی ہے۔امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے قبولیت دوام حاصل ہوگی۔

پروفیسر عبدالمغنی: ناقد و دانشور

مصنف: ڈاکٹر عارف حسن وسطوی

صفحات: 224، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2019

زیر اہتمام: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ، دربھنگہ

مبصر: وسیم مینائی

تارین جلال نگر، شاہجہاں پور 242001 (یوپی)

اردو شعر و ادب میں کشش و جاذبیت اتنی ہے کہ مختلف شعبہ جات ولسانیات کے ماہرین اردو میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرنے کو اپنا شعار سمجھتے آئے ہیں۔ ہزاروں شخصیات کا نام اس ضمن میں گنوایا جاسکتا ہے۔ان میں ایک نام پروفیسر عبدالمغنی کا بھی ہے جو انگریزی کے پروفیسر تھے اور تمام عمر اسی زبان میں درس و تدریس سے جڑے رہے لیکن اردو کی شیرینی اور ہر دلعزیزی نے انھیں اقبال شناس اور جدید محقق و ناقد کے مراتب عطا کیے۔

اردو اور انگریزی میں ان کی کم و بیش 44 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔اس نامور شخصیت پر اردو میں مقالہ بعنوان 'پروفیسر عبدالمغنی: حیات اور ادبی کارنامے' لکھ کر محمد عارف حسن نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اب قدرے کم و بیشی کے ساتھ وہی تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں پروفیسر عبدالمغنی: ناقد و دانشور' کے نام سے شائع ہوا جو زیر مطالعہ ہے۔ یہ کتاب 2019 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے ذریعے اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ 224 صفحات کی اس کتاب میں اصل مواد سے پہلے مصنف کا پیش لفظ، پروفیسر عقیل ہاشمی کا مقدمہ اور پروفیسر نجم الہدیٰ کی تقریظ شامل ہے۔بعد ازاں پروفیسر عبدالمغنی سے متعلق خصوصاً اردو تصنیفات و تالیفات کے حوالے سے جتنے عنوانات بن سکتے تھے سبھی موجود ہیں۔مصنف ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کو تحقیق و تنقید کا ڈھنگ معلوم ہے۔زبان رواں، شستہ اور فصیح ہے۔بیانات کو معتبر و مستند بنانے کے لیے جتنے بھی اقتباسات نقل کیے ہیں سبھی کے حوالے کتاب کے اخیر میں درج ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عارف حسن وسطوی نے پروفیسر عبدالمغنی حیات اور ادبی خدمات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ان کی فکری پرواز کو پرکھا اور نوک قلم کی روش کو پہچانا ہے تب اس موضوع پر کام شروع کیا۔انھوں نے سب سے پہلے 'پروفیسر عبدالمغنی حیات و شخصیات' کے عنوان سے مفصل مضمون لکھا۔اس میں ذیلی عنوانات کے تحت مدارج حیات کو پیش کیا ہے جن سے شخصی تصویر، تعلیم و تعلم، عادات و اطوار آنکھوں میں تیرنے لگتے ہیں۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں کو تفصیل دی گئی ہے۔مصنف نے پروفیسر صاحب کی اہم تصانیف، ان کی تنقید نگاری، اسلوب نگارش اور دیگر ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔واضح کردوں کہ پروفیسر عبدالمغنی اردو شعر و ادب کی نئی نئی تحریکوں سے نہ صرف پریشان رہتے تھے بلکہ سخت مخالفت بھی کرتے تھے۔پرانی روش کی پیروی کرنے والے شخص تھے۔مثال کے طور پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تنقیدی روش کے مخالف تھے۔آزاد شاعری کو سرے سے خارج کر دیا تھا۔اس قدر شدت سے مخالفت کی کہ کبھی بھی مصلحتاً ہی سہی موافقت کے لیے نہیں سوچا۔اس باوقار شخص نے اردو ادب کے لیے اتنا کام کیا ہے کہ ہمیشہ اردو ادب احسان مند رہے گا۔

اسلامی تاریخ کے ساتھ قرآن و احادیث پر پروفیسر عبدالمغنی کی زبردست پکڑ تھی اسی ضمن میں اقبال کے نظریے کے بھی دلداہ تھے۔علامہ اقبال کے ہر فلسفے کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔شرعی علوم اور اقبال شناسی نے ان کے تنقیدی نظریے کو ہی بدل دیا تھا۔

پروفیسر عبدالمغنی کی انانیت کا چرچا بیشتر ادیبوں نے کیا ہے۔اس کا اثر ان کے تنقیدی نظریات پر بھی صاف نظر آتا ہے۔جبکہ انھوں نے سخت رویے سے ہمیشہ پرہیز کیااورکوشش اس بات کی کی ہے کہ کسی طرح شخصیت یا ادبیت مجروح نہ ہو۔گیارہ عدد تنقیدی تصانیف کا تحفہ اردوادب کو دینے کے باوجودانھیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ حقدار تھے۔

ڈاکٹر عارف حسن خاں نے اپنے خاندانی وقاراور علم پرستی کوقائم ودائم رکھتے ہوئے یہ بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ان کے والدمحترم ڈاکٹر انوارالحسن وسطوی نے بھی تنقیدی مقالوں کے کئی مجموعے قارئین کی عدالت میں پیش کیے ہیں۔پروفیسر عبدالمغنی کے حوالے سے عارف حسن وسطوی کی یہ کتاب تشنگان ادب کے لیے بیش قیمتی سرمایہ ہے۔

ادب: عکاس حیات

مصنف: ایم۔عالم،مرتب: ایم عارف
صفحات: 174، قیمت: 250،سنہ اشاعت: 2019
پبلشر: عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی
مبصر: مومنہ خاتون،بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر،نئی دہلی

اردو کے ادبی منظرنامے پر ایم۔عالم کی شخصیت متنوع جہت کی حامل ہے۔انھوں نے بیشتر نثری اصناف میں طبع آزمائی کی اوراپنی ایک منفرد شناخت مستحکم کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے نہ صرف خاکے، انشائیے، افسانے، انٹرویوز، اورتبصرے لکھے بلکہ اپنے ادبی مضامین کے ذریعے ملک کے سیاسی، سماجی، معاشی، قومی وملی اورلسانی مسائل کوموثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔یہی نہیں بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے ملک کے عوام کوخواب غفلت سے بیدار کرنے کا بھی کام انجام دیا۔نیز مشرقی تہذیب وتمدن کی اصل روح کوقاری کے اندراتارنے کی بھرپور سعی کی۔ان کی تحریریں ملک اور بیرون ملک کے متعدد ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ایم۔عارف نے انھیں مضامین کو بہت ہی محنت اورلگن کے ساتھ ترتیب دے کر مصنف کی تخلیقی اور تنقیدی بصیرت کو عام قارئین تک پہنچانے کا کام کیا ہے۔زیر تبصرہ مجموعہ مضامین میں کل تیرہ (13) مضامین کے علاوہ ڈاکٹر ایم۔عارف کا 'ایم۔عالم کا تخلیقی سفر' اور محمد محسن عالم کا 'پہلا ورق' شامل ہے۔ایم۔عارف نے اپنے مضمون میں ایم۔عالم کی زندگی کے نشیب وفراز، ادبی سفر کی تفصیل، خاندانی جاہ وحشمت اور سلطنت مغلیہ کی ملازمت کی اجمالی تفصیل، ٹانڈہ ضلع فیض آباد یوپی سے بتیا بہار تک کے سفراور مختلف مصائب وآلام کی روداد کو بہت ہی موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ایم۔عالم کے تخلیقی سفر کو پڑھتے ہوئے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ کسی بھی ازم کے پابند نہیں تھے بلکہ ان کی اپنی ایک آزادانہ فکر تھی جس کو وہ اپنی تخلیقات اور تنقیدات میں پیش کرتے تھے۔ایم عالم کی فیاضی، مہمان نوازی، مطالعے کا شوق، پیشہ اور غیر پیشہ ورانہ درس وتدریس سے وابستگی کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس مضمون سے ایم عالم کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون 'اردو ہماری مادری زبان ہے'۔ جذباتیت اور خطیبانہ اسلوب سے بھرپور معلوماتی مضمون ہے۔اردو جسے مشترکہ تہذیب کی زبان کہا گیا، جسے ہندوستان کی لنگوا فرینکا کی زبان کہا گیا، جس نے ملک کی آزادی میں اپنا کردار ادا کیا، جس کی ہندوستانیوں نے اپنے خون سے پرورش وپرداخت کی آج اسے کس طرح تعصب کی عینک سے دیکھا جارہا ہے، یہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔اردو زبان کسی خاص فرقے، مذہب، قوم یا کسی خاص خطے اورعلاقے کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ پورے ملک کی زبان ہے۔اس مضمون کو پڑھتے ہوئے ایم۔عالم کی تخلیقی نثر اور افسانوی رنگ وآہنگ سے لطف اندوز بھی ہوں گے اوراردوزبان کے متعلق سوچنے اور غوروفکر کرنے پر مجبور بھی ہوں گے۔دوسرا مضمون 'ادب عکاس حیات' ہے۔اس مضمون میں ادب کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ادب کو زندگی کا آئینہ، زندگی کا عکاس اور ترجمان قرار دیا گیا ہے وہیں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ادب صرف اظہار ذات یا ابلاغ کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک نظریہ حیات ہے۔ادب ہماری سائیکی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے، اس مضمون کو پڑھتے ہوئے اندازہ کرسکتے ہیں۔یہی مضمون کتاب کا عنوان بھی ہے۔تیسرا مضمون 'زمین زندگی کی شاعری ہے' میں فرنگی شاعر کے مقولے کی اہمیت اور اس کی افادیت کو بہت ہی مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔زمین، زندگی اور شاعری کو ایک ساتھ اور الگ الگ کرکے دیکھا جائے تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ تینوں ایک ہی تسبیح کے دانے اورایک ہی لڑی میں مربوط ہیں۔یہ ایک ہی تسبیح کے دانے اورایک ہی لڑی میں مربوط کیسے ہیں؟ اس کی تفصیل کے لیے پورے مضمون کی تفصیلی قرأت کیجیے تاکہ زمین، زندگی اور شاعری کی جہت آپ پر بھی واضح ہو جائے۔چوتھا مضمون 'تشکیل معاشرہ کے لیے تعمیری فکر ونظر ناگزیر ہے' میں ایک مہذب اور پاکیزہ معاشرے کی تشکیل کیسے کی جاسکتی ہے، اس کے لیے کن کن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے، کون کون سے افکار ونظریات کام کرتے ہیں، مہذب معاشرے کی تشکیل میں تعلیم وتربیت کا کیا رول رہا ہے، والدین اور اساتذہ کی ذمے داریاں کیا ہیں، انھیں اپنے فرائض منصبی کو کس طرح نبھانا چاہیے وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔پانچواں مضمون 'معاش اور معاشرہ' ہے۔یہ بھی اہم مضمون ہے جس میں لفظ 'معاش' 'معاشرہ' اور 'بدمعاش' وغیرہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کرکے سماج اور معاشرے میں اس کے مثبت ومنفی اثرات کو واضح کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔چھٹا مضمون 'بہار میں اردو افسانہ نگاری' ہے۔ادبی نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم مضمون ہے جس میں بہار کے تخلیق کاروں کے تخلیقی کارناموں کا تفصیل سے احاطہ کرتے ہوئے 1904 میں علی محمود کی صنف افسانہ میں سب سے پہلی تخلیق 'چھاؤں' اور 'ایک پرانی دیوار' کو نہ صرف بہار کا بلکہ اردو کا پہلا افسانہ اور افسانہ نگار مانا ہے۔اس کے بعد مسلم عظیم آبادی، نورالہدیٰ ندوی، علی اکبر کاظمی، زبیر احمد، آفتاب حسین اور مآثر عظیم آبادی کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد جمیل مظہری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، شکیلہ اختر، سید محمد محسن، غیاث احمد گدی، انور عظیم، شبلی ابراہیمی، جمیل احمد گدھائی پوری، کلام حیدری، الیاس احمد گدی، شکیل الرحمٰن، شاکر کریمی، عظیم اقبال، گربچن سنگھ، احمد یوسف، رضوان رضوی، شفیع مشہدی، شمس ندیم، مناظر عاشق ہرگانوی، سید احمد قادری، عبدالصمد، ذوقی، احمد صغیر، صغیر رحمانی، شموئل احمد، مشتاق احمد نوری کے علاوہ اور بہت سے نئے لکھنے والوں کے افسانوی مجموعوں کی روشنی میں ان پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے جس سے بہار میں اردو افسانے کی سمت ورفتار متعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ جو دیگر اہم مضامین ہیں ان میں 'اقبال کا فلسفۂ حیات، سعادت حسن منٹو کے فکر وفن میں عورت ذات، اردو ادب کا ایک درخشاں کہانی کار آنجہانی راجندر سنگھ بیدی، عالم طنزیات کا قطب مینار آنجہانی فکر تونسوی، محقق اعظم قاضی عبدالودود، ''ظ انصاری اور خسرو کا ذہنی سفر'' ایک مطالعہ' 'زیرلب ایک جائزہ' وغیرہ ہیں جن کے مطالعے سے ایم۔عالم کی فکری جہات اور وسعت مطالعہ کے ساتھ ان کی بے باک اور ازم سے خالی مثبت زاویہ فکر کا پرتو سامنے آتا ہے۔یہ کتاب جسے ایم۔عارف نے بہت ہی محنت اور خلوص کے ساتھ ترتیب

دیا ہے اس سے ان کے ادبی لگاؤ اور ادب شناسی کا جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ اس کتاب میں پروف اور طباعت کی کوئی غلطی نظر نہیں آئی۔ سرورق دیدہ زیب ہے، قیمت مناسب ہے۔ امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

قدیم وجدید ادبیات

مصنف: غلام نبی کمار

صفحات: 384، قیمت: 450، اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: خان محمد رضوان، اسکالر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کتاب 'قدیم وجدید ادبیات' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) جواں سال اسکالر غلام نبی کمار کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا خوبصورت گلدستہ اور اردو ادب کے قارئین کے لیے گراں قدر اور بیش بہا تحفہ ہے۔ اس میں کل بائیس مضامین شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل مضامین کو موضوعات اور مواد کے اعتبار سے تین گوشوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گوشہ کلاسیکی ادب سے متعلق ہے جس میں 'امیر خسرو کی غزلیہ شاعری'، 'مولانا مملوک العلی کی مکتوب نگاری'، 'اردو میں مومن شناسی کی روایت'، 'سرسید کے سماجی افکار کی عصری معنویت'، 'داغ کی مثنوی نگاری: فریادِ داغ کی روشنی میں' اور 'رباعیات حالی میں قومی اصلاح'۔

اسی طرح دوسرا گوشہ جدید ادب پر ہے اس میں 'افسانوی ادب کا ایک گم شدہ فن کار: بلونت سنگھ'، 'پروفیسر ظہیر احمد صدیقی: حیات وخدمات'، 'مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار: ایک تجزیاتی مطالعہ'، 'شوکت پردیسی: شخصیت اور شاعری'، 'زبیر رضوی کی ادبی خدمات' اور 'نور شاہ۔فکر اور فکشن: ایک تجزیاتی مطالعہ'۔ اس کے بعد تیسرے گوشے میں نو وہ مضامین ہیں جن کا تعلق اصناف اور دبستانوں کے شعرا سے ہے جیسے '1960 کے بعد اردو نظم میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب'، 'دبستانِ دہلی کے چند اہم غزل گو شعرا'، 'جموں وکشمیر کی معاصر اردو شاعری'، 'بچوں کے چند اہم نمائندہ غزل گو شعرا'، 'مشرقی پنجاب میں اردو نظم کا حالیہ منظرنامہ'، 'اردو زبان میں سائنسی صحافت'، 'کتاب نما اور بعض اہم خصوصی شمارے'، 'ذہن جدید اور زبیر رضوی' اور 'خواتین کی خودنوشتوں کے تجزیوں کا تجزیہ' قابل ذکر مضامین ہیں۔

'قدیم وجدید ادبیات' میں شامل تمام مضامین ایسے ہیں جن کو کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کم عمری میں اتنے جامع اور معیاری مضامین لکھنا یقیناً مضمون نگار کی فکر کی پختگی اور ان کے عمیق مطالعے کا ثبوت ہیں۔

اس کتاب میں شامل سبھی مضامین لائق اعتنا ہونے کے ساتھ ہمیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ انھیں ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں دیکھا۔ اس کتاب کے سبھی مضامین پر تو لکھنا مشکل ہے۔ تقریباً تمام مضامین عمدہ اور عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں اور تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ ایک مضمون 'امیر خسرو کی غزلیہ شاعری' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے متعلق خود مضمون نگار کا بھی دعویٰ ہے جس کا اظہار انھوں نے مقدمہ میں کیا بھی ہے کہ یہ مضمون بہت جستجو کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے امیر خسرو کے گھریلو حالات، خاندانی وجاہت اور ان کا شعری پس منظر بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ امیر خسرو اپنے ہندی وکلام کو کبھی بے وقعت تصور نہیں کرتے تھے۔ بعد ازاں ان کے اشعار کے حوالے سے شعری قدر وقیمت کو بھی بے حد خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ امیر خسرو ہماری تہذیب کی علامت ہیں اور 'ہندو مسلم ثقافت' کی زندہ مثال بھی۔ اس طور پر یہ مضمون اہمیت کے اعتبار سے بے حد اہم ہے۔

اسی طرح ایک اور عمدہ اور جامع مضمون 'مولانا مملوک العلی کی مکتوب نگاری' پر ہے۔ جس کی ابتدا میں دلی کالج اور اس کے طلبہ واساتذہ کے متعلق بنیادی باتوں کے علاوہ مملوک العلی کی تبحر علمی اور ان کی کتابوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اردو میں مکتوب نگاری کے تعلق سے غالب، آزاد، اقبال اور سرسید کے نام سرفہرست ہیں ان سبھوں کے خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سلیس، عام فہم اور بے تکلف انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مملوک العلی جن کے خطوط کو دریافت ہوئے بہت دن نہیں ہوئے ہیں ان میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مصنف نے ان باتوں کو صراحت کے ساتھ تحریر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ مولانا نے کن کن اہم شخصیات کو خطوط لکھے اور ان خطوط کی خاص بات کیا ہے؟

اس کتاب میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک عمدہ اور وقیع مضمون 'افسانوی ادب کا ایک گم شدہ فن کار: بلونت سنگھ' کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان کو پڑھتے ہی مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ فکشن کی دنیا کا چمکتا دمکتا ستارہ بلونت سنگھ گم شدہ کب سے ہوگئے اور کیوں کر ہوگئے جب کہ بلونت سنگھ قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، مہندر ناتھ، ممتاز مفتی اور خدیجہ مستور کے ہم عصر تھے جنھوں نے افسانہ، ناول، ناولٹ، ڈرامے اور مزاحیہ مضامین لکھے خاص بات یہ ہے کہ کم ہی لوگ ہیں جن کی تخلیق ہندی میں بھی شائع ہوئی ہے ان کے دس افسانوی مجموعے اور چوبیس ناول ہندی میں شائع ہوئے یہ اور بات ہے کہ ان کے سارے افسانوی مجموعے پاکستان سے شائع ہوئے۔ اس کتاب میں جہاں بلونت سنگھ کی تخلیقات پر گفتگو کی گئی ہے وہیں 'جگا' جو کہ خوبصورت رومانی افسانہ ہے اس پر بھی عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح ان کا افسانہ 'ہندوستان ہمارا' پر بھی اچھی گفتگو کی گئی ہے اور ان کی دیگر کہانیوں کو بھی متعارف کرایا گیا ہے۔ لہٰذا بلونت سنگھ پر نہ صرف یہ مفصل بلکہ جامع اور گراں قدر مضمون ہے۔

ایک مضمون 'نور شاہ: فکر اور فکشن: ایک تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے ہے۔ نور شاہ جموں وکشمیر کے نامور افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ دراصل نور شاہ فکر اور فکشن محمد اقبال لون کی مرتب کردہ کتاب ہے جس کا مصنف نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ نور شاہ پر یہ تحقیقی کتاب طلبہ اور تحقیق کرنے والوں کے لیے منارہ نور ہے۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے اس میں نہ صرف اقبال لون کی کتاب کا بہ اعتبار مضمون تجزیہ پیش کردیا ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی اپنی علمی وساطت سے نور شاہ کی علمی لیاقت کی تعیین قدر منصفانہ طور پر کرنے کے علمی کاوش کی ہے جو قابل تحسین ہے۔

میری دل چسپی کا ایک مضمون 'جموں وکشمیر کی معاصر اردو شاعری اور چند اہم غزل گو شعرا' کے عنوان سے ہے۔ یہ وقیع مضمون ہے، اس میں مصنف نے تینوں خطے جموں، کشمیر اور لداخ کے شعرا کا عصری محاکمہ کیا ہے اور بیسویں صدی کے ریاست کے اہم شعرا کے نام فرداً فرداً گنائے بھی، تاکہ ایک عمدہ فہرست بھی تیار ہوجائے۔ اس میں مصنف نے شعرا کے لہجے، زبان وبیان اور الفاظ کے برتاؤ کا بھی اظہار کیا ہے اور شکایت بھی کی ہے دنیائے ادب میں جموں وکشمیر کے معاصر شعرا کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس بات کا برملا اظہار بھی کیا ہے کہ جموں وکشمیر کی اردو شاعری کا اعتراف ریاستی سطح پر بھی کم ہوا ہے۔ بالخصوص وہ اسکالرس جو جموں وکشمیر کے شعری یا عصری منظر نامے پر تحقیق کر رہے ہیں ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

فکشن

علی پور

مصنف: امتیاز غدر
صفحات: 205، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: صبیحہ اطہر، 322، گلی نمبر 9، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 92

علی پور بستی امتیاز غدر کا پہلا ناول ہے۔ اس سے قبل وہ ایک مدت سے افسانے اور ادبی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ علی پور بستی کا موضوع اچھوتا ہے جس پر اردو ادیبوں نے ابھی تک دھیان نہیں دیا ہے۔ ہندوستان میں مردم شماری کی تصویر ابھی بھی صاف نہیں ہے۔ این آر سی کو لے کر عوام میں ناراضگی ہے۔ ابھی حال میں آسام میں جب این آر سی کا معاملہ سامنے آیا تو انیس لاکھ سے زائد لوگوں پر بجلی گری۔ یہ معاملہ فارن ٹریبونل کورٹ میں جاتا ہے تو ہندوستان کے لاکھوں شہری ہندوستانی ہونے کی شہریت سے خارج ہو جائیں گے۔ بہر کیف مردم شماری کے موقع پر مسلم بستیوں میں جو نظارہ ہوتا ہے وہ قابل دید اور قابل رحم ہوتا ہے۔ امتیاز غدر نے بخوبی ایک ایک پہلو کو سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس بات کی بھی سعی کی ہے کہ مردم شماری کے آئینہ میں ہندوستان کی اصل تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔ یہ ہندوستان ہے، جہاں اقلیتیں کراہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ روزگار کا مسئلہ زندگی پر حاوی نظر آتا ہے اور ایک بہت بڑی آبادی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بھوک ہے۔ یہ ایک نوجوان لڑکے لڑکی کی کہانی ہے جو مردم شماری کے لیے علی پور بستی جاتے ہیں اور غور کریں تو علی پور بستی ہندوستان کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اس ناول کا انتساب مشرف عالم ذوقی کے نام ہے۔ ذوقی معروف ناول نگار ہیں اور امتیاز غدر ذوقی کے راستوں پر چلتے ہوئے اس ہندوستان کو دیکھنا چاہتے ہیں، جو ابھی بھی بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ ان کی پہلی کوشش ہے لیکن اس معاملے میں کامیاب ہے کہ امتیاز غدر نے باریک بینی سے گاؤں، مردم شماری اور ہندوستان کے دبے کچلے عوام کے چہرے کو تخلیقی طور پر جینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ناول کے بارے میں مشرف عالم ذوقی رقم طراز ہیں:

''میں نے علی پور بستی کو پڑھنا شروع کیا تو سب سے پہلے مجھے فلم نیوٹن کی یاد آئی۔ ان دنوں ہندوستان میں اچھی فلمیں بن رہی ہیں۔ نیوٹن کی کہانی ایک ایسے نوجوان کی کہانی تھی جو ایک نکسل ایریا میں چناؤ کرانے جاتا ہے اور وہ اس بات سے واقف ہے کہ ایک ووٹ بھی ملک کی ترقی و بہبودی میں کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا بھر کے فلم فیسٹول میں اس فلم کے موضوع کو خوب سراہا گیا۔ کچھ اسی سے ملتا جلتا موضوع علی پور بستی کا بھی ہے۔ مجھے ناول کے لیے یہ عنوان پسند آیا۔ اس سے قبل میں، ممتاز مفتی کا مشہور ناول علی پور کا ایلی پڑھ چکا تھا۔ موضوع کے لحاظ سے علی پور کا ایلی بھی اچھا ناول ہے مگر کئی مقام پر اپنے قاری کو بوجھل بھی کرتا ہے۔ امتیاز غدر نے مردم شماری کا موضوع اٹھایا تو میں یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ اردو میں کبھی بھی، اس موضوع کو برتنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ خاص کر مسلم علاقوں میں مردم شماری کا نظام اس قدر ناقص ہے کہ آج تک مسلمانوں کی صحیح تعداد کا تعین نہیں ہو سکا۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی سطح پر بھی اس 'روٹ' کو دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ غلط مردم شماری کا بوجھ ایک ملک کو کس حد تک اٹھانا پڑتا ہے۔ مردم شماری کو لے کر روسی ناول نگار نکولائی گوگول نے ایک ناول لکھا تھا۔ ڈیڈ سول۔ جو مردہ تھے وہ سرکاری اعداد و شمار میں زندہ تھے۔ اور حکومت ان کے رشتے داروں کو فیضیاب کر رہی تھی۔ گوگول نے روس کی سیاست اور سماج کی ایسی تصویر کشی کی تھی کہ میں آج تک اس ناول کو بھول نہیں پایا۔''

یہ حوالے اس لیے ضروری تھے کہ ایسی بہت سی باتوں کو مردم شماری کے تناظر میں ناول کا حصہ بنایا جا سکتا تھا۔ گوگول نے مردہ روحوں پر یہی تجربہ کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام اور حکومت پر نشانہ سادھا۔ علامتوں کا سہارا لیا۔ زندہ اور مردہ لوگوں میں یہ دیکھنا دلچسپ تھا کہ کون حقیقت میں زندہ ہے اور کون مردہ۔ امتیاز غدر نے بستی کے بدنصیب خاندانوں کا جو المیہ پیش کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ مگر یہاں بھی گنجائش تھی کہ وہ اس کینوس کو اور بڑا کر دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی نئے ناول نگار کے لیے موضوع کو آفاقی بنانا سہل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے برسوں کا تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ چاہیے۔ لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ علی پور بستی سے مردہ انسانوں کی جو چیخ گونجتی ہے، اس کیفیت کو دردمندی کے ساتھ امتیاز غدر نے اپنے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

یہ ناول آزادی کے بعد کے پس منظر کو بھی خوبی سے بیان کرتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کو اکہتر برس میں ہندوستان میں سیاسی، سماجی، ثقافتی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ناول میں جا بجا اس کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ مشہور شاعر اور نقاد سلیم انصاری نے اس ناول کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''امتیاز غدر کے زیر نظر ناول میں جون اور جولی دو مرکزی کردار ہیں جون جوان اور پڑھے لکھے ہیں اور کمپیوٹر کی تعلیم سے آراستہ بھی اور ایک پسماندہ بستی علی پور کی اقتصادی اور تہذیبی مردم شماری کی مہم پر نکلے ہیں اور اپنے کام کے دوران انھیں جن کرداروں سے سامنا ہوتا ہے وہ ہمارے سامنے کے کردار ہیں جو ہمارے معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جون اور جولی کو اپنے کام کے دوران بہت سے تجربات اور مسائل سے آگہی ہوتی ہے جو علی پور کے باشندوں کو درپیش ہیں اس کے علاوہ بستی میں رہنے والے لوگوں کی عادات، اطوار اور طور طریقوں کو بھی اس ناول میں پر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح دیکھیں تو یہ ناول انسانوں کے ایک ایسے معاشرے کی حقیقی کہانی کو بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے جو موجودہ عہد میں سیاسی بے توجہی کا شکار ہے۔ سماجی بے یقینی کا شکار ہے۔ میرے خیال میں یہ کسی بھی ناول کا بنیادی وصف بھی ہے۔ بقول شخصے، ناول ایک طرح کی تصویر کشی کا فن ہے اور یہ اس زمانے کی حقیقی زندگی اور معاشرے کے اس دور کے رسم و رواج اور طور طریقوں کا عکس ہوتا ہے جس دور میں یہ تخلیق کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے امتیاز غدر کا یہ ناول حقیقی زندگی سے قریب تر ہے اور قابل مطالعہ بھی ہے۔''

امتیاز غدر کا یہ پہلا ناول ہے لیکن اس میدان میں وہ کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ ناول کا موضوع بھی مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ادبی حلقوں میں اس ناول کی پزیرائی ہونی چاہیے۔

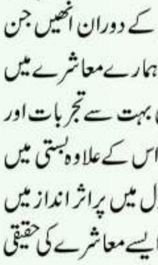

وہ کالا دن

مصنف: ڈاکٹر کلب حسن حزیں
صفحات: 200، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018
مطبع: غوثیہ بک ہاؤس، دہلی
مبصر: صبا انجم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر کلب حسن حزیں تقریباً پندرہ برسوں سے مسلسل انہماک اور ذوق وشوق سے

اردو ادب کی مختلف اصناف میں جیسے غزل، نظم، نعت، منقبت، نوحہ، رباعی، قطعات وغیرہ میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ اوران کی دیگر شاعری کی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'رقص غبار'، 'تطہیر'، 'تنویر کربلہ'، 'ابر گہر یار'، 'گلہائے مؤدت'، 'افکار حزیں'، 'آب رواں'، 'شورعنادل' اور 'چراغ جلتے ہیں' وغیرہ کتابیں ہیں ان کے علاوہ ایک ہندی شعری مجموعہ 'تپتے زخم' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'وہ کالا دن' ڈاکٹر کلب حسن حزیں کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے، اور جس میں انھوں نے اپنی شاعری اور تخلص 'حزیں' کا رنگ پر زور انداز میں چھلکایا ہے یعنی اس میں بعض کہانیوں کے عنوان دوسرے شعرا کے اشعار کے مصروں پر رکھے گئے ہیں، جیسے اس مجموعے کی پہلی کہانی جس کا عنوان 'کتاب زیست کا ایک ورق ہے' جو 'جمیل ظہیر' کے شعر۔

ابھرتے جاتے ہیں الفاظ خود آہستہ آہستہ
کتاب زیست کا کوئی ورق سادہ نہیں ہوتا

کی یاد دلاتا ہے اس کے علاوہ 'عشق پر زور نہیں' اور 'گو ہاتھ کو جنبش نہیں' ہمیں غالب کی یاد دلاتے ہیں۔ کہانی انسانی زندگی کو آداب زندگی بھی سکھاتی ہے اور سماج کے سچے واقعات سنا کر ہمیں اس صورت حال سے یا تو مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتی ہے یا حفظ ما تقدم کی تعلیم دیتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اصل کہانی یا افسانہ وہی ہیں جن میں زندگی کی بھر پور عکاسی ہو۔ ڈاکٹر کلب حسن حزیں کی کہانیاں ایسی ہی ہیں، جن میں نہ صرف زندگی کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ آلام و مصائب اور ناپسندیدہ صورت حال سے مقابلہ آرائی کے گر بھی موجود ہیں۔ چنانچہ 'ترنم'، 'احتجاج'، 'نوٹ بندی'، 'اضطراب'، 'کتاب زیست کا ایک ورق'، 'ندامت'، 'اجنبی'، 'بیچاری'، 'وہ لڑکی' اور 'وہ کالا دن' وغیرہ بھی ایسی ہی کہانیاں ہیں جو جدید رنگ و آہنگ لے کر زندگی کی اس جنگ میں ہمارے کام آتے ہیں۔ اس مجموعے میں مصنف نے کل 51 کہانیاں شامل کی ہیں۔ ان کہانیوں میں ڈاکٹر کلب حسن حزیں نے حقیقتوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ بڑے تخلیق کاروں کی طرح ان کی کہانیاں ادب کا مرقع تو نہیں ہیں لیکن زندگی کی سچائیوں کی مظہر ہیں۔ اس مجموعے میں انھوں نے بورژوائی طاقتوں سے نبرد آزمائی سے لے کر حال میں در پیش ہونے والے مختلف واقعات جیسے 'نوٹ بندی'، 'ماب لیچنگ'، اور غریبوں، مجبوروں، بیکسوں اور مستضعفین کی آہوں کو جمع کر کے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر کلب حسن حزیں صاحب نے آج کے حالات میں پیش ہونے والے اور ایسے کئی موضوعات کو بہت ہی خوبی سے اس مجموعے میں شامل کیا ہے جن کو ہم اکثر و بیشتر فراموش کر بیٹھتے ہیں یا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھول جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات کے علاوہ اس مجموعے میں ایک اور بھی بات ہے جو قاری کی توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہیں وہ یہ کہ موصوف نے اس مجموعے میں اتنی کہانیاں ہونے کے باوجود اتنے عنوانات میں سے صرف 'وہ کالا دن' ہی اپنے اس مجموعے کا نام کیوں رکھا؟ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ کتاب کے سرورق پر ڈھلتی شام اور گہری ہوتی رات کا منظر بھی دکھایا گیا ہے، جس کو دیکھ کر ذہن میں اولین خیال یہی آتا ہے کہ یہ کہانی بیتے وقت میں گزرے کسی حادثے کی یاد دہانی کراتی ہے جس کو مصنف اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا اور اس واقع کو کہانی کا جامہ پہنا دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کہانیاں حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور کوئی بھی تخلیق کار خود یا اپنے آس پاس کے رہنے والوں یا پھر ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہو کر یا پھر وہ واقعات جن کے خلاف وقت رہتے وہ احتجاج نہ کر سکا اور خاموش رہ گیا ہو، وہی واقعات و خیالات ایک وقت کے بعد کسی بھی تخلیق کار کے نہا خانوں میں جب ایک مضبوط درخت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو کبھی افسانہ، کبھی کہانی، تو کبھی ناول یا صنف شاعری کا ادب کی دنیا میں وجود رونما ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر کلب حسن حزیں صاحب نے نہایت ہی خوبی و سلیقے سے اپنی زندگی کے تمام تر تجربات و مشاہدات کے بڑے سے سمندر کو اس کہانی کے مجموعے کی شکل میں ایک کوزہ میں بند کر کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ لیکن ایک بات جو اس مجموعے کے بعد قاری کو بوریت اور بے دلی کا احساس بھی دلاتی ہے کہ اس مجموعے میں درج سبھی کہانیوں کا اختتام ایک ہی جیسا ہے یعنی ناکامی، مایوسی اور اداسی اور رنج و غم سے بھرا ہوا جس سے قاری کو کسی ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لائق مطالعہ کتاب ہے۔

شخصیات

نوائے خاموش

مصنف: معصوم مرادآبادی
صفحات: 191، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی
E-167/1، چوتھی منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'نوائے خاموش' مشہور و معروف صحافی و قلمکار معصوم مرادآبادی کی تصنیف کردہ ہے۔ صاحب کتاب کی ابتدائی تعلیم و تربیت مرادآباد میں ہوئی، جو نہ صرف اپنی زبان، اپنی تہذیب کے لیے جانا جاتا ہے بلکہ وہ ایک زرخیز اور صنعتی شہر بھی ہے۔ ان کی اب تک تقریباً دس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

'نوائے خاموش' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف موصوف نے جن شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ صرف یادگار ہی نہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہیں۔ ان کی تحریریں، ان کی نگارشات اور ان کی روشن شخصیت اور ان کا تابناک ماضی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ نوائے خاموش میں جن شخصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کاوش، جد و جہد اور فطری و خداداد صلاحیتوں سے اپنی منفرد پہچان بنائی، اس کے علاوہ اپنی صلاحیتوں اور علم و دانش مندی سے ہمارے ادبی سرمائے کو مالا مال کیا ہے۔ نوائے خاموش میں تقریباً 23/ نامور شخصیات کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

صاحب کتاب نے ملک زادہ منظور احمد جیسے ممتاز شاعر پر قلم اٹھایا ہے، ان کی شاعری میں وہ حلاوت و چاشنی تھی جو انہیں اپنے ہم عصر شاعروں اور دانشوروں میں ممتاز کرتی ہے۔ شاعر ملک زادہ منظور اردو زبان اور تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ دبستان لکھنؤ کے ایسے آخری ادیب، شاعر اور دانشور تھے جنھوں نے اپنی جاگتی آنکھوں سے اردو زبان و ادب کے عروج و زوال کو دیکھا تھا۔ انھوں نے ایسے نازک وقت میں آنکھیں موندی ہیں جب اردو زبان اور تہذیب کے سامنے خود کو بچانے کا چیلنج در پیش ہے، لیکن اس کے باوجود اپنے نصف صدی سے زیادہ کے شعری اور ادبی سفر میں ان تمام قدروں کو سینے سے لگائے رکھا جو اردو زبان و تہذیب کا خاصہ ہیں۔

فہمیدہ ریاض: پاکستانی ترقی پسند ادیبہ، شاعرہ اور سماجی کارکن برائے حقوق انسانی وحقوق نسواں تھیں۔ وہ ایک انقلابی شاعرہ کے علاوہ ایک منفرد ادیب اور انسانی حقوق کی کارکن بھی تھیں۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خاصی لبرل بھی تھیں۔ ہندوستان میں ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کی زبان تھی جو ہندوستان کی مٹی میں رچی بسی تھی۔ جدید عہد کی ایک ممتاز شاعرہ کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ صرف بائیس سال کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'پتھر کی زبان' منظر عام پر آیا۔ اردو سے شغف اور محبت ہی تھی کہ وہ بی بی سی اردو سے بطور براڈ کاسٹر وابستہ رہیں اور پھر ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد بھی ڈالی۔ وہ بہت ہی لبرل واقع ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنی مشہور نظم 'تم بالکل ہم جیسے نکلے' میں ہندوستانی ماحول اور پھر پاکستان کی شدت پسندی کا بیباکی سے موازنہ کیا ہے۔

صاحب کتاب نے کلدیپ نیر کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ یقیناً یہ ملک کے مایہ ناز صحافی تھے بلکہ یہ صحافت کے علاوہ سیکولرازم اور جمہوریت تینوں کے بہت ہی مضبوط سپاہی تھے۔ جب ان کی صحافتی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ 'انجام' سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بڑے بڑے اخبارات میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔

صاحب کتاب نے فضیل جعفری کے بارے میں بھی لکھا ہے، وہ ایک شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی تھے۔ وہ مشہور ومعروف اردو روزنامہ 'انقلاب' میں ایک بڑے عہدے پر فائز رہے۔ وہ ایک باضمیر انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شہرت پسند لوگوں میں نہیں تھے۔ صاحب کتاب نے زیر تبصرہ کتاب میں ''ابن صفی کا ادبی مقام'' کے عنوان سے ابن صفی کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔

ترجمہ

میزان نقد

مصنف: ڈاکٹر ثمینہ تابش
صفحات: 200، قیمت: 200 روپے
ناشر: ادبیات عالیہ اکادمی، نئی دہلی
مبصر: حمیرا خاتون
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'میزان نقد' عربی زبان کے ناقد میخائل نعیمہ کی تنقیدی کتاب 'الغربال' کا اردو ترجمہ ہے۔ عربی زبان وادب میں تنقید کے حوالے سے الغربال مستند کتاب ہے۔ الغربال مجری ادب کے اصولوں کی آئینہ دار ہے اور ساتھ ہی جدید عربی تنقید کے اصول بھی وضع کرتی ہے۔ غربل، یغربل، غربلۃ کے معنی چھاننے اور پھٹکنے کے ہیں لہٰذا کتاب کا نام 'الغربال' خود ہی تنقید کا مفہوم اور مقصد کی وضاحت کر رہا ہے۔ تنقید کا کام ادبی فن پاروں کے حسن وقبح کی دریافت اور ادب کے پیمانوں کے مطابق ان کے معیار کا تعین کرنا ہے۔ عربی زبان وادب میں اس کتاب کی وہی اہمیت ہے جو اردو تنقید میں مولانا الطاف حسین حالی کی 'مقدمہ شعر وشاعری' کو ہے۔ جس طرح مولانا الطاف حسین حالی نے باقاعدگی سے اردو شاعر کے اصول وضع کیے، مدلل اور واضح اصلاحات کے ساتھ خیالات پیش کیے ہیں اسی طرح میخائل نعیمہ کی الغربال بھی عربی تنقید وادب اور شاعری پر لکھی جانے والی مستند کتاب ہے جسے ثمینہ تابش نے الغربال کا اردو زبان میں آسان وسلیس ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے ترجمہ گاری اپنے آپ میں نہایت مشکل فن ہے۔ لیکن مصنفہ نے اپنے شوق وذوق اور محنت ولگن سے ترجمہ نگاری کے اصولوں پر پورا اترنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں 22 مضمون شامل ہیں جس میں زیادہ تر ادب کا مقصد افادیت واہمیت، تحقیق وتخلیق کے اصول، تنقید کا مفہوم، اہمیت، مقصد کے علاوہ شاعری اور شاعر کے حقوق وفرائض، عروض کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر تنقید کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالات کے جواب بآسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ تنقید کیوں ضروری ہے، ادب سے اس کا کیا تعلق ہے؟ تنقید کے بغیر ادب کا کوئی وجود ہے؟ تنقید ادب کے لیے کیوں ضروری ہے؟ ایسے ہی کئی اہم سوالوں کے جواب ہمیں اس کتاب میں مل جاتے ہیں۔

کتاب میں موجود مضمون 'چھان پھٹک' تنقید کے معنی ومفہوم کی وضاحت کرتا ہے، ایک ادیب وشاعر کو ادب کے تئیں ادا کیے جانے والے فرائض کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے ادیب سماج سے جڑا ہے زندگی میں پیدا ہونے والے سبھی مسائل انسان کے حالات وواقعات سے جڑے ہیں لہٰذا ادیب یا شاعر چونکہ خود سماج کا ہی ایک فرد ہے خود کو سماج سے الگ نہیں کر سکتا۔ دراصل وہی ادب ہے جو مصنف اور قاری کے درمیان پیغام لاتا ہے۔ ناقد موجد، خالق اور مرشد کی حیثیت سے اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ یہ مضمون اس لیے بھی اہم ہے کہ نقاد کی ذمہ داری کے ساتھ تنقید کے مفہوم مختصر ہی سہی مگر جامع عام فہم الفاظ میں بتانے کی بہترین کوشش کی گئی ہے

اس کے علاوہ دیگر مضامین ادب کا محور، ادبی پیمانے، شعر اور عروض، شعر اور شاعر تنقید حوالے سے ہی لکھے گئے ہیں۔ ادب کا محور میں ادب کے پیمانے کیا ہیں اور ادب زمان ومکان کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے اس لیے ادب کو کسی ایک پیمانے پر نہیں ناپا جاسکتا۔ لیکن صرف پیمانوں کا ہونا ہی نہیں بلکہ ان پیمانوں کا صحیح استعمال بھی بے حد ضروری ہے۔

عربی شاعری کی غرض وغایت اور اس کا مقصد کیا ہے، عروض کی اہمیت، نقصان وفوائد، شاعری میں اس کی ضرورت کیوں اور کتنی ہے مضمون شعر اور عروض میں بتایا گیا ہے جو کسی حد تک ٹھیک بھی ہے کہ عروض کے سبب شاعری ایک کاریگری بن گئی ہے۔ علاوہ ازیں مضمون 'جگنو' نہایت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ یہ مضمون فلسفہ، ادب اور تنقید کا امتزاج ہے۔ اس مضمون میں زندگی کا مقصد دریافت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ایسا مقصد جو غفلت میں ڈوبی انسانی زندگی میں اضطراب پیدا کرتا ہے جو جہد مسلسل اور عمل پیہم کا جذبہ عطا کرتا ہے

لہٰذا یہ مضمون قابل غور ہے۔ جہاں تک کتاب کے اسلوب کا تعلق ہے نہایت آسان وفہم ہے مشکل عربی، فارسی کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں جس کے سبب قاری کو تحریر سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

مختصر یہ کہ مصنفہ نے ایک اہم کتاب کا ترجمہ کر کے نا صرف عربی بلکہ اردو دنیا کے علم میں بھی اضافہ کیا ہے۔ یقیناً یہ کتاب دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ افادیت سے بھرپور ہے۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبر نامہ

قومی کونسل کے صدر دفتر میں لیگل پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: تقسیم وطن سے قبل تک اُردو عدالت کی زبان رہی ہے، تاہم قانونی اصطلاحات اور اردو الفاظ کا استعمال آزادی کے بعد بھی بدستور جاری رہا اور اس کی

ضرورت ہنوز محسوس کی جارہی ہے۔ دستاویزی ثبوت کے طور پر ان اصطلاحات اور اردو الفاظ کا استعمال پہلے بھی رہا، آج بھی ہے اور آگے بھی رہے گا۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ لیگل پینل کی میٹنگ میں خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ہند اور ریاستی افسران کو ان اصطلاحات کی تفہیم میں مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھی دقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لیگل پینل کے تحت قومی اردو کونسل ایک سہ روزہ ورکشاپ کا انعقاد کرنے جارہی ہے تاکہ ان شعبوں سے وابستہ افسران اس سے مستفید ہوسکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کے لیے سب سے پہلے دہلی اور این سی آر کے علاقوں کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں پولس کمشنر، این آئی اے کے ڈائریکٹر، سی بی آئی کے ڈائریکٹر، آئی بی کے ڈائریکٹر، RAW کے ڈائریکٹر اور سکریٹریز لینڈ اینڈ بلڈنگ سے درخواست کی جائے گی کہ ان اصطلاحات کی تفہیم سے جڑے مسائل کے حل کے لیے اپنے محکموں سے نمائندوں کو ریفریش کورس کی ورکشاپ میں شرکت کے لیے بھیجیں۔ یہ ورکشاپ فروری میں منعقد کیا جائے گا۔

اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر نزہت پروین خان نے کی۔ اس موقعے پر جناب خواجہ عبدالمنتقم، ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی، ڈاکٹر شکیل معین کے علاوہ، کونسل سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 نومبر 2019

قومی کونسل کے صدر دفتر میں 'یوم آئین' کا اہتمام

نئی دهلی: بھارت کا آئین دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک کا بہترین آئین ہے۔ اس آئین کے بنانے میں ہمارے اکابرین نے جو خدمات انجام دی ہیں، انھی کو یاد کرنے کے لیے 26 نومبر کو ہر سال یوم آئین کے طور پر ملک بھر میں منایا جاتا ہے۔ اس دن بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کی قیادت میں دنیا کا سب سے بہترین دستور 1949 کو معرض وجود میں آیا۔ اس آئین میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف، رائے، عقیدہ،

مذہب اور عبادت کی آزادی، حیثیت اور مواقع کی یکسانیت، اخوت کا فروغ، فرد کی عظمت اور قوم کی سالمیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یوم آئین کے موقع پر صدر دفتر میں منعقدہ پروگرام میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ بھارت کے آئین نے اپنے شہریوں کو برابر کے اختیارات اور حقوق دیے ہیں، لہٰذا شہریوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دل سے اس کا احترام کریں اور اپنی عملی زندگی میں بھی اسے نافذ کریں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہمیں آئین میں دیے گئے اختیارات کے مدنظر ملک کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور اپنے فرائض منصبی کو عبادت کے طور پر انجام دینا چاہیے۔ اس موقع پر کونسل کا تمام عملہ موجود تھا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 نومبر 2019

گوا میں اردو کو جائز مقام دلانے کی یقین دہانی

پنجی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے گوا کے حالیہ دورے کے دوران ریاست کی ایجوکیشن سکریٹری محترمہ نیلا موہنن سے ملاقات کی اور ان سے ریاست میں اردو کی صورت حال اور اردو تعلیم و تربیت کے شعبے میں درپیش مسائل و امکانات پر

گفتگو کی۔اس گفتگو کے دوران جن اہم نکات پر تبادلہ خیال کیا گیا ان میں درجہ پنجم سے اوپر کی کلاسوں میں بطور مضمون اردو تعلیم کے آغاز کو منظوری نہیں دینا، اسکولوں کے نصاب میں اردو بطور مضمون شامل ہونے کے باوجود ریاستی حکومت کا مستقل اساتذہ کی بحالی نہ کرنا اور گذشتہ سات برسوں سے ضلع اسکول انسپکٹر کے ذریعے معائنہ نہ کرنا بھی شامل ہیں۔اس کے علاوہ مختلف اسکولوں کے نمائندوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ وہاں اردو کی نصابی کتابیں وقت پر مہیا نہیں کی جاتی ہیں۔ برسر روزگار اردو اساتذہ کے لیے تربیت کا کوئی معقول نظام نہیں ہے جس سے ان کی تدریسی صلاحیتیں مزید بہتر ہوسکیں۔ڈاکٹر عقیل احمد نے ایجوکیشن سکریٹری سے خاص طور پر اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کی سمت میں کوشش کرنے کی درخواست کی تاکہ ریاست میں اس اردو زبان کا فروغ ہو جو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی ایک روشن علامت ہے۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان کو عام کرنے کے لیے ریاست میں ایک اردو اکادمی قائم کی جانی چاہیے تاکہ اردو زبان کے فروغ کے لیے مرکزی حکومت کی طرف سے چلائی جارہی اسکیموں کا ریاست میں نفاذ ہوسکے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ گوا کی ریاست میں اقلیتوں کی بھی ایک معتد بہ آبادی ہے اسی لیے اقلیتی آبادی والے علاقوں کے سرکاری اسکولوں میں اردو کو بطور تیسری زبان پڑھانے کا نظم بھی کیا جائے۔ گفتگو کے دوران محترمہ نیلا موہنن نے کہا کہ ہم قومی اردو کونسل کے ساتھ اردو کے فروغ کے لیے مفاہمت نامے پر دستخط کریں گے تاکہ ریاست میں اردو کو جائز مقام مل سکے۔ ریاستی حکومت کے ذریعے کرائے جانے والے پروگراموں میں بھی قومی کونسل کے ذریعے کلچرل پروگرام کے انعقاد کرانے کی بھی درخواست کی گئی۔ایجوکیشن سکریٹری نے یقین دلایا کہ گوا میں پرائمری سطح پر جتنے بھی سرکاری وغیر سرکاری اسکول ہیں ان سب میں اردو کو بطور تھرڈ لینگویج پڑھایا جائے گا۔قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ قومی اردو کونسل نصابی کتابوں کی اشاعت میں گوا سرکار کو تعاون دے گی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 دسمبر 2019

تاشقند کے مہمانان کے اعزاز میں تقریب

نئی دھلی: تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز گزشتہ 70 سالوں سے اردو اور ہندی کے حوالے سے اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔اس یونیورسٹی کے زیر اہتمام ازبکستان میں اردو اور ہندی کے کئی سینٹر بھی چل رہے ہیں۔ یہ ادارہ دونوں ممالک کے درمیان لسانی وثقافتی سطح پر باہمی تعلقات کو استوار کرنے میں بھی اہم رول ادا کررہا ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں استقبالیہ تقریب میں کہیں۔انھوں نے ازبکستان سے آئے مہمانان ریکٹر پروفیسر گل چہرہ الیس ایچ رِیخ سیوا اور پروفیسر ایلورا اے محمودو وائس ریکٹر فار انٹرنیشنل کوآپریشن کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنے ملک میں اردو و ہندی کے تعلق سے ان کی کوششوں کو سراہا۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمانان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ پروفیسر گل چہرہ الیس ایچ رِیخ سیوا ازبیک زبان کی پروفیسر ہیں اور وہاں کی پارلیمنٹ کی ممبر بھی ہیں۔وہ ہندوستانی زبان وثقافت سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں، بالخصوص اردو اور ہندی زبان سے انھیں گہرا لگاؤ ہے۔وہ اپنے ملک میں ان دونوں زبانوں کے فروغ کے لیے کوشاں بھی ہیں۔تاشقند میں اردو زبان کے دائرے کو پھیلانے کے لیے وہ قومی کونسل برائے فروغ

اردو زبان کے ساتھ مشترکہ طور پر کام کرنے کی خواہشمند ہیں۔

پروفیسر گل چہرہ الیس ایچ رِیخ سیوا نے اپنے خطاب میں کہا کہ گزشتہ دنوں مجھے معلوم ہوا کہ قومی کونسل اردو کا ایک عالمی ادارہ ہے جو اردو کے فروغ کے لیے ملک وبیرون ملک کام کرتا ہے۔میں چاہتی ہوں کہ تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان ایم او یو (میمورنڈم آف انڈر اسٹینڈنگ) پر دستخط ہوں تاکہ اردو زبان اور ہندوستانی ثقافت کے ساتھ ازبیک زبان اور ثقافت کا فروغ ممکن ہوسکے اور دونوں ملکوں کے درمیان باہمی رشتے اور مستحکم ہوں۔

پروفیسر ایلورا اے محمودو وائس ریکٹر فار انٹرنیشنل کوآپریشن نے کہا کہ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ پہلی بار ہندوستان آنے کا اتفاق ہوا اور اس ادارے کا بھی یہ میرا پہلا دورہ ہے۔ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے جس گرمجوشی سے استقبال کیا، وہ یقیناً میرے لیے یادگار لمحہ ہے۔میں چاہتا ہوں کہ دونوں ممالک کے مابین پہلے سے قائم لسانی وثقافتی رشتے میں مزید استحکام آئے۔اسی کام کے لیے ہم لوگوں نے اس ادارے کا دورہ کیا ہے۔اس موقع پر پروفیسر چندر شیکھر نے جو اس وقت تاشقند کے لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر کے ڈائرکٹر ہیں کہا کہ تاشقند میں اردو کا فروغ تیزی سے ہورہا ہے۔انھوں نے کہا کہ اس وقت دونوں ممالک کے درمیان باہمی تعلقات بہت ہی بہتر ہیں اور دونوں ممالک کے مابین لسانی وثقافتی لین دین کے لیے راہ ہموار ہورہی ہے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ازبیک زبان کے استاد ڈاکٹر شاہد تسلیم نے کہا کہ جس طرح تاشقند میں اردو زبان سات دہائیوں سے پڑھائی جارہی ہے۔اسی طرح گزشتہ پندرہ برسوں سے جامعہ میں ازبیک زبان کی پڑھائی ہورہی ہے۔اردو اور ازبیک زبانیں دونوں ملکوں کے رشتے کو مزید مستحکم کررہی ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 نومبر 2019

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

قومی کونسل گوامیں فروغ اردو کی تمام اسکیمیں نافذ کرے گی: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

گوا: گوا ہندوستان کا وہ خوبصورت اور طلسماتی جزیرہ ہے جو اپنی سیاحتی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کے ساحل سمندر سے وابستہ مختلف سیاحتی مقامات کی سیر کو پوری دنیا کے سیاح آتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ گوا میں کمپیوٹر سنٹر، لائبریری ،اردو عربی سرٹیفکٹ اور ڈپلومہ کورسیز سمینار اور کانفرس وغیرہ سمیت قومی کونسل برائے فروغ

اردو زبان کی تمام اسکیموں کو نافذ کیا جائے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ گوا میں اردو کی نصابی کتابیں فراہم کی جائیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے حسینن ایجوکیشن اینڈ فیلوشپ سوسائٹی گوا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 'اردو زبان وادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ' کے عنوان سے یک روزہ قومی سمینار کے افتتاحی اجلاس کے صدارتی خطاب میں کیا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بتایا کہ انھوں گوا کے ایجوکیشن سکریٹری سے ملاقات کر کے اسکولوں میں پانچویں جماعت سے آگے بھی اردو تعلیم کے انتظام کی گذارش کی ہے۔ سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مشہور شاعرہ فوزیہ رباب نے کہا کہ اردو کا وہ کون سا دور، کون سی تحریک، کون سا رجحان، کون سی صنف اور اردو کی تاریخ کا وہ کون سا ورق ہے جو وجود زن سے رنگین اور تابناک نہ ہو۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی ڈائرکٹر برائے تعلیم گوا ڈاکٹر وندنا راؤ (آئی اے ایس) نے خواتین کے حوالے سے سمینار کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گوا میں اردو جیسی شیریں زبان کی ترویج واشاعت کی بہت ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں ہم بھرپور تعاون کے لیے تیار ہیں۔ انھوں نے فوزیہ رباب کی تجویز کی تائید کی کہ 'اکیڈمی برائے ادبیات خواتین' قائم کی جائے۔ ڈاکٹر وندنا راؤ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ابتدائی تعلیم اردو میں ہونی چاہیے۔ سمینار کے کنوینر شیخ سلیمان کرول نے سوسائٹی کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حسینن ایجوکیشن اینڈ فیلوشپ سوسائٹی گوا کی وہ واحد تنظیم ہے جو گوا میں اردو کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ڈاکٹر آفرین نے کہا کہ ہماری تنظیم تعلیم اور اردو کی اشاعت کے لیے گوا میں فعال کردار ادا کررہی ہے۔ فہمیدہ خان نے تمام مہمانان کا تعارف کراتے ہوئے گلدستے سے ان کا استقبال کیا۔ اس سمینار کے دو تکنیکی اجلاس میں فوزیہ رباب اور ڈاکٹر شرف النہار نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ دونوں اجلاس میں بارہ مقالات پاش کیے گئے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے اردو فکشن میں خواتین کا حصہ، ڈاکٹر شرف النہار نے اکیسویں صدی میں افسانہ نگار خواتین، ڈاکٹر حمیرہ تسنیم نے اردو کی ناول نگار خواتین، ڈاکٹر مسرت نے اردو میں تانیثی تنقید، ڈاکٹر نسرین بیگم نے اردو شعر وادب میں عورتوں کا حصہ، فوزیہ رباب نے خواتین کی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت، ڈاکٹر ظل ہما نے کیفی کی شاعری میں عورت کا تصور، ڈاکٹر معیذہ نے اردو ادب اور خواتین، ڈاکٹر طاہرہ عبدالشکور نے بچوں کا ادب اور خواتین، اور رخسانہ شاہ نے اردو ادب کی ترقی میں خواتین کے سفرنامے کے عنوان سے گراں قدر مقالات پیش کیے۔ سمینار میں مشہور فکشن نگار ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے ناول 'راجدیو کی امرائی' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی صدارت میں مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا۔ سمینار کا آغاز مولانا محمد غوث کی تلاوت اور اختتام ثریا خان کے اظہار تشکر پر ہوا۔ شیخ سلیمان کرول اور فہمیدہ خان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ حسینن سوسائٹی کی جانب سے مندوبین کی خدمت میں مومنٹو پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 دسمبر 2019

اردو کے فروغ میں غیر مسلم شعرا وادبا کی خدمات

نئی دھلی: جامعہ ہمدرد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے جامعہ ہمدرد نئی دہلی ایک روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'اردو کے فروغ میں غیر مسلم شعرا وادبا کی خدمات' کا انعقاد بمقام ہمدرد کنونیشن سینٹر جامعہ ہمدرد میں کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر احمد کمال صاحب پرووائس چانسلر جامعہ ہمدرد نے کی اور 'اردو کے فروغ میں غیر مسلم شعرا وادبا کی خدمات' پر روشنی ڈالتے ہوئے پرمغز کلیدی خطبہ پروفیسر علی احمد فردوسی نے پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس میں اظہار تشکر ڈاکٹر خورشید احمد انصاری کلچرل کوآرڈینیٹر جامعہ ہمدرد نے کیا۔ اس کے بعد تین اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کا موضوع 'اردو کے فروغ میں دکنی غیر مسلم شعرا وادبا کی خدمات' تھا جس کی صدارت جناب ایم خان صاحب نے کی اور مختلف مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کا موضوع 'اردو کے فروغ میں لکھنوی غیر مسلم شعرا وادبا کی خدمات' رکھا گیا جس کی صدارت کنور رنجیت سنگھ چوہان نے کی اور آخری اجلاس کا موضوع 'اردو کے فروغ میں دہلوی غیر مسلم شعرا وادبا کی خدمات' تھا جس کی صدارت پروفیسر علی احمد فردوسی اور ڈاکٹر خورشید احمد انصاری نے کی۔ مقالہ نگاروں میں خبیب احمد (اعظم گڑھ)، مہدیہ نیز ہدشیخ (ایران)، شاداب الفت (دبئی)، ڈاکٹر محمد احمد نعیمی (دہلی) کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 نومبر 2019

اردو زبان سیکھنے میں ٹیکنالوجی کا کردار

دیوبند: روڑکی سے متصل ڈنڈھیڑہ بستی میں اردو زبان پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں گردونواح کے اردوداں حضرات کے علاوہ بیرون سے بھی مقالہ نگار اور سامعین تشریف لائے۔ زبان دانی اور ادبی ذوق جیسے جوہر لطیف سے محروم اس علاقے میں یہ کام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون اور محترمہ نشاط امیر اور ان کے شوہر نامدار کی کاوشوں سے سرانجام پایا، اردو دانی لسانی ذوق سلیم اور ادب نوازی کے خلا کو پر کرنے کے لیے قریبی شہر منگلور سے جہاں پر اردو ادب کی بڑی بڑی عبقری شخصیات پیدا ہوئیں وہاں سے کئی نامور لوگوں نے شرکت کی جن میں اردو کے نامور نقاد اور شاعر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابقہ ڈین پروفیسر عنوان چشتی کے برادر صغیر ریٹائرڈ پروفیسر مشہور ادیب اور شاعر اور عہد حاضر کے ماہر عروض داں ڈاکٹر تنویر چشتی جیسی شخصیات نے اپنے خیالات پیش کیے۔ دنیا میں اپنا ایک الگ مقام رکھنے والے افضل منگلوری اور ادب نواز اور ادب دانی کے لیے مشہور سیاسی گھرانے یوپی واتراکھنڈ کی اسمبلیوں کے لیے کئی کئی بار منتخب ہونے والے اور وزارت کے ساتھ ساتھ دیگر عہدوں پر بھی خدمات انجام دینے والے مرحوم قاضی محی الدین کے خانوادہ ادب کے وارث اور اتراکھنڈ اسمبلی کے منگلور سے موجودہ ایم ایل اے اردو زبان دانی اور فقرہ سنجی کے ماہر سیاست داں قاضی نظام الدین نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 اکتوبر 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

(فکّی) کی پندرہویں بین ملکی تعلیم کانفرنس کا انعقاد

نئی دھلی: صدر رام ناتھ کووند نے ملک کے تعلیمی نظام کو اکیسویں صدی کے مطابق بنانے کے لیے اعلیٰ تعلیم کو از سرِ نو فروغ دینے اور ہندوستان کو تحقیق اور ترقی کے شعبے میں دنیا کا مرکز بنانے کی اپیل کی ہے۔ مسٹر کووند نے فیڈریشن آف انڈین چیمبرس (فکّی) کی پندرہویں بین ملکی تعلیم کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ اپیل کی۔ کانفرنس میں 76 ملکوں کے 1500 سے زیادہ نمائندوں نے حصہ لیا جن میں 350 سے زیادہ غیر ملکی نمائندے تھے۔ کانفرنس میں اعلیٰ تعلیم سے

متعلق نمائش بھی لگائی گئی۔ مسٹر کووند نے کہا کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی پرانی تاریخ ہے اور نالندہ یونیورسٹی دنیا کی قدیم یونیورسٹی رہی ہے۔ جہاں ایشیا کے دس ہزار طلبہ پڑھتے تھے۔ آج پوری دنیا میں تعلیم کا سب سے بڑا نظام ہندوستان میں ہے لیکن اکیسویں صدی کی ضرورتوں کے مدنظر اس میں بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اختراعات، آرٹیفیشیل انٹلی جنس اور انٹرڈسپلنری کے موضوعات کو ایک ساتھ پڑھانے اور نصاب میں تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ہندوستان کو دنیا میں تحقیق اور ترقی کا مرکز بنانے کی بھی اپیل کی۔ صدر محترم نے اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے صنعت کاروں سے فنڈ دینے کی اپیل کرتے ہوئے دہلی آئی آئی ٹی میں طلبہ قدیم کے فنڈ کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ کس طرح ان سابقہ طلبہ نے 250 کروڑ روپے کا فنڈ بنا لیا ہے اور اس کا ہدف ایک ارب ڈالر کرنے کا ہے۔ نے ملک کی معیشت کو مضبوط بنانے کے لیے اعلیٰ تعلیم کے استعمال پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جدید ٹولس کے ذریعے اعلیٰ تعلیم میں اسکل ڈیولپمنٹ کے ساتھ تربیت اور ووکیشنل کورسیز کو اپنانا ہوگا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 28 نومبر 2019

'تعلیم ایک فن' پر اورینٹیشن پروگرام

حیدرآباد: متحدہ عرب امارات کی عدالت میں کارروائی جو اب تک عربی میں چلائی جاتی تھی، اب اسے اردو میں بھی چلانے کی اجازت مل چکی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں بین الاقوامی رابطہ کی زبان بننے کی صلاحیت ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اردو مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعہ تعلیم (سی پی ڈی یو ایم ٹی) آڈیٹوریم میں دینی مدارس کے اساتذہ کے اورینٹیشن پروگرام کے افتتاحی اجلاس سے بحیثیت مہمانِ خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ 'تعلیم ایک فن' کے موضوع پر 7 روزہ پروگرام این سی پی یو ایل کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ پروفیسر فاطمہ بیگم وائس چانسلر انچارج نے صدارت کی۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار مہمانِ اعزازی تھے۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ وزیر فروغ انسانی وسائل اردو کو ہندوستان کی بیٹی قرار دیتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ عرب شہریوں کو ہندوستان بلا کر انھیں اردو سکھائی جائے، تاکہ وہ یہاں کی ثقافت سے واقفیت حاصل کریں اور ان سے بین الاقوامی رشتے استوار ہوں۔ انھوں نے کورس میں شرکت کررہے اساتذہ سے کہا کہ وہ یہاں سے اردو کے سفیر بن کر جائیں اور اردو کی ترقی و ترویج میں جو بھی کر سکتے ہیں کریں۔ انھوں نے کہا کہ دینی مدارس کے باعث ہی اردو پھل پھول رہی ہے، ورنہ اسکولوں اور کالجوں میں اس کی حالت انتہائی خراب ہے۔ پروفیسر فاطمہ بیگم نے صدارتی تقریر میں کہا کہ تدریس فن ہی نہیں سائنس بھی ہے۔ اس کا مقصد طلبہ کی شخصیت کا مکمل فروغ ہے، جس میں جسمانی، روحانی، سماجی، معاشرتی، معاشی سبھی طرح کی ترقی شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ تدریس اس وقت مکمل ہوتی ہے جب جماعت کے 90 فیصد طلبہ جو کچھ پڑھایا جائے اس میں سے 90 فیصد سمجھ لیں۔ انھوں نے تدریس کے مختلف طریقوں کا ذکر کیا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار انچارج نے قرآن اور حدیث کے حوالوں سے تعلیم کی اہمیت و افادیت بتلائی۔ پروفیسر صدیقی محمد محمود، کنوینر پروگرام نے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ پروفیسر عبدالسمیع صدیقی، ڈائرکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اساتذہ کا تربیتی پروگرام تقدیس و تجدید کے نظریہ کے تحت منعقد کیا جارہا ہے۔ مصباح انظر، اسسٹنٹ پروفیسر نے نظامت کی اور ڈاکٹر محمد اکبر کو آرڈینیٹر پروگرام نے شکریہ ادا کیا۔ عاطف عمران، اسلامک اسٹڈیز کی قرأت کلام پاک و ترجمہ سے جلسے کا آغاز ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 نومبر 2019

’صوفی ازم، انسانیت اور تکثیریت: ہندوستانی نقطۂ نظر‘ پر سمینار

علی گڑھ: اس ملک کو ایک رکھنے کے لیے علامہ اقبال

کی فکر کو اپنانا ہوگا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ’’شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے، دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔‘‘ یہ وہ فلاسفی ہے جو لوگوں کو جوڑ سکتی ہے، جو محبت و پیار کا پیغام دے سکتی ہے، ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے کیا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے زیر اہتمام منعقد قومی سمینار بعنوان ’صوفی ازم، انسانیت اور تکثیریت: ہندوستانی نقطۂ نظر‘ سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا روم کے الفاظ بھی اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ ’’تو برائے وصل کردن آمدی۔ میں برائے فصل کردن آمدی‘‘ تو لوگوں کو جوڑنے کے لیے آیا ہے لوگوں کو الگ کرنے نہیں آیا، یہ سمینار مذکورہ افکار کی نمائندگی کرتا ہے۔ انڈین کونسل آف فلاسوفیکل ریسرچ کے چیئرمین پروفیسر آر سی سنہا نے کہا کہ صوفی ازم کا تعلق انسانیت کی خدمت سے ہے اور صوفی، مذہب و نسل اور عقیدہ میں تفریق کیے بغیر پوری انسانیت کو ایک کنبہ سمجھتا ہے اور دبے کچلے لوگوں کا خدمت گزار ہوتا ہے۔ اے ایم یو کے پرو وائس چانسلر پروفیسر اختر حسیب نے کہا کہ سمینار کا موضوع موجودہ وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ سماج میں انسانیت و محبت عام ہو۔ پروفیسر محمد سراج الاسلام نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تکثیریت ہندوستان کے خمیر کا حصہ ہے اور تصوف دلوں کو جیتنے کا نام ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور دیگر دانشوروں کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستان، انڈیا اور بھارت یہ تین نام ہندوستان میں مختلف سطحوں پر پائی جانے والی تکثیریت کی علامت ہیں۔ پروفیسر اسلام نے کہا کہ تصوف کو اپنا کر بھائی چارے کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اس سے قبل شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی نے سمینار کے مقاصد واہداف پر بھی روشنی ڈالی۔ آخر میں سمینار کے آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر عبدالشکیل نے اظہار تشکر کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شارق عقیل نے انجام دیے۔ روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 14 نومبر 2019

اردو صوتیات کے موضوع پر ورکشاپ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ لسانیات کے زیر اہتمام ’مخصوص اردو حروف کے

لیے صوتیاتی علامات کی تدوین‘ موضوع پر پانچ روزہ قومی ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا۔ ورکشاپ کا افتتاحی اجلاس آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے اردو رسم الخط کے بارے میں مختلف آرا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان خطہ اور نسل کی سرحدوں کو عبور کر گئی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ ورکشاپ زبان سے متعلق صوتیاتی مسائل کا حل پیش کرے گی، جس میں اردو کی شیرینی اور لطافت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے بتایا کہ این سی پی یو ایل اردو کے حروف کی صوتیاتی علامات تیار کرنے کے لیے جلد ہی کوئی ورکشاپ منعقد کرے گا۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ این سی پی یو ایل ڈاکٹر عقیل احمد کی قیادت میں اردو کے فروغ کے لیے جوش و ولولہ کے ساتھ کام کر رہا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ریختہ فاؤنڈیشن سے تحریک لینی چاہیے جس کے بانی سنجیو صرف اردو کو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں فروغ دے رہے ہیں۔ وائس چانسلر نے کہا کہ انھوں نے حال ہی میں امریکہ میں اردو کے فروغ سے متعلق ریختہ فاؤنڈیشن کے ایک پروگرام میں شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے اور اردو زبان کا ورثہ ہم کو نسل در نسل منتقل کرنا چاہیے۔ پروفیسر منصور نے کہا کہ اے ایم یو کی صدی تقریبات کے موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے کئی پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ شعبۂ ترسیل عامہ کے سربراہ پروفیسر ایم شافع قدوائی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ قوم کا تشخص رسم الخط میں ہی پوشیدہ ہو، کیونکہ پھر آپ ان زبانوں کے بارے میں کیا کہیں گے جن کے دو یا تین رسم الخط ہیں مثلاً پنجابی اور کونکنی۔ انھوں نے گوپی چند نارنگ کی کتاب ’املا نامہ‘ کا حوالہ دیا۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ چیزوں کو اسٹینڈرڈ بنانا گلوبلائزیشن کی ہی پیداوار ہے ورنہ زبان میں کوئی چیز غلط نہیں ہوا کرتی ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر شائستہ یوسف (بنگلور) نے موضوع کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس پروجیکٹ کی آڈیو بھی وقت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف ویب پورٹلوں پر اردو کے اشعار پڑھتے وقت اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ ایک ایسا ڈھانچہ ہونا چاہیے جو اردو زبان کی صوتیات اور علامات میں یکسانیت پیدا کرے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 23 نومبر 2019

جشن ادب

نئی دھلی: جامعہ ہمدرد میں تین روزہ جشن ادب کا افتتاح سابق گورنر جموں اینڈ کشمیر این این ووہرا کے ہاتھوں ہوا۔ این این ووہرا نے اپنے خطاب میں کہا کہ جامعہ ہمدرد کا نام پورے ملک اور ملک کے باہر تعلیم کے میدان میں بڑے ادب سے لیا جارہا ہے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر سید احتشام حسنین

نے کہا کہ جشن ادب جامعہ ہمدرد کو نئی اڑان پر لے جا رہا ہے۔ لوگ اس سے مانوس ہو رہے ہیں اور جامعہ ہمدرد کا نام روشن ہو رہا ہے۔ جنرل سکریٹری کنور رنجیت سنگھ چوہان نے کہا کہ جامعہ ہمدرد میں جشن ادب کا انعقاد ہمیں فخر کا احساس دلاتا ہے۔ اس افتتاحی تقریب میں پروفیسر اشوک چکردھر، پروفیسر احمد کمال، پروفیسر ایس ایم خان، اجے شرما وائس پریزیڈنٹ جشن ادب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں شارق کیفی، سریندر شرما، اوم نشچل کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ساتھ ہی شارق کیفی کی کتاب 'دیکھو کیا کیا بھول گئے ہم' کا اجرا عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کی نظامت خبیب احمد نے کی۔

جشن ادب کے دوسرے دن کا آغاز اطہر حسین نے اپنے نغموں سے کیا اور اپنی آواز سے سامعین کو مسحور کیا۔ اس کے بعد علم سے فلم تک پر مذاکرہ ہوا جس میں مجروح سلطانپوری کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقعے پر رحمٰن مسرور نے پروفیسر شمیم حنفی سے گفتگو کی۔ بیت بازی کا پروگرام ناول، پھر سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے، کے موضوع ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں سروش آصف نے عائشہ صدیقی، مہدیا اور فرہان وارثی سے گفتگو کی۔ دوپہر کے سیشن میں خواتین کے مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر وسیم راشد، رما پانڈے، مینا نقوی، رشمی صبا، روچی ڈرولیا، سنگیتا گپتا، نینا سحر نے اپنے کلام سنائے۔ اس کے بعد راجیہ سبھا کے بھویشہ کے نام سے ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس میں قانون سے وابستہ ماہرین نے مستقبل میں راجیہ سبھا کے حوالے سے روشنی ڈالی۔ دیر شام بلی ماران نامی میوزیکل بینڈ نے پرفارمینس دی جس کے بعد کویتا سیٹھ نے اپنی غزل پیش کر کے سامعین کو جھومنے پر مجبور کر دیا۔

جشن ادب کے آخری دن جامعہ ہمدرد میں چہل پہل رہی، بچوں سے لے کر نوجوانوں اور بزرگوں سمیت خواتین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ جشن میں اردو تہذیب کی نمائندگی کے لیے اردو بازار میں بھی لوگوں کی بھیڑ دیکھنے لائق تھی، کتابوں، خطاطی و دیگر اردو تہذیب کی یادگاری نمائش کی بھی جم کر خریداری ہوئی۔ جشن کے آخری دن مختلف پروگراموں کا انعقاد کیا گیا۔ جشن ادب کے پروگراموں میں اہم ترین شخصیات میں معروف مزاحیہ اداکار راجپال یادو، ریڈیو مرچی کے معروف آر جے نوید کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9، 10 و 11 نومبر 2019

ہندوستان میں رومی شناسی

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام، بنیادِ فارسی ہند، بنیادِ بیدل، تہران اور سروشِ مولانا، تہران کے اشتراک سے 'ہندوستان میں رومی شناسی' کے موضوع پر ایوانِ غالب

میں ایک دو روزہ بین الاقوامی سمینار کا اہتمام کیا گیا جس کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج کے پر اضطراب دور میں مولانا کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر علی اکبر شاہ سکریٹری بنیاد فارسی ہند نے تعارفی کلمات میں مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سمینار کے موضوع اور اس کے اغراض و مقاصد کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس موضوع سے بخوبی واقف ہیں لیکن مولانا رومی سے ہماری آشنائی کس حد تک ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں مثنوی کے بے شمار خطی نسخے موجود ہیں لیکن اس کی فہرست جیسی تیار ہونی چاہیے تھی ابھی تک اس نوعیت کا کام نہیں ہوا۔ پہلی بار مولانا روم پر منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی منظم سمینار منعقد کیا جا رہا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سید رضا حیدر نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ مولانا رومی اور ہندوستان کا تعلق دیرینہ ہے، مولانا اپنی زندگی ہی میں ہندوستان میں شہرت پا چکے تھے۔ ان کی مثنوی کے تتبع میں ہندوستان میں بے شمار مثنویاں لکھی گئیں۔ مہمانانِ خصوصی محمد نعیم طاہر قادری، افغانستان کے سفیر نے کہا کہ مثنوی کا ہر شعر انسانی زندگی کے لیے مشعل راہ، انسان دوستی اور اخوت جہانی کا صحیفہ کہا جا سکتا ہے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر علی رضا قزوہ نے مولانا رومی پر ہو رہی اس کانفرنس پر خوشی کا اظہار کیا۔ مستقبل میں رومی شناسی کے سلسلے میں اپنے علمی تعاون کا یقین دلایا۔ مہمانِ خصوصی اور مشہور رومی شناس استاد مصطفیٰ ملکیان، سرپرست سروشِ مولانا، تہران نے مولانا کے مختلف نظریات پر روشنی ڈالی اور مختلف نظریات پر بحث کرتے ہوئے پر مغز گفتگو کی۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر سریش کمار، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، انڈین کونسل فار ہسٹوریکل، ریسرچ نے رومی کو تمام اعلیٰ اقدار کا حامل اور انسانی کمال کا مجسم بتاتے ہوئے کہا کہ رومی میرے لیے ایسے دانشور ہیں جنھوں نے انسان دوستی کی مثال پیش کی۔ مہمانِ اعزازی پروفیسر راجندر کمار، صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے مولانا رومی کی مثنوی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ اختتامی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر چندر شیکھر، چیئرمین پی۔ ایف۔ آئی، ڈائرکٹر ایل۔ بی۔ شاتر، سی۔ ایف۔ آئی۔ سی، تاشقند، ازبکستان نے ہندوستانی لائبریریوں میں مولانا رومی کی مثنوی کے قلمی نسخوں کی موجودگی پر خوشی کا اظہار کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد چار ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ ڈاکٹر سید نقی عباس 'کیفی' جوائنٹ سکریٹری، بنیاد فارسی ہند نے اس کانفرنس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

سمینار کے دوسرے دن مقالہ نگاروں نے مولانا روم کے علمی، ادبی اور عرفان و تصوف کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ سمینار کے دوسرے اختتامی جلسے کے علاوہ چار ادبی اجلاس کا انعقاد ہوا، جس میں ہندوستان میں اب تک رومی پر ہر تحقیقی کام پر شرکا نے مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس میں پروفیسر عمر کمال الدین نے صدارت فرمائی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارتی خدمات پروفیسر سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی نے انجام دیں۔ چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر آصف نعیم صدیقی نے کی۔ سبھی مقالہ نگاروں نے رومی سے متعلق آثار و تخلیقات کو الگ الگ جہات سے تبصرہ اور تجزیہ کا موضوع بنایا جس کے نتیجے میں ہندوستان میں موجودہ مطالعات رومی کے ورثے کے خد و خال نمایاں ہوئے۔ اختتامی اجلاس میں کلچرل کونسلر خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ڈاکٹر علی ربانی نے ہندوستان میں رومی شناسی کے موضوع کو خاصا اہم قرار دیا۔ خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے معاون کلچرل کونسل جناب ڈاکٹر قزوہ اور مرکز تحقیقات کے مدیر جناب ڈاکٹر شکر اللہی نے بھی اس موضوع پر سمینار کے انعقاد کو اہم قرار دیتے ہوئے ہر طرح کا علمی تعاون کی پیش کش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 نومبر و 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 دسمبر 2019

مجروح سلطانپوری پر مذاکرہ

نئی دھلی: ممتاز نغمہ نگار اور شاعر مجروح سلطانپوری کو ایک پروقار ادبی مذاکرے میں شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے ان کی شاعری اور شخصیت پر کئی زاویوں سے روشنی ڈالی۔ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے ممتاز نقاد، دانشور گوپی چند نارنگ نے کہا کہ مجروح کا نام ان کے تغزل اور شعری کمال کی وجہ سے ہمیشہ روشن رہے گا۔ مجروح سلطانپوری کا کمال یہ تھا کہ فارسی اور اردو شاعری کی غزلیہ روایت کی روح کو انھوں نے جذب کرلیا تھا اوران کی آواز میں ایسا جمالیاتی رچاؤ اور کشش پیدا ہوگئی تھی کہ ان کی بات دل پر اثر کرتی تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ مجروح سلطانپوری کا کارنامہ یہ ہے کہ نہ تو انھوں نے ترقی پسندوں کا ساتھ چھوڑا اور نہ ہی غزل سے اپنی وفاداری کو ترک کیا۔ یہ ان کی سلامتی طبع اور خوش مذاقی کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ تغزل اردو شاعری کا جوہر ہے اور اس سے ہاتھ اٹھانا گویا شعریات سے منہ موڑنا ہے۔ یہ دو روزہ اجلاس 29 اور 30 نومبر کو اکادمی کے ہال میں منعقد کیا گیا تھا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارجمند آرا نے مجروح سلطانپوری کی شاعری، ان کے فن اور ان کی شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ صدارت اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر مادھو کوشک نے کی اور مجروح سلطانپوری کو اپنے عہد کا مقبول ترین شاعر قرار دیا۔ آخر میں اکادمی کے ہندی ایڈیٹر انوپم تیواری نے تمام شرکا اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت نصرت ظہیر نے کی۔ اس اجلاس میں شائستہ یوسف، حسن رضا اور غلام نبی کمار نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ممتاز ناقد، شاعر اور ادیب پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ اس اجلاس میں نصرت جہاں اور زبیر شاداب نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ اس اجلاس میں رحمٰن عباس، خالد اشرف اور نوشاد منظر نے اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 دسمبر 2019

ساہتیہ اکادمی میں مجروح سلطانپوری پر مذاکرہ

دھلی :

مولانا ابوالکلام آزاد: حیات وخدمات

نئی دھلی: 'مولانا ابوالکلام آزاد حیات وخدمات' کے موضوع پر ایک بزم زیر صدارت ڈاکٹر سید فاروق چیئرمین تسمیہ ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی اور تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سجائی گئی۔ مہمان ذی وقار وائس چیئرمین

اردو اکادمی دہلی اور استاد شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شہپر رسول کا مرزا نفیس بیگ نے اور سابق وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی وجامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر خالد محمود کا ادیب وصحافی حبیب سیفی نے گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا۔ ڈاکٹر بسمل عارفی نے ڈاکٹر سید فاروق کو گلدستہ پیش کیا۔ اپنے کلیدی خطبہ میں پروفیسر خالد محمود نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے اس پہلو کو اجاگر کیا گیا جس پر عام لوگوں کی توجہ کم گئی ہے۔ مہمان ذی وقار پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ ابوالکلام آزاد فکر وتہذیب کا مجموعہ اور دور اندیش مدبر ومفکر تھے۔ ساتھ ہی تعلیمی وتہذیبی امتیازات کی خوبیاں بیان کیں۔ صدر تقریب ڈاکٹر سید فاروق نے تعلیم کے ساتھ ہنر رکھنے یعنی بچوں کو ہنر سکھانے اور انھیں بندھوا مزدور بنانے سے انکار کرنے کے نظریہ کو مثالی قدم قرار دیا جس سے مولانا ابوالکلام کی شخصی خوبیوں کے مہاتما گاندھی بھی قائل ہوئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 نومبر 2019

اردو، عربی اور فارسی میں رزمیہ ادب

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شام شہر یاراں میں تقریباً ہر ماہ کسی نئی اور اہم کتاب پر مذاکرے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ خواجہ محمد اکرام الدین کی مرتبہ کتاب 'اردو، عربی اور فارسی میں رزمیہ ادب' پر مذاکرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ رزمیہ شاعری کے تعلق سے ایک غلط فہمی یہ ہے کہ وہ صرف جنگ وجدل سے عبارت ہے۔ یہ غلط نہیں ہے لیکن پوری طرح سے درست بھی نہیں۔ رزمیہ عناصر ہمارے ادب میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں جن کو نشان زد کرنے اور ان پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ شام شہر یاراں میں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کسی سنجیدہ اور اہم کتاب پر مذاکرہ ہو، اس حوالے سے خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی یہ کتاب نہایت اہم ہے کیونکہ رزمیہ ادب پر باضابطہ کوئی کتاب شاید موجود نہیں۔ دوسری بات جو اس کتاب کو اہم بناتی ہے، یہ ہے کہ اس میں جن مقالہ نگار حضرات کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں کچھ لوگ نہ صرف دوسری زبان کے ہیں بلکہ ان کا تعلق بھی غیر ملک سے ہے۔ اس طرح یہ کتاب یہ بھی بتاتی ہے کہ مختلف زبانوں اور مختلف خطوں کے لوگ رزمیہ کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب پر گفتگو کا آغاز اس عالمی شہرت یافتہ ادارے میں ہو رہا ہے۔ پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ عربی ادب کے تعلق سے تمام ادبا کا متفق علیہ فیصلہ ہے کہ عربی میں غنائی شاعری کا وجود تو ہے لیکن رزمیہ شاعری کا نہیں۔ اس سمینار کی برکت سے جب میں نے مطالعہ شروع کیا اور غور کیا تو محسوس ہوا کہ باضابطہ نہ سہی لیکن ادب کی مختلف اصناف میں رزمیہ عناصر بکھرے پڑے ہیں اور اس سمت میں گفتگو کے ابھی بہت سے مواقع ہیں۔ پروفیسر اختر حسین کاظمی نے کہا کہ عرب کے قبائلی لوگ جنھیں ہم بدو کہتے ہیں وہ صرف اپنے قصائد پر فخر کرتے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 نومبر 2019

'غازی الدین خان لیکچر' کا انعقاد

نئی دھلی: زبانوں کی تعلیم میں بول چال کی زبان اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کسی زبان میں گفتگو کرنے پر قادر نہیں ہیں تو موجودہ وقت میں آپ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہو پاتی ہے، جس کا آپ استحقاق رکھتے ہیں؛ اسی طرح گفتگو میں اصل مقصد پیغام رسانی ہوتا ہے، جملہ سازی میں نحوی قواعد کی زنجیروں میں الجھنا ذہن کو

مشکل میں ڈال دیتا ہے۔قواعد جملوں کی صحت میں یقیناً معاون ہوتے ہیں؛ البتہ ابتدائی مرحلے میں قواعد پر بہت زیادہ زور سیکھنے کے عمل کو مشکل بنا دیتا ہے۔ان خیالات کا اظہار جواہر لال نہرو یونیوسٹی میں شعبہ عربی کے پروفیسر سابق صدر شعبہ اور اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز کے سابق ڈین جناب محمد اسلم اصلاحی صاحب نے شعبہ عربی ذاکر حسین دہلی کالج کے پانچویں غازی الدین خان لیکچر میں کیا۔شعبہ کے سینئر استاذ ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے غازی الدین خان، لیکچر سیریز کا تعارف کرایا، انھوں نے بتایا کہ آج سے پانچ سال قبل 2015 میں غازی الدین خان کے نام سے ایک سالانہ یادگاری لیکچر کا آغاز کیا گیا تھا۔ شعبے کے دوسرے سینئر استاذ ڈاکٹر محمد طارق ندوی نے مہمان مکرم کا تعارف کراتے ہوئے عربی زبان وادب کے تعلق سے ان کی گراں قدر خدمات پر روشنی ڈالی۔

پروگرام کے اختتام پر صدر شعبہ جناب ڈاکٹر عبید اللہ نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ بولنا، بولنے ہی سے آتا ہے، ہم جتنا زیادہ بولیں گے ہماری گفتگو اتنی ہی نکھرتی جائے گی اور ہماری بول چال کی صلاحیتوں میں جلا پیدا ہوتا جائے گا۔ ہندوستان میں لوگوں نے عربی کو ایک مشکل زبان کی حیثیت دے دی ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 نومبر 2019

پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی کی صدارت میں ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے پروفیسر

محمد مجیب یادگاری خطبہ ایف ٹی کے سمینار ہال میں منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے طالب علم محمد محبّ اللہ افغانی کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ یہ یادگاری خطبہ معزز مہمان ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے پیش کیا۔شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے صدر و ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر محمد اسحٰق نے مہمانوں کا استقبال کیا۔اپنے ابتدائی کلمات میں انھوں نے پروفیسر محمد مجیب کی زندگی اور پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ پر مختصر روشنی ڈالی۔صدر جلسہ سید شاہد مہدی نے پروفیسر محمد مجیب میموریل لکچر کے لیے ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے انتخاب پر ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کی ستائش کی۔ جلسے میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کرنے والے پروفیسر ایمریٹس پروفیسر اختر الواسع نے پروفیسر محمد مجیب میموریل لکچر کے لیے ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے انتخاب کی ستائش کی اور انھوں نے صدر جلسہ سید شاہد مہدی کا تعارف کراتے ہوئے موصوف کی پنہاں خوبیوں وصلاحیتوں کا بخوبی ذکر کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر محمد سعید انور نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 نومبر 2019

'غالب: فکر وفن' پر یک روزہ قومی ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں ایک مختلف طرز کا سمینار منعقد کیا گیا۔ یہ ایک روزہ قومی

ریسرچ اسکالرز سمینار تھا جس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں شامل تمام مقالہ نگار، صدور، نظما اور منتظمین سب کے سب اردو کے ریسرچ اسکالرز ہیں۔ یہ سمینار 'غالب: فکر وفن' کے عنوان سے غالب کی 150 ویں برسی پر منعقد کیا گیا جس میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جے این یو، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے ریسرچ اسکالرز نے غالب کے فکر وفن کی مختلف جہتوں پر اپنے مقالات پیش کیے۔ سمینار کے افتتاحی کلمات میں پروفیسر صادق نے کہا کہ جامعہ غالب کے سلسلے میں ہمیشہ فعال رہا ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ غالب کے فن کے ساتھ ان کا فکر و فلسفہ بھی بلند ہے اور اس بلندی کا تقاضہ یہ ہے کہ غالب کو نئی نظر اور نئے ذہن کے ساتھ دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ استقبالیہ کلمات میں قائم مقام صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ یہ اپنی نوعیت کا تقریباً پہلا سمینار ہے کہ اس میں غالب کے حوالے سے خالصتاً ریسرچ اسکالرز کو ہی مقالہ خوانی اور صدارت کے علاوہ انتظامی امور کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ سمینار کے کنوینز ڈاکٹر خالد مبشر نے اس سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب شناسی کے لیے نئے ذہنوں کو تیار کرنا ہی غالب کو سب سے احسن خراجِ عقیدت ہے۔ پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ اس قدر منظّم اور معیاری سمینار کے انعقاد کے لیے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہزاد انجم، کنوینز سمینار ڈاکٹر خالد مبشر، شعبے کے تمام اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے عہدے داران اور اراکین کی مخلصانہ کوششیں قابل تحسین ہیں۔ سمینار میں تین تکنیکی اجلاس منعقد کیے گئے۔ تینوں اجلاس کی صدارت کے فرائض شاداب شمیم، محمد رضوان، امتیاز رومی، ثاقب فریدی، محمد عارف اور تفسیر حسین نے انجام دیے۔ مختلف اجلاس میں صبا انجم، محمد رضوان، سعدیہ سلیم شمسی، شفا مریم، مہر فاطمہ، راحت علی، خیر الدین اعظم، محمد طارق، امیر حمزہ، معاذ احمد، شاہ نواز حیدر شمسی، منزہ قیوم، عرفان وحید، محمد ریحان اور مسعود اظہر نے مقالات پیش کیے۔ مصطفیٰ علی، زمان طارق اور تہنیت فاطمہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شاہ فہم نسیم، رئیس فاطمہ، مہر فاطمہ اور امیر حمزہ نے کلام غالب کی بلند خوانی کی۔ غالب کی زندگی اور شاعری پر مبنی ڈاکیوڈراما بھی پیش کیا جس کے پروڈیوسر پروفیسر صادق ہیں۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 نومبر 2019

صادق چوبک کی داستانوں میں فطری عناصر

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں پہلے توسیعی خطبے کا انعقاد ہوا، جس کا موضوع فارسی داستان نویس صادق چوبک کی داستانوں میں فطری عناصر تھا۔ اس جلسہ کے مقرر خاص پروفیسر راجندر کمار، صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی اور مہمان خصوصی پروفیسر احمد محفوظ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ تھے۔ صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی نے کی۔ جلسے کا افتتاح ڈاکٹر یاسر عباس نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروفیسر راجندر کمار نے اپنے خطبے میں داستان کے لغوی معنی سے بحث کرتے ہوئے اس کی مختلف قسموں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ریلیزم اور نیچرل ازم کے باہمی فرق کو تفصیل سے بیان کیا نیز صادق چوبک کی اہم داستانوں اور ان کے کرداروں سے بحث کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک ایسے داستان نویس ہیں جنھوں نے اپنی داستانوں میں بیشتر سماج کے پسماندہ طبقے کو موضوع

بنایا اور ان کی مفلسی اور غربت کا صحیح آئینہ سماج کے سامنے پیش کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے خطاب کے دوران اردو اور فارسی کے داستانی ادب پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے فطری کرداروں سے بحث کی۔ اس کے بعد پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنے صدارتی کلمات میں ناول، افسانہ، قصہ گوئی، نیز داستانوں کے باہمی فرق کو واضح کیا۔ آخر میں کلمات تشکر پروفیسر عبدالحلیم نے ادا کرتے ہوئے ایران کے معروف داستان نویسوں جیسے جمالزادہ، صادق ہدایت، بزرگ علوی کا ذکر کرتے ہوئے داستان نویسی کے فن پر بھی مختصر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض توسیعی خطبات کی آرڈینیٹر ڈاکٹر زہرہ خاتون نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2019

شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دوسرے توسیعی خطبہ کا انعقاد

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں دوسرا توسیعی خطبہ 'نمایش نامہ نویسی اور ادبیات فارسی' کے زیرعنوان منعقد کیا گیا جس کی مقررہ پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی سابق صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی تھیں، مہمان خصوصی پروفیسر عارف فرید ایوبی لکھنؤ یونیورسٹی تھے اور صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی صدر شعبۂ فارسی نے فرمائی۔ جلسہ کا افتتاح اعجاز حسین صوفی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی نے اپنے خطبہ میں نمایش نامہ کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جس طرح ہندوستان میں رام لیلا وغیرہ پیش کی جاتی تھی ایران میں بھی قدیم تہذیب و ثقافت کو ڈراموں کے ذریعہ نوروز کے موقعے پر پیش کیا جاتا تھا۔ شاہنامہ کے بعد ایران میں شاہنامہ خوانی شروع ہوئی اور ڈراموں کو وسعت دی گئی۔ بادشاہوں کے دربار میں بقال بازی موجود تھی جس میں کبھی تنقید کا پہلو بھی نکل آتا تھا۔ روضہ خوانی شروع ہوئی مگر اس کے لیے کوئی اسٹیج اور ہال نہیں ہوتا تھا ایک سمبل کی عکاسی سے آمد و رفت شروع ہوئی اور ایک تہذیبی خلفشار شروع ہوگیا، جرمن اور فرانسیسی ڈراموں کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ دارالفنون کا قیام عمل میں آیا تو ڈرامہ کا ایک شعبہ قائم ہوا اور مختلف شہروں میں یونٹس قائم کی گئیں۔ ڈرامہ نگاری میں تمثیل نگاری، مکالمہ نگاری کا نقش قائم ہوا اور ایران میں گوہر مراد جیسے ڈرامہ نگار پیدا ہوئے جنھوں نے روانشناس کی حیثیت سے بہترین ڈرامے پیش کیے۔ پروفیسر عارف ایوبی نے ڈراما، تھیٹر اور نمایشنامہ کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ تینوں علاحدہ صنف ہیں مگر ایک دوسرے کا آپس میں تعلق ہے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنے صدارتی خطبات میں نمایشنامہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈرامہ نگاروں کا بھی مختصر تعارف کرایا۔ آخر میں پروفیسر عبدالحلیم سابق صدر شعبہ فارسی نے اپنے خیالات پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر زہرہ خاتون نے انجام دی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 نومبر 2019

اردو کا فروغ ہندوستانیت کا فروغ

نئی دھلی: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی میٹنگ مرکزی دفتر واقع شہید اشفاق اللہ خاں پارک، نیوسیلم پور میں زیرصدارت ڈاکٹر سیّد احمد خاں منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ 4 ستمبر 2014 کو سپریم کورٹ نے جو اردو کے حق میں فیصلہ دیا تھا اس کے مطابق ہندی کے ساتھ اردو کا فروغ بھی یقینی بنایا جانا اور عوام میں بھی واضح پیغام دیا جانا ضروری تھا کہ اردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ خاص طور سے اخبارات میں اشتہارات ہندی کے ساتھ اردو میں بھی جاری کیے جائیں اور عوامی مقامات، اسکول، کالج، کورٹ، کچہری اور ہسپتالوں میں ہندی کے ساتھ تمام سائن بورڈ اور تختیاں اردو میں بھی تحریر ہونا چاہیے۔

مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر لال بہادر (ایڈووکیٹ سپریم کورٹ) نے کہا کہ حکمرانوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ اردو ہندوستانی زبان ہے اور اردو کے فروغ کا مطلب ہندوستانیت کا فروغ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن جلد ہی سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں ہائی کورٹ میں پی آئی ایل داخل کرنے کی تیاری کر رہی ہے کیونکہ اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے اب لازمی ہوگیا ہے۔ اخیر میں تمام شرکا کا شکریہ حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر سیّد احمد خاں، دہلی 23 نومبر 2019

اسکول لائبریرین، ٹیچر اور مصنّفین کی ورکشاپ

جنوبی دھلی: میکس مولر مارگ واقع انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں جمعہ کو اسکول لائبریرین، ٹیچر اور مصنّفین کے لیے ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر دہلی کے نائب وزیراعلیٰ اور وزیر تعلیم منیش سسودیا نے شرکت کی۔ موجود سامعین، لائبریرین، ٹیچر اور مصنّفین سے خطاب کرتے ہوئے منیش سسودیا نے طلبہ کے لیے لائبریریوں کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ لائبریری طلبہ کو سیکھنے، بڑھنے اور سوچنے و سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ہم اپنی لائبریریوں میں اچھے مواد کے ساتھ ساتھ معیاری کتابوں کو شامل کرکے طالب علموں کے لیے پڑھنے کا اچھا ماحول بنا سکتے ہیں جو طالب علموں کو نیا نقطۂ نظر بھی دیتا ہے۔ ہم ایک قاری کے نظریے سے کتابوں کو منتخب کریں اور فیصلہ کریں کہ ہمارے بچوں کو ان کی نصابی کتابوں کے علاوہ کس طرح کے مواد سے آگاہ کرایا جانا چاہیے۔ ہم لائبریریوں کا استعمال بچوں کے جھکاؤ اور دلچسپی کے ساتھ سمجھنے کے لیے کرسکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ حکومت نے لائبریری بجٹ کو 2015 میں 1ء5 کروڑ روپے سے بڑھا کر 9 کروڑ روپے کردیا۔ ہم دہلی حکومت کے اسکول لائبریریوں کے لیے خاص طور پر ایک سالانہ کتاب میلے کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2019

محمد یوسف رضا اور محمد ثناء اللہ کی کتاب پر مذاکرہ

محمد یوسف رضا اور محمد ثناء اللہ کی کتاب پر مذاکرہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ میں شام شہریاراں کے زیرعنوان محمد یوسف رضا کی کتاب 'ندا فاضلی: حیات و جہات' اور محمد ثناء اللہ کی کتاب 'ماریشس میں اردو زبان و ادب' پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مذاکرے کی صدارت معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ ایسے وقت میں جب کہ نئی نسل کتابوں سے دور ہوتی جارہی ہے اور تحقیق کا معیار بھی زیادہ حوصلہ بخش نہیں ہے یہ دو کتابیں بڑی امید و حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ ماریشس میں اردو نہ صرف پڑھائی جاتی ہے بلکہ وہاں اعلیٰ درجے کا ادب بھی تخلیق ہورہا ہے جس کا میں خود گواہ ہوں۔ ندا فاضلی پر کام کرنا بظاہر آسان ہے لیکن اس اعتبار سے مشکل ہے کہ وہ

ہمارے معاصر ہیں اوران کافن ابھی تنقید وتجزیے کے عمل سے گزر رہا ہے لیکن محمد یوسف رضا اور محمد ثناء اللہ نے بڑی دل جمعی سے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ امید ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ایسے ہی علمی نمونے پیش کرتے رہیں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ محمد یوسف رضا اور محمد ثناء اللہ کی کتابیں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں ابھی سنجیدہ طالب علموں کی کمی نہیں ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ میں نے دنیا کے مختلف ملکوں کی یونیورسٹیوں میں قائم شعبۂ اردو کا دورہ کیا ہے اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کتابوں کی عدم دستیابی کے باوجود علمی وتحقیقی سفر جاری ہے۔ ثناء اللہ نے بڑی محنت اور سنجیدگی سے کام کیا ہے۔ آئندہ میری کوشش ہوگی کہ اردو کی دوسری نئی بستیوں پر بھی کتابیں شائع کی جائیں تاکہ ہم اردو زبان وادب کی صحیح سمت ورفتار سے آشنا ہوسکیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 نومبر 2019

غالب اکیڈمی میں ادبی نشست کا انعقاد

نئی دھلی: گذشتہ روز غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی، انھوں نے کہا کہ اقبال کی شاعری ہمیں مایوسی سے بچاتی ہے، قوت وتوانائی پیدا کرتی ہے۔ اس موقعے پر انجم عثمانی نے کہا کہ نشستوں کا کچھ وقت مقرر کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر چشمہ فاروقی نے افسانہ 'رکشہ والا' اور تبسم شاداب نے داراب بانو وفا پر مضمون پڑھا۔ اس موقعے پر موجود شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں جی آر کنول، احمد علی برقی اعظمی، عبدالرحمٰن منصور، عزم سہریاوی، نسیم بیگم، شفا کجگانوی، کیلاش سمیر، آرسی ساحل، سرفراز احمد، ودیا جین، ظہیر برنی، شاہد انور، ذہینہ صدیقی، زاہد علی خاں اثر، معین شاداب، اسرار رازی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سندھیا اگروال، منوج شوشانت، ریاض احمد اور شہلا احمد، نگار بانو ناز نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں سکریٹری کے شکریہ کے ساتھ نشست ختم ہوئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 نومبر 2019

'مولانا ابوالکلام آزاد: فکر وفن' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

اتر پردیش:

مولانا ابوالکلام آزاد: فکر وفن

علی گڑھ: قومی یومِ تعلیم کی مناسبت سے اور حکومت ہند کی تحریک پر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یک روزہ سمینار بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد: فکر وفن' کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت پروفیسر قاضی جمال حسین نے فرمائی۔ سمینار کے اہم مقالہ نگاروں کی حیثیت سے ڈاکٹر عمر رضا، ڈاکٹر سلطان احمد، پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے شرکت کی۔ ڈاکٹر عمر رضا نے 'فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مولانا ابوالکلام آزاد' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے اس نکتہ کی جانب توجہ دلائی کہ مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کو حاصل کرنے پر اصرار کیا۔ ڈاکٹر سلطان احمد نے بعنوان 'مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات اور افکار' مقالہ میں آزاد کے تعلیمی نظریات اور تعلیمی اداروں کے نصاب اور مجوزہ خاکوں کی تشکیل میں اہم رول ادا کرنے پر گفتگو کی اور کہا کہ مختلف اکادمیوں اور علم وادب اور تہذیب وثقافت کے شعبہ جات میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اپنے 'مولانا آزاد نابغہ روزگار شخصیت' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے خاص تعلق تھا۔ ساہتیہ اکیڈمی، یو.جی سی، للت کلا اکیڈمی وغیرہ کا قیام آزاد کی ہی دین ہے۔ آج اقلیتی اداروں کا تشخص صرف ان کے لائحہ عمل کے سبب ہی قائم ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر قاضی جمال حسین نے مولانا آزاد کی لازوال تخلیق 'غبارِ خاطر' کی نثر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آزاد کی تحریریں انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان میں بلیغ نثر کی تمام تر صفات جلوہ گر ہوتی ہیں۔ سمینار کے دوسرے اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ جہت شخصیت پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس میں شرکا نے دل جمعی اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا۔ مذاکرہ کا آغاز صدر شعبۂ اردو پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی گفتگو سے ہوا، جس میں انھوں نے مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مجموعی طور سے احاطہ کرتے ہوئے مباحثہ کا سلسلہ شروع کیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 15 نومبر 2019

علامہ اقبال کی شاعری میں حب الوطنی

رامپور: گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک سمینار بعنوان 'علامہ اقبال کی شاعری میں حب الوطنی' کا انعقاد عمل میں آیا۔ سمینار کا آغاز کرتے

ہوئے پرنسپل رجنی رانی اگروال نے علامہ اقبال کا ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' پڑھ کر شاعر مشرق کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر رضیہ پروین نے اقبال کی شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کی شاعری کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہر بزم وانجمن کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بچے، بوڑھے، مرد وخواتین، غرض ہر طبقے کو متاثر کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ علامہ اقبال اعلی اخلاقی قدروں اور انسانی عظمتوں کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے گوناگوں پہلو ہیں۔ ان متنوع پہلوؤں میں ان کی شاعری کا ایک تاب ناک پہلوان کی حب الوطنی ہے۔ علامہ اقبال ایک پکے اور سچے محبّ وطن شاعر تھے۔ وہ مذہبی رواداری کے پرزور حامی اور ہندوستانی فلاسفروں اور سنتوں کے مداح تھے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے حب الوطنی پر بھرپور نظمیں لکھیں۔ ایسی نظموں میں ہمالہ، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور نیا شوالہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 دسمبر 2019

جشن اردو

وارانسی: شاعر مشرق علامہ اقبال کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے عالمی یوم اردو کے موقعے پر بروز اتوار

میداگن واقع پر اٹر کراسرتی بھون کے ہال میں 'جشن اردو' کا انعقاد کیا گیا۔ مہمان خصوصی بی ایچ یو شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ اردو زبان کی مٹھاس میں مختلف مذاہب اور قوموں کا خون دوڑ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی نشو ونما ہندوستان کی سوندھی مٹی میں ہوئی جس کے ارتقا کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ زبان ہندوستان کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی اثاثے کے تحفظ کی زبان ہے۔ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ ہمارے اکابرین اور بزرگوں کی داستانیں اسی زبان میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ اگر ہمیں اس ملک میں اپنی خدمات کا دعویٰ کرنا ہوگا تو یہ اردو زبان کے وسیلے سے ہی ممکن ہے۔ جنگ آزادی کی پوری تاریخ اسی اردو زبان میں محفوظ ہے۔ مہمان اعزازی جامعہ مظہر العلوم مجلس انتظامیہ کے صدر خلیق الزماں 'خلیق' نے کہا کہ ہمیں اپنی نئی نسلوں کو ان کی مادری زبان اردو کی خاطر خواہ تعلیم دینے کا بندوبست کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی شناخت ہے۔ صدارتی خطاب میں الحاج مفتی بنارس مولانا عبدالباطن نعمانی نے کہا کہ اردو کو فروغ دینے اور اسے زندہ رکھنے میں ہندوستان کے مدارس بہت ہی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں مدارس کو تقویت دینی چاہیے۔ مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری و جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس موقعے پر کئی لوگوں کو نذیر بنارسی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروگرام کا آغاز عرفان الحق نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ اردو ٹیچر حنا پرویز اور سمیہ انصاری نے نعت پاک کا نذرانہ پیش کیا۔ لوگوں کا استقبال محبوب عالم نے جبکہ لوگوں کا شکریہ تنظیم کے صدر ڈاکٹر احتشام الحق نے ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت عبدالرحمٰن نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2019

یادِ اقبال

علی گڑھ: سماجی تنظیم وراثت کے زیراہتمام منعقد جلسہ 'یادِ اقبال' سے خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی

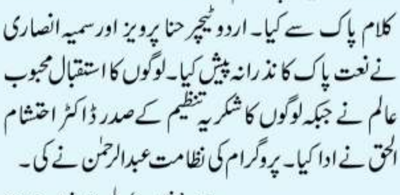

معروف ادیب حبیب الرحمٰن چغانی نے کہا کہ علامہ اقبال نے اردو زبان کے ذریعہ محبت، پیار، حلاوت اور چاشنی کا پیغام دیا۔ مہمانِ اعزازی شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے کہا کہ وہ کسی ایک خطہ یا ملت کے شاعر نہیں تھے بلکہ ایک آفاقی نظریہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر مامون رشید نے شرکائے جلسہ سے اپیل کی کہ وہ اردو کو اپنا مقام دلانے کے لیے جدوجہد کو تیز کریں، پھر سے محنت کریں اور بچوں کو گھروں اور اسکولوں میں اردو کی تعلیم دلانے پر توجہ مرکوز کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو اخبار اور میگزین کو عام کرنا ہوگا۔ جلسہ کے کنوینر وسماجی تنظیم وراثت کے جنرل سکریٹری افضال احمد نے جلسہ کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ ان کو سچا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ہم ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں۔ جلسہ کی صدارت معروف ادیب مسعود الرحمٰن نے کی۔ اس موقعے پر خاصی تعداد میں محبانِ اردو اور طلبا وطالبات کے ساتھ معززین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 نومبر 2019

قومی یومِ تعلیم پر توسیعی خطبہ

علی گڑھ: آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کی تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام کو

ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور تعلیمی نظام کی بنیاد سمجھے جانے والے کئی ادارے قائم کیے، جن میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اور ساہتیہ اکادمی شامل ہیں۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم کے زیراہتمام قومی یوم تعلیم کے موقعے پر مشہور ماہر تعلیم اور پلاننگ کمیشن کی سابق رکن ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر حمید نے مزید کہا کہ ملک کی تعلیمی پالیسی پر مولانا آزاد نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں لیکن نئی نسل کو اس عظیم شخصیت کے کارناموں اور ان کی خدمات کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد ہندوستان کی کثیر مذہبی ثقافت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے لیے وقف رہے اور اپنی پوری زندگی انھوں نے ہندوستانی سیکولرزم کے اصولوں کو مضبوط بنانے میں صرف کی۔ معروف ماہر تعلیم شعبۂ ترسیل عامہ کے صدر پروفیسر شافع قدوائی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سیدہ سیدین نے مولانا آزاد کی تصنیفات سے قومیت کے اصولوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جس سے نئی نسل کے بچوں کو آزادی اور سیکولرزم کے اصولوں کو اپنی زندگی میں اتارنے کی سمجھ پیدا ہوگی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سیدہ سیدین نے اپنی ہمشیرہ بیگم ذکیہ سیدین ظہیر کے ساتھ مل کر مرتب کی گئی اپنے والد ڈاکٹر کے۔جی۔ سیدین کی کتاب 'اے لائف ان ایجوکیشن' کی ایک کاپی شعبۂ تعلیم کو پیش کی۔ پروگرام میں نامور ماہر امراض اطفال ڈاکٹر حمیدہ طارق بھی موجود تھیں۔ شعبۂ تعلیم کی سربراہ پروفیسر نسرین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاذیہ منصوری نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 نومبر 2019

عالمی یوم اردو اور یوم تعلیم

علی گڑھ: اتر پردیش اردو ٹیچر ایسوسی ایشن علی گڑھ اور شمس مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام شاعر مشرق

علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر عالمی یوم اردو اور یوم تعلیم کا انعقاد فیض العلوم جونیئر ہائی اسکول جمال پور میں ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر شافع قدوائی نے کی۔ مہمان خصوصی محترمہ سواستی راؤ کلہری (اہلیہ ایس ایس پی علی گڑھ) اور مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر شکل صدانی اور تحسین علی اساروی موجود رہے۔ نظامت کلیم تیاگی نے کی اور کنوینر کنور نسیم شاہد رہے۔ پروگرام کا آغاز تلاوتِ کلام پاک اور ہما ظہیر کی نعت پاک سے ہوا۔ اس موقعے پر محترمہ سواستی راؤ کہلری نے کہا کہ اردو ہمارے ملک کی زبان اور نہایت شیریں اور تہذیب وتمدن کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ میں اس کے رسم الخط سے واقف نہیں مگر اردو زبان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر شافع قدوائی نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ ایسے پروگرام ہمیشہ ہوتے رہنے چاہئیں۔ ان سے بچوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور بچوں کا تعلیم کے تئیں رجحان بڑھتا ہے۔ پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ آج ہم سب کو علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے پیغام کو عام کرنے

کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے تعلیم اور ملک میں بھائی چارہ پیدا کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی داؤں پر لگا دی۔ اسی طرح علامہ اقبال نے نوجوانوں کے اندر اپنی شاعری سے ایسی روح پھونکی جس کو اپنانے سے کامیابی کی منزلوں کو طے کیا جا سکتا ہے۔ پروگرام کے کنوینر کنور نسیم شاہد سرپرست اتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن نے آئے ہوئے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی محترمہ سواتی راؤ کاہری کو علامہ اقبال ایوارڈ، پروفیسر شافع قدوائی کو مولانا ابوالکلام آزاد تعلیمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور پروفیسر شکل صمدانی و تحسین علی اساروی کو بھی مومنٹو دے کر ان کا استقبال کیا گیا۔ اس کے علاوہ ماسٹر جنید صدیقی، بھوونیندر سنگھ کو اردو تعلیم کے فروغ، تعلیمی میدان میں فیض الرحمٰن، شریف الرحمٰن اور نظام الدین، عارفین، عبیرہ رضوان، ادیبہ رحمٰن، رافع نظام، عبدالحنان، حمدان لائبہ اور ہما ظہیر کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 نومبر 2019

یومِ شبلی

اعظم گڑھ: علامہ شبلی نعمانی نے اعظم گڑھ میں 1884 میں کالج قائم کیا تھا۔ آج شبلی و ڈگری کالج، شبلی انٹر کالج و

شبلی نرسری کالج کی شکل میں موجود ہے لیکن ان کے خوابوں کی تعبیر دارالمصنفین شبلی اکادمی ہے جہاں کی خدمات اور کارنامہ روز روشن کی طرح عالم اسلام پر عیاں ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مبارکپور اسمبلی حلقہ سے رکن اسمبلی اور شبلی کالج کے منیجر شاہ عالم گڈو جمالی نے یوم شبلی پر شبلی ڈگری کالج میں منعقد ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے شبلی اکیڈمی کو تین لاکھ روپے کی معاونت کا بھی اعلان کیا۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ شبلی نعمانی عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ جامعہ ازہر مصر کی تعلیمی تشکیل نو میں جن تین لوگوں کا نام آتا ہے ان میں اعظم گڑھ کے علامہ شبلی نعمانی بھی تھے۔ انھوں نے اعظم گڑھ کو ایک بین الاقوامی شناخت دی اور جو اعظم گڑھ میں علمی فیض جاری ہے وہ شبلی کی قربانیوں اور نیک جذبہ کا ثمرہ ہے۔ شبلی انٹر کالج پرنسپل نثار احمد نے کہا کہ شبلی نعمانی کا مقصد لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا تھا۔ وہ سرسید تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کی مشہور تصانیف میں سیرت النبیؐ، الفاروق، المامون، الغزالی، شعرالعجم وغیرہ ہیں۔ اظفر غزنوی، ڈاکٹر محمد خالد اور ڈاکٹر علاء الدین خان نے بھی خطاب کیا۔ نظامت ڈاکٹر علاء الدین خان نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2019

حمیدیہ گرلس کالج میں 'نوائے اردو' پروگرام

الہ آباد: حمیدیہ گرلس ڈگری کالج کے شعبۂ اردو کی تنظیم 'بزم ادب' کی جانب سے ہفت روزہ اردو پروگرام 'نوائے اردو' کا اختتامی جلسہ منعقد کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز حمد باری تعالیٰ، مومنٹو اور نذرانۂ گل پیش کرتے ہوئے کیا گیا۔ پرنسپل ڈاکٹر یوسف نفیس نے خطاب کرتے ہوئے کہا ہانگلو صاحب کالج کی ترقی کے لیے جس طرح کوشاں ہیں اور نئی راہیں ہموار کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر رتن لال ہانگلو، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی نے کالج کے منتظمین کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے غالب و اقبال کی شاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غالب صرف خواص کے نہیں عوام کے بھی شاعر ہیں کیونکہ غالب کے چند اشعار بھی کسی محفل میں پڑھنے پر سوگوار ماحول بھی خوشگوار ماحول میں بدل جاتا ہے۔ ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب کا بہت بڑا حوالہ ہے اور دیوانِ غالب کو میں کسی مذہبی کتاب سے کم نہیں سمجھتا۔ طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم میں پڑھنے سے اپنے کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ انگریزی زبان ایک دم کھڑی زبان ہے۔ اردو زبان میں جھکاؤ ہے مگر افسوس کہ ہندوستان کو تو آزادی دلا دی گئی لیکن ذہن آج تک آزاد نہیں ہوا۔ اس موقعے پر 19-2018 میں اوّل مقام حاصل کرنے والی طالبات کو وائس چانسلر پروفیسر ہانگلو کے بدست گولڈ میڈل بھی تقسیم کیے گئے نیز کالج کی اردو کتابت کی طالبات کے ذریعے اردو خوشخطی میں غالب کو نذر کرتے ہوئے غالب کے منتخب اشعار کی نمائش بعنوان 'شوخیِ تحریر' کا بھی افتتاح وی سی صاحب کے بدست ہوا۔ نمائش کی کارکردگی کو بطور مجلّہ بھی پیش کیا گیا۔ جلسہ کے اعزازی مہمان پروفیسر علی احمد فاطمی سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد نے اختتامی خطبہ ادا کرتے ہوئے کالج کے شروعاتی دور سے موجودہ دور تک کی کارکردگی پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر آنند شنکر پرنسپل ایسورسرن ڈگری کالج، الہ آباد نے طالبات کو خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اردو زبان ضرور سیکھنی چاہیے گو کہ میں اس زبان سے نابلد ہوں، تاہم غالب کے اشعار ہمارے قدیم ویدک یگ کی یاد دلاتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شبنم حمید صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے بھی خطاب کیا۔ تزئین احسان اللہ منیجر حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، الہ آباد نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ہفت روزہ پروگرام کے تمام مسابقتی مقابلوں میں انعام یافتہ طالبات کو پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر شبنم حمید کے ہاتھوں انعامات بھی تقسیم کرائے گئے۔ اردو عالمی جریدہ 'نقش نو' کی رسم اجرا بھی کرائی گئی۔ پروگرام کی نظامت ناصحہ عثمانی اور رسم تشکر زرینہ بیگم ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو نے ادا کی۔ قومی ترانہ کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 نومبر 2019

راجندر پرساد دویدی کی اردو سے محبت

گونڈہ: اردو ادب کی شیرینی اور انقلابی فکر کے مضامین سے متاثر ہو کر ایک پرائیویٹ اسکول النور انٹر کالج میں اپنی تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے ہندی ٹیچر راجندر پرساد دویدی اردو سیکھ کر گنگا جمنی تہذیب کی ایک شاندار مثال بن رہے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان میں اپنے قلم سے پیارے ملک ہندوستان، بھارت کا نام لکھنے کے ساتھ اپنا نام بھی بڑے ہی خوشخط انداز میں لکھ کر دکھایا اور بتایا کہ میں جب منشی پریم چند کی حیات و خدمات کو پڑھتا ہوں تو ان کے 'سوزِ وطن' کی آرا مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں کہ کس طرح ان کے اس مضمون پر انگریزی حکومت نے پابندی عائد کرتے ہوئے کتاب کو ضبط کر لیا تھا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے لیے ان کے اندر دلچسپی پیدا ہوئی لیکن وہ کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکی، جس کے بعد انھوں نے اردو سیکھنے کی ٹھان لی اور کئی سال قبل ان کے ساتھ پڑھانے والے اسرار احمد سے انھوں نے اردو سیکھنی شروع کی۔ یکے بعد دیگرے کالج کے دیگر اردو داں اساتذہ سے انھوں نے مدد حاصل کی اور آہستہ آہستہ وہ اردو کو پڑھنے اور لکھنے لگے اور اب چھوٹے بچوں کو اردو کی بنیادی تعلیم بھی دینے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو ایک

ایسی پیاری زبان ہے جو ہمارے ملک کی ملی جلی ثقافت کی علامت ہے۔ مشترکہ تہذیب کو بخوبی اس زبان سے فروغ دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان ہمارے ہی ملک کی زبان ہے، جس میں سبھی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان سے ملک کا ہر طبقہ اپنے آپ کو منسلک پاتا ہے، اس کو ہم سب کو مل کر فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2019

بہار:

مولانا ابوالکلام آزاد یادگاری خطبہ

پٹنہ: مولانا آزاد کی عبقری شخصیت کے بہت سارے پہلو تھے۔ وہ بیک وقت عظیم مفکر، مدبر، دانشور، صحافی، سیاست داں، مجاہد آزادی، قومی یک جہتی کے علمبردار ایک عظیم انسان تھے۔ مولانا آزاد نے ملک و ملت کی فلاح کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ سائنسی تعلیم وٹیکنالوجی پر زور دیا۔ مولانا آزاد نے ملک کے نئی نسل کو پیغام دیا کہ وہ امن، اتحاد، باہمی اعتماد اور حب الوطنی کے جذبہ کو قائم کریں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر امتیاز احمد نے کیا۔ وہ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائریکٹوریٹ کے زیر اہتمام ابھیلیکھ بھون، بیلی روڈ، پٹنہ میں منعقد مولانا ابوالکلام آزاد یادگاری تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد مغربی تعلیم کی افادیت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اور انگریزی زبان مغرب کی ہی دین ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے مغربی تعلیم کے منفی پہلو اور اس کے مضرات سے بھی انکار نہیں کیا۔ مولانا آزاد نے بنیادی ابتدائی تعلیم سے لے کر سائنسی اور ٹیکنالوجی کے اعلیٰ تعلیم کے حصول پر بھی زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد تعلیم کے ساتھ تہذیبی وراثت کی اہمیت اور اس کے تحفظ و بقا کو لازمی سمجھتے تھے۔ وہ تعلیم کو صرف علمی صلاحیت میں اضافہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ علم انسان کے ذہنی نشو و نما کا اہم ذریعہ ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور جدید ہندستان کے معمار امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا نام ملک کی ان عظیم ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے نہ صرف ملک کو آزادی دلانے میں بلکہ آزادی کے بعد اس کی تعمیر نو میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے ملک میں تعلیم خصوصاً عصری اور تکنیکی تعلیم کی ایسی بنیاد ڈالی جس پر آگے چل کر ہندوستانی تعلیم کا ناقابل تسخیر قلعہ تعمیر کیا جاسکا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے نوشاد اورنگ آبادی اور ڈاکٹر محبوب عالم اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے ایم ٹی خان نے بھی مولانا آزاد پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے پروگرام کی نظامت اور ابتدائی کلمات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2019

عصر حاضر میں فروغ اردو: ضرورت و اہمیت

پٹنہ: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس ویمن ونگ بہار کی جانب سے منعقد سمینار 'عصر حاضر میں فروغ اردو ضرورت و اہمیت' میں ڈاکٹر محمد شمیم اختر سکریٹری آل انڈیا طبی یونانی کانگریس نے کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے۔ یہ صرف غالب، میر اور مومن کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ پنڈت برج نرائن چکبست اور جگت موہن رواں، شنکر کیموری اور لتا حیا کی زبان بھی ہے۔ یہ انسانیت کی زبان ہے اور دیگر قوموں کے اتحاد و یکجہتی کی زبان ہے۔ معروف صحافی ریحان غنی نے کہا کہ عوام اردو کا رونا روتے ہیں مگر آج اردو ڈائریکٹوریٹ بہار اردو کے فروغ میں بہتر کام انجام دے رہا ہے۔ عبدالواحد انصاری نے کہا کہ اردو کو روزگار سے جوڑ کر آج پورے بہار میں حکومت نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اردو داں طبقے اور مسلمانوں کے لیے خوش آئند ہے۔ فخرالدین عارفی نے کہا کہ ہماری ذمہ داری ہے کہ وہ اردو کو فروغ دیں اور اردو اخبارات کو اپنے گھر کی زینت بنائیں۔ جاوید حیات صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی نے کہا کہ اردو کو ہندوستان میں جس نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ آج وزیر اعظم بھی اردو کے اشعار اپنی تقریروں میں پڑھتے ہیں۔ آل انڈیا طبی کانگریس کے کارگزار صدر ڈاکٹر عبدالسلام فلاحی نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کا تعلق خانقاہوں اور درباروں سے بھی ہے۔ یہ جہاں میر و غالب کی چوکھٹ کی زبان ہے وہیں پیر و مرشد کے آستانوں کی زبان بھی ہے۔ اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے قومی نائب صدر پروفیسر سید فضل اللہ فاروقی نے کہا کہ ہم تمام اردو کے مجاہدوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے قومی وراثت کو جس خوبصورتی کے ساتھ بچانے کی کوشش کی وہ یقیناً قابل صد تحسین ہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس ویمن ونگ کی صدر ڈاکٹر کائنات زہرا نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 10 نومبر 2019

حسرت موہانی: شخصیت اور خدمات

پٹنہ: مولانا حسرت موہانی ایک ایسے انسان، ایک ایسے شاعر، ایک ایسے ادیب، ایک ایسے ناقد، ایک ایسے صحافی اور ایک ایسے سیاست داں تھے جنھوں نے ایک انسان کی

حیثیت سے انسانوں کے دکھ درد کو سمجھا۔ یہ بات سینئر صحافی اور ادبی تنظیم 'ہم نشیں' کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ریحان غنی نے 'حسرت موہانی شخصیت اور خدمات' کے موضوع پر لکچر دیتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ حسرت موہانی نے شاعر کی حیثیت سے رومانی اور رجائی شاعری کو جلا بخشی، ادیب کی حیثیت سے ادب کا اعلیٰ معیار قائم کیا اور ناقد کی حیثیت سے صحت مند تنقید کے راستے ہموار کیے۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے صحافی کی حیثیت سے صحافت کا شاندار اور معیاری نمونہ پیش کیا۔ حسرت موہانی نے جولائی 1903 میں اردوئے معلی کے نام سے ایک معیاری رسالہ نکالا۔ یہ اردو کا پہلا ایسا رسالہ ہے جس نے مسلمانوں میں قومیت پر مبنی سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پروگرام کی صدارت ادارے کے صدر اور ممتاز مصنف ڈاکٹر عتیق الرحمٰن نے کی۔ اس موقعے پر سابق صدر شعبہ اردو ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ اور خانقاہ شاہ ارزانی کے سجادہ نشیں ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 نومبر 2019

تقریری وحوصلہ افزا انعامی مسابقہ پروگرام

بتیا: آج کا دور مقابلہ اور مسابقہ آرائی کا ہے اور ملک و ملت کا نام وہی روشن کرسکتا ہے جس کے اندر آگے بڑھنے اور مسابقہ آرائی کی صلاحیت ہو کیونکہ مسابقہ جاتی مقابلوں سے بچوں کی صلاحیت میں نکھار آتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ڈاکٹر شمس الحق نے اردو ڈائریکٹوریٹ حکومت بہار کے زیر اہتمام اور ضلع اردو سیل مغربی چمپارن کے زیر انتظام کیدار پانڈے ہائر سیکنڈری اسکول بتیا کے احاطے

میں منعقد تقریری وحوصلہ افزا انعامی مسابقہ پروگرام کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح اچھی صحت کے لیے صفائی کی اہمیت ہے اور چاق و چوبند رہنے کے لیے کھیل کود اور ورزش ضروری ہے، اسی طرح بچوں کی خفیہ صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کے لیے اس طرح کے مقابلہ جاتی پروگراموں کا انعقاد ضروری ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے جو اسی سرزمین پر پیدا ہوئی اور یہیں پر اس نے پرورش پائی۔ یہ کسی مخصوص فرقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس موقعے پر ادبی سنگم بتیا کے صدر و بزرگ شاعر ابوالخیر نشتر نے کہا کہ اردو ہماری قومی اور ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ اس میں ہمارا علمی ورثہ محفوظ ہے۔ اس موقعے پر اعجاز حسین نے کہا کہ اردو زبان شخصیت کی نشو و نما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس موقعے پر نامور شاعر قمر الزماں قمر نے کہا کہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ اردو ہماری تہذیبی میراث ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو زبان کے فروغ کے تئیں سنجیدہ ہوں۔ اس موقعے پر صفدر حسین صفدر نے کہا کہ اگر سیاست کو درکنار کر دیا جائے تو عوامی سطح پر اردو کے تئیں کہیں کوئی مخالفت یا منافرت نہیں ہے۔ اردو ہماری اپنی اور اپنے ملک کی زبان ہے، اسے صرف مسلمانوں سے جوڑنا نہ صرف اردو کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ اپنی تہذیب کو کمزور کرنے کی مجرمانہ کوشش ہے۔ اس موقعے پر ضلع اردو سیل کے انچارج محمد امیر اللہ نے مذکورہ مسابقہ پروگرام کے تعلق سے کہا کہ بچوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کا اس طرح کا پروگرام ایک اچھا پلیٹ فارم ہے۔ تمام شرکائے مقابلہ کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس طرح کے مقابلہ جاتی پروگرام کرانے کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں آگے بڑھنے کا رجحان پیدا ہوا اور بچے اپنی تعلیم اور اپنے روشن مستقبل کے تئیں سنجیدہ ہوں۔ اس موقعے پر مسابقہ میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبا و طالبات فاطمہ پروین، ادیبہ پروین، ارم پروین، قیوم عالم، ناظرینہ فردوسی، زینت شمس، نزہت ناصرین، ثانیہ صدیقی، سمیع اللہ، محمد شہنواز، فرمان حواری، بصرہ یاسمین، محمد نیاز، روزی پروین، شبنم خاتون، شہباز عالم، خوشبو پروین، سفینہ پروین اور صوفیہ پروین وغیرہ کو مذکورہ محکمہ کی جانب سے اعزازی سند سے نوازکر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی، ساتھ ہی انھیں انعامی رقم کی ادائیگی آرٹی جی ایس کے توسط سے کی گئی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2019

تلنگانہ:

زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریب

حیدرآباد: زندہ دلان حیدرآباد کی دو روزہ سالانہ تقاریب حیدرآباد میں سالانہ جشن طنز و مزاح کی حیثیت رکھتی ہیں جو 26 نومبر کی شب کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کے انعقاد پر اپنی انتہا کو پہنچیں۔ ریاست تلنگانہ کے وزیر داخلہ جناب محمد محمود علی نے اس مشاعرے کا افتتاح انجام دیا اور خوشی کا اظہار کیا کہ زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعرے کافی کامیاب ہوا کرتے ہیں۔ جناب محمود علی نے کہا کہ تلنگانہ میں اردو زبان نے کافی ترقی کی ہے، چیف منسٹر اردو زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، اور اس کے قدرداں ہیں۔ تمام اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آندھرا پردیش کی اسمبلی جو تین سال تک ہمارے پاس تھی، اردو میں کوئی بات نہیں کی گئی۔ چیف منسٹر نے 60 اردو آفیسرز کا تقرر کیا ہے تاکہ اردو والوں کے مراسلوں کا اردو میں جواب دیا جاسکے۔ تمام وزیروں کے پاس آج اردو کے مترجمین موجود ہیں۔ اقامتی اسکول قائم کیے اور ان تمام میں اردو اور عربی پڑھانے کے لیے اساتذہ کا تقرر کیا گیا۔ اس زبان کو مزید ترقی دینے کے لیے اور بھی اقدامات کیے جائیں گے۔ مصطفیٰ کمال ایڈیٹر ماہنامہ شگوفہ کو شعرائے کرام نے تہنیت پیش کی اور ماہنامہ شگوفہ کی ادبی خدمات کو سراہا۔ آخر میں کنوینر مشاعرہ سردار اثر نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 27 نومبر 2019

راجستھان:

فن تاریخ گوئی

اجمیر: بھگونت یونیورسٹی، اجمیر میں شعبۂ اردو کی جانب سے ایک کامیاب توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا گیا۔ شعبہ کے دوسرے توسیعی خطبہ کی خصوصی مقرر ڈاکٹر ناصرہ بصری (صدر شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی، جے پور) تھیں، جنھوں نے ایک اہم موضوع 'فن تاریخ گوئی' پر اپنا قیمتی اور پرمغز خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے تاریخ گوئی کی اقسام پر تفصیلی بحث کی اور حروف تہجی کی تاریخ کو حضرت آدمؑ اور نوحؑ کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس فن کو سیکھنا آسان ہے لیکن ہم اردو والے اس فن پر توجہ نہیں کررہے ہیں، نیز اردو ادب کے تاریخ گو شعرا کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ یہ فن بڑا مشکل ہے، اس فن میں بیشتر شعرا نے طبع آزمائی کی لیکن سبھی شعرا کامیاب نہ ہوسکے۔ پروگرام کے مہمانِ خصوصی عالی ظفر احمد خان (ایڈوکیٹ اینڈ اسپیشل پبلک پراسیکیوٹر فار نارکوٹکس کنٹرول بیورو، اجمیر) تھے۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بھگونت یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اپنے مختلف ادبی سرگرمیوں کے وجہ سے راجستھان کی دیگر یونیورسٹیوں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کررہا ہے۔ اردو زبان و ادب میں فن تاریخ گوئی کی اپنی ایک مخصوص روایت رہی ہے، جس کی حفاظت نئی نسل کے شعرا پر عائد ہوتی ہے۔ پروفیسر آر۔ کے ماتھر (پرووائس چانسلر وڈین، انٹرنیشنل، بھگونت یونیورسٹی، اجمیر) نے پروگرام کی صدارت کا فریضہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو بہت پیاری زبان ہے، ہمارے آباواجداد کی یہ میراث ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ پورے بھارت میں زیادہ تر لوگ اردو بولتے ہیں اور بیشتر زبانوں پر اردو کا اثر ہے، یہی اس کی مقبولیت ہے۔ ڈاکٹر شاکر علی صدیقی (صدر شعبۂ اردو، بھگونت یونیورسٹی) نے اپنے استقبالیہ کلمات میں تمامی مہمانوں کا پرخلوص استقبال کیا۔ نظامت کا فریضہ صوفیہ چشتی (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بھگونت یونیورسٹی) نے بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ آخر میں رجسٹرار بھگونت یونیورسٹی نے اظہارِ تشکر کی رسم ادا کی۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 28 نومبر 2019

ہریانہ:

علامہ اقبال اور اردو زبان

نوح، میوات: شاعر مشرق حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے یوم پیدائش کو علاقہ میوات میں یوم اردو کی شکل میں بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ اس موقعے

پر علاقہ کے مختلف مقامات پر سماجی، ادبی و مذہبی تنظیموں اور تعلیمی اداروں کی جانب سے 'علامہ اقبال اور اردو زبان' کے عنوان سے مختلف پروگرام منعقد کیے گئے جن میں علاقہ کی سیکڑوں سرکردہ شخصیات نے شرکت کر کے ڈاکٹر محمد اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ضلع ہیڈ آفس نوح میں واقع صوبہ ہریانہ کے واحد اردو میڈیم مانو ماڈل اسکول میں بھی اس موقعے پر پرنسپل محمد ارشد خان کی صدارت میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر

لیلین میوڈگری کالج نوح، نصیرالدین اظہر نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ شاعر نصیرالدین اظہر نے اس موقعے پر اردو زبان کی اہمیت اور اس کی افادیت پر مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی۔ پرنسپل مانو ماڈل اسکول نوح نے کہا کہ ترانہ ہند کے خالق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا شمار اردو ادب کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں افکار و شعور کا ایک ایسا طلسم ہے جو رہتی دنیا تک قارئین ادب کو متاثر کرتا رہے گا۔ علامہ کا لکھا تاریخی قومی ترانہ ’سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا‘ آج بھی عام آدمی کی زبان پر رہتا ہے۔ آخر میں پرنسپل ارشاد خان نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 9 نومبر 2019

اعزاز و اکرام:

مشتاق احمد نوری

پٹنہ: مشہور افسانہ نگار اور بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد، روزنامہ قومی تنظیم کے مدیر اعلیٰ ایس ایم اشرف فرید اور معروف بزرگ

شاعر ناشاد اورنگ آبادی کو یہاں منعقدہ ایک تقریب میں ’کلیم اللہ کلیم دوست پوری‘ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جاری ریلیز کے مطابق اس کے لیے دیگر ایوارڈ یافتگان میں روزنامہ ہمارا نعرہ کے مدیر و معروف صحافی انوارالہدیٰ کو صحافی خدمات ایوارڈ، ظہیر انور کو صحافتی و شعری خدمات ایوارڈ، ڈاکٹر مظہرالحق، صحافی اشرف استھانوی، ڈاکٹر کلیم اختر، فردوس گیاوی، شکیل سہسرامی، ظفر صدیقی کو فروغ اردو خدمات ایوارڈ، ڈاکٹر یاسمین اختر، معصومہ خاتون، ڈاکٹر ارشاد احمد، شمیم فاطمہ کو ترویج ادب ایوارڈ نامور پروفیسر علیم اللہ حالی اور کلیم اللہ کلیم دوست پوری کے ہاتھوں دیا گیا۔ اردو زبان و ادب کی مجموعی خدمات ایوارڈ کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی کو منتخب کیا گیا۔ مولانا مظہرالحق عربی فارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ ایوارڈ دے کر اردو ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ کلیم اللہ کلیم دوست پوری نے اس کی زندہ روایت شروع کی ہے اور اردو کے خدمت گزاروں کو ایوارڈ سے نوازا ہے جو واقعی اس کے حقدار ہیں۔ نظامت معروف افسانہ نگار و سلگتے خیموں کا شہر کے مصنف اور معروف ناظم تقریب و مشاعرہ فخرالدین عارفی نے نے کی۔ صدارتی خطبہ میں پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ کلیم اللہ کلیم دوست پوری اپنے نام سے ایوارڈ شروع کرکے اردو ادب کا بہت بڑا کام کررہے ہیں۔ اس بار انھوں نے ادب کی چنندہ شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اس سے اردو کی خدمت کرنے والوں کو حوصلہ ملتا ہے۔

روزنامہ ’میرا وطن‘ دہلی، 14 نومبر 2019

خالد جاوید

نئی دهلی: اردو کے ممتاز فکشن نگار اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر خالد جاوید کو ہندی ادب کے

باوقار ’پاکھی سمان‘ سے سرفراز کیے جانے پر اردو حلقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ واضح رہے کہ یہ ایوارڈ ان کے ناول ’موت کی کتاب‘ کے لیے دیا گیا ہے جس کا انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ’شبد سادھک انیہ بھاشا سمان‘ اس سے قبل صرف ہندی زبان کے ادیبوں کو دیا جاتا رہا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب ہندی ادب سے وابستہ اس سمان کے لیے کسی اردو ادیب کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے صدر، پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ پروفیسر خالد جاوید اردو فکشن میں اپنے کارناموں کی بدولت عالمی سطح پر شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ایک نامور تخلیقی فنکار ہونے کے ساتھ بے پناہ انسانی خوبیوں کے مالک بھی ہیں۔ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات کے علاوہ مختلف شہروں سے پروفیسر خالد کو ادیبوں اور دانشوروں نے مبارکباد پیش کی اور ان کو اس ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 15 نومبر 2019

نور دیوبندی

دیوبند: سماجی تنظیم آل انڈیا بزم عنوان چشتی کے زیراہتمام ایک ادبی پروگرام کا انعقاد محلّہ ابوالمعالی میں حاجی عاشق کی رہائش گاہ پر کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے فیتہ کاٹ کر کیا، صدارت پروفیسر نویر چشتی نے کی، نظامت ڈاکٹر صادق دیوبندی نے انجام دی۔ اس موقعے پر ادبی خدمات انجام دنے والے شاعر نور دیوبندی کو بزم کی جانب سے ’عنوان چشتی ایوارڈ‘ سے نوازا گیا۔ نور دیوبندی کو ایوارڈ ملنے پر شہر کے سارے شاعروں اور ادیبوں نے مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر مولانا قاری سی ایم مصطفیٰ نے کہا کہ نور دیوبندی کافی وقت سے اردو کی خدمت کررہے ہیں اس لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کہا کہ نور دیوبندی دیوبند کے اردو ادب میں ایک نمایاں نام ہے، انھیں اعزاز سے نوازا جانا پورے شہر کے لیے اعزاز کی بات ہے۔

روزنامہ ’اخبارِ مشرق‘ دہلی، 15 نومبر 2019

راؤ عبدالستار

دیوبند: اردو ٹیچرز ویلفیئر ایسوسی ایشن کی تقریب میں اردو ہندی پندرہ روزہ دیوبند ٹوڈے کی جانب سے 25 سالوں سے تعلیمی، سماجی اور ادبی خدمات انجام دینے کے اعتراف میں اردو ٹیچر ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ضلع صدر و راؤ برادری

کی قدآور شخصیت راؤ عبدالستار کو ’رئیس القلم حافظ سید اظہر شاہ ایوارڈ‘ سے نوازے جانے پر شہر کے ٹیچرز، ادبا اور دانشوران نے خوشی کا اظہار کیا ہے۔ اس موقعے پر راؤ عبدالستار نے کہا کہ انھیں اب تک سیکڑوں ایوارڈ مل چکے ہیں لیکن انھیں جو رئیس القلم حافظ سید اظہر شاہ ایوارڈ دیا گیا ہے یہ ایوارڈ اب تک ملے تمام اعزازات سے خاص اس لیے ہے کہ حافظ سید اظہر شاہ قیصر تقریباً 45 سالوں تک رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر رہے، ساتھ ہی وہ ملک کے مختلف سات اخبارات کے تقسیم سے پہلے ایڈیٹر رہے۔ ایسی شخصیت کے نام پر ایوارڈ ملنا ان کے لیے فخر کی بات ہے۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 15 نومبر 2019

شاعر و ادیب نیر جلال پوری کا استقبال

امروهه: بزمِ صادقین کے زیراہتمام معروف شاعر و ادیب پروفیسر عباس رضا نیر جلال پوری کے استقبال میں ایک شام صدر دفتر محلّہ بگلہ میں آراستہ کی گئی جہاں عاشقان

اردو اور شہر امروہہ کی دیگر معزز شخصیات نے حصہ لیا اور پروفیسر نیر جلال پوری کی شخصیت، ان کی علمی ادبی خدمات پر تبادلہ خیال کیا۔ استقبالیہ تقریب کا افتتاح انجمن تحفظ عزاداری کے نائب صدر لیاقت امروہوی نے نعت پاک سے کیا جس کے بعد ڈاکٹر لاڈلے رہبر نے منقبت پیش کی۔ افتتاحی تقریر میں سید ولی حیدر نقوی نے پروفیسر عباس رضا نیر جلال پوری کی شخصیت پر مدلل و جامع تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ نیر جلال پوری ایک بیباک ناظم، ایک منفرد لب و لہجہ کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے نامور دانشور، محقق، قلمکار، نثر نگار ہیں جو مسلسل اردو زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی کئی درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس دوران انجمن کی جانب سے موصوف کو ردائے ادب پہنائی گئی اور ان کی خدمت میں معزز شخصیات نے گلدستہ پیش کیا۔ اسی موقعے پر پروفیسر نیر جلال پوری نے اپنے مخصوص انداز میں کلام پیش کیا جس کو اہل علم و ادب نے بہت پسند کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 17 نومبر 2019

عالمی یوم اردو تقریب کے موقعے پر ایوارڈ

نئی دھلی: ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور اضلاع

کے علاوہ بیرون ملک میں متعدد مقامات پر عالمی یوم اردو تقریبات کا انعقاد کیا گیا جس میں شرکا نے اردو کے چاہنے والوں کو اس زبان کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے لیے زبانی جمع خرچ کے بجائے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر عملی اقدامات کی ضرورت پر زور دیا۔ علامہ اقبال کی یومِ پیدائش کی مناسبت سے عالمی یوم اردو کی سب سے اہم تقریب یہاں غالب اکیڈمی میں منعقد ہوئی۔ اس کا انعقاد اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کی جانب سے مشترکہ طور پر کیا گیا۔ اس موقعے پر ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ ماتم اور نوحہ گری کا وقت نہیں ہے۔ احساس کمتری کو دلوں سے نکال دیجیے۔ یہ صارفیت کا دور ہے اور اس دور میں کوئی بھی کاروباری اردو بولنے اور اردو پڑھنے والی کروڑوں آبادی کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کوئی بھی حکومت اور سیاسی جماعت اتنی بڑی آبادی سے غافل نہیں رہ سکتی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی بات کو پرزور اور متاثر کن انداز میں کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ جو بچے اردو پڑھتے ہیں ان کے اندر اچھی اخلاقی خوبیاں بھی پروان چڑھتی ہیں اس لیے اگر آپ اپنے گھروں کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں اور اپنے بچوں کی قسمت بدلنا چاہتے ہیں تو ان کا شین قاف درست ہونا چاہیے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اردو کو اپنی ضرورت سمجھ کر، اپنے اولاد کی ضرورت سمجھ کر اور ایک نسخۂ کیمیا سمجھ کر اپنائیں۔ اردو کو اس کا قانونی اور آئینی حق دلانے کے لیے برسوں سے سرگرم الہ آباد کے لال بہادر گوڑ نے شکوہ کیا کہ اردو والے خود ہی اردو سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ وہ اپنے آئینی حق لینے کے لیے محنت کرنے کے بجائے سہل پسندی اور احساس کمتری سے دوچار ہیں۔ تقریب سے حکیم اجمل خان طبیہ کالج کے پروفیسر محمد ادریس، خورشید شفقت اعظمی، اردو دنیا کے نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی، پھلواری شریف سے آئے پروفیسر فضل اللہ قادری، ماہنامہ خیراندیش، جلگاؤں کے مدیر خیال انصاری اور شمشاد احمد (راجستھان) نے خطاب کیا۔ پروگرام کی نظامت سینئر صحافی سہیل انجم نے کی۔ عالمی اردو ڈے کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خان نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر 7 کتابوں کے علاوہ عالمی یومِ اردو کا خصوصی مجلّہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس سال کے مجلّہ کا خصوصی گوشہ منشی پریم چند پر مشتمل ہے۔ عالمی اردو ڈے کے موقعے پر امسال بھی اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دینے کے اعتراف میں متعدد افراد کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس مرتبہ ایوارڈ یافتگان میں اوم پرکاش سونی (محفوظ الرحمٰن عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے صحافت)، ڈاکٹر سید فضل اللہ قادری (قاضی عدیل عباسی عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے علمی وطبی خدمات)، خیال انصاری (مولوی اسماعیل میرٹھی عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے ادب اطفال)، ڈاکٹر شمس کمال انجم (علامہ سید سلیمان ندوی عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے ترجمہ نگاری)، فریدہ رحمت اللہ خان (نورجہاں ثروت عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے فروغ ادب)، عندلیب اختر (عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے ڈیجیٹل میڈیا)، ڈاکٹر یامین انصاری (عثمان فارقلیط عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے صحافت)، فرمان چودھری (عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے الیکٹرانک میڈیا)، ڈاکٹر شمشاد علی (ڈاکٹر ذاکر حسین عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے درس و تدریس)، نریندر کمار (فدا علی یوم اردو ایوارڈ برائے فوٹوگرافی)، جے چند (منشی پریم چند عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے ہندی صحافت)، منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز (منشی نول کشور یوم اردو ایوارڈ برائے پبلشنگ) شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 نومبر 2019

رسم اجرا:

دی گیم آف ووٹ

نئی دھلی: پروفیسر فرحت بصیر خان کی تحریر کردہ کتاب دی گیم آف ووٹ کی 16 نومبر کو رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر پروفیسر نجمہ اختر (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ)، اے سوریہ پرکاش (چیئرمین، پرسار بھارتی)، ڈاکٹر انوراگ بترا (چیف آف ایڈیٹر ان چیف، بزنس ورلڈ اینڈ ایکسچینج فار میڈیا)، پروفیسر بسواجیت واس (ڈائرکٹر، سینٹر برائے میڈیا اینڈ گورننس، جے ایم آئی) جیسی شخصیات پروگرام میں موجود تھیں۔ گیم آف ووٹس ہندوستانی سیاست اور انتخابات کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ کتاب ان تمام لوگوں کو پڑھنی چاہیے جو ہندوستانی سیاست اور انتخابات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پروفیسر نجمہ اختر نے کہا کہ پروفیسر خان کی کتاب 'دی گیم آف ووٹس' انتہائی مفید کتاب ہے۔ انھوں نے کہا کتاب تحقیق کی حدود کو آگے بڑھاتی ہے، یہ صرف سیاست دانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پریکٹیشنرز، ماہرین تعلیم، طلبہ اور محققین کے لیے بھی کارآمد رہے گی۔ مصنف فرحت بصیر خان نے کہا کہ یہ کتاب اس لیے لکھی ہے کیونکہ انتخابی حکمت عملی اور سیاسی مہم بہت پیچیدہ ہوگئی ہے، اس کے ذریعے معلوم ہوسکے گا کہ کس طرح ہندوستان میں دو اہم سیاسی جماعتوں نے اپنی حکمت عملی بنائی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2019

'ڈکشنری آف قرآن' کا اجرا

ڈکشنری آف قرآن

دیو بند: ممبر پارلیمنٹ حاجی فضل الرحمٰن نے کہا کہ قرآن پاک مسلمانوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ تمام انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے اچھی زندگی گزارنے اور اچھی راہ پر چلنے، غلط راستے سے بچنے کی ہدایت والی کتاب ہے، حاجی فضل الرحمٰن نے ان خیالات کا اظہار سہارنپور کے اسلامیہ انٹر کالج میں کمیٹی کے چیئرمین مختار خان کی جانب سے تصنیف کی گئی کتاب ڈکشنری آف قرآن کی رسم اجرا کے پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کیا، انھوں نے کہا کہ قرآن پاک صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہر مذہب، ذات اور ہر برادری کے لیے ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر مذہب کی مذہبی کتابیں اور گرنتھ انسانیت کا درس دیتی ہیں، اور نجات کی راہ دکھاتی ہیں، انھوں نے کہا کہ اس فریضہ سے مسلمانوں کو غفلت نہیں برتنی چاہیے، ڈکشنری آف لا قرآن کو طلبہ کے لیے قرآن سمجھنے میں مددگار ہوگی، اگنو کے وائس چانسلر بشیر احمد خان نے کتاب کے بارے میں کہا کہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہر عام آدمی قرآن پاک کا صحیح مطلب نہیں سمجھ پاتا، اور قرآن کو صرف سبق کے لیے ہی پڑھتا ہے، جبکہ قرآن پاک کا اصل مقصد اس کو ترجمہ کے ساتھ پڑھ کر اس میں تحریر کی گئی باتوں سے فائدہ حاصل کرنے میں ہے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 نومبر 2019

'تہذیب الاخلاق' کا اقبال نمبر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نائب شیخ الجامعہ پروفیسر اختر حسیب نے پیر کو خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن کے کانفرنس ہال میں ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے خصوصی شمارہ اقبال نمبر کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر ایک علمی نشست منعقد کی گئی جس میں مختلف دانشوروں نے علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید اور علی گڑھ کے ساتھ ان کے تعلق اور جذباتی لگاؤ کو واضح کیا اور 'تہذیب الاخلاق' کے اقبال نمبر کو سراہتے ہوئے اسے وقت کی ضرورت قرار دیا۔ نائب شیخ الجامعہ پروفیسر اختر حسیب نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ نقد و ستائش دونوں کسی بھی علمی تحقیق کا حصہ ہوتے ہیں، جن سے فکر کے نئے گوشے وا ہوتے ہیں، اصلاح و بہتری کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور کئی پہلوؤں پر غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ پروفیسر اختر حسیب نے کہا کہ اردو مشرقی تہذیب کا خاص حصہ ہے اور ہمارے مفکرین و دانشوروں نے ماضی میں جو علمی و فکری خدمات انجام دی ہیں انھیں نوجوان نسلوں تک زیادہ سے زیادہ پہنچانا چاہیے۔ تہذیب الاخلاق کے سابق مدیر پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اقبال نمبر کے مشمولات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اقبال ایک فلسفی، مفکر اور انقلابی پیغام دینے والے شاعر تھے۔ انھوں نے ایسے اشاروں، تشبیہوں اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے جو اپنے اندر نئے معانی کے امکانات سموئے ہوئے ہیں۔ ان کا خودی کا فلسفہ دراصل عرفانِ ذات ہے جس میں عشق، حرکت اور جمال و جلال ہے۔ مدیر 'تہذیب الاخلاق' پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے اقبال نمبر کے امتیازات بیان کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کا فکر سرسید سے گہرا رشتہ تھا جس کا اندازہ ان کی تحریر کردہ سرسید کی 'لوحِ تربت'، سرسید کے پوتے راس مسعود کے لیے لکھی گئی طویل نظم 'مسعود مرحوم' اور 'طلبۂ علی گڑھ کالم کے نام' جیسی نظموں سے آسانی سے ہو جاتا ہے۔ یہ تینوں شعری کلام اقبال نمبر کی ابتدا میں ہی شامل کیے گئے ہیں۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 نومبر 2019

ادھورے خواب

پٹنہ: جب اچھا تخلیق کار اپنے بے بہا بہادر آتشیں محسوسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے تو وہاں روایتی اسلوب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ طلعت پروین کی نثری نظموں میں اکثر یہ حیران کرنے والی روشنی یکا یک چمک جاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار بہار اردو اکادمی میں علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام معروف شاعرہ طلعت پروین کی نظموں کا مجموعہ ادھورے خواب کی تقریب اجرا کی صدارت کرتے ہوئے اردو کے معروف نقاد و شاعر پروفیسر علیم اللہ حالی کر رہے تھے۔ پاٹلی پترا یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر منظر اعجاز نے اس کتاب کے حوالے سے کہا کہ جس طرح اقبال کے خیال میں وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات کا رنگ اسی طرح طلعت پروین کے خیال میں مرد کے وجود کے بغیر عورت ادھوری ہے اور اس کے خواب ادھورے ہیں۔ بہار اردو کے سابق سکریٹری و معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے کہا کہ طلعت پروین کے سارے خواب ان کے کردار کے ہیں جسے طلعت پروین نے اپنی نظموں کا کردار بنایا ہے۔ طلعت پروین اپنے کرداروں کو لے کر کافی الجھی بھی ہیں۔ ان کے یہ ادھورے خواب انھیں کرداروں پر مبنی ہیں۔ گورنمنٹ اردو لائبریری کے چیئرمین ارشد فیروز نے کہا کہ طلعت کی نظموں میں عورت، ماں، بیٹی، لڑکی، عوام پر مبنی جذبات شامل ہیں۔ ان میں موجودہ حالات کا اظہار بھی شامل ہے۔ سابق ڈسٹرکٹ جج اکبر رضا جمشید نے کہا کہ ان کے یہاں خواب ہمیشہ ادھورے ہی ہوتے ہیں۔ کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر زین رامش نے کہا کہ معاصر اردو شاعرات کے درمیان طلعت پروین کی تشخیص اور ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے نظموں کے حوالے سے انسانی جبلت کے ان پہلوؤں کو متشکل کرنے کی کوشش کی ہے جو زندگی کی منفی اداکاری کے لیے مختص ہوتے ہیں۔ نظامت فرد الحسن فرد نے کی۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2019

سچ ہی تو ہے

حیدرآباد: سچ صحافت کی اصل روح ہے۔ سچ کے بغیر صحافت کا تصور بھی احمقانہ ہے۔ سچ کے راستے پر چلنے والوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ منزل تک

پہنچ کر رہتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مختلف دانشوروں نے ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کے ادارتی مضامین کا مجموعہ 'سچ ہی تو ہے' کی تقریب رسم رونمائی کے موقعے پر کیا۔ میڈیا پلس آڈیٹوریم میں منعقدہ اس باوقار تقریب میں ڈائرکٹر این سی پی یو ایل ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور کتاب کی رسم اجرا انجام دی۔ جناب رحیم الدین انصاری صدر نشین تلنگانہ اردو اکادمی نے صدارت کی۔ مہمانان اعزازی کے طور پر جناب احمد ابوسعید خادم قرآن، جناب افتخار شریف فرسٹ اوور سیز سٹیزن شکاگو، پروفیسر فاروق بخشی صدر تلنگانہ پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن، ڈاکٹر محمد افتخار الدین ڈائرکٹر میسکو الیف، ڈاکٹر حافظ احسن بن محمد الحموی امام وخطیب شاہی مسجد باغ عامہ، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین سابق وائس پرنسپل وصدر شعبہ اردو آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی، محمد شجاعت علی ریٹائرڈ جوائنٹ ڈائرکٹر و دور درشن نیوز موجود تھے۔ جبکہ پدم شری مجتبیٰ حسین، تسنیم جوہر، رفیعہ نوشین، نفیسہ خان، رفیع الدین فاروقی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، باقر مرزا، حافظ جیلانی صاحب کے علاوہ کئی سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کو ان کے ادارتی مضامین کے مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت اپنے اداریوں کے لیے پہچانی جاتی ہے۔ اس کا وقار بلند ہے۔ انھوں نے حیدرآباد کو این سی پی یو ایل کا دل قرار دیا اور اعلان کیا کہ وہ اس شہر کے شعرا، ادیبوں اور اردو سے وابستہ ہستیوں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں اور کریں گے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 نومبر 2019

ہندوستان معیشت میں ساختی تبدیلی اور توانائی کے استعمال کی پیمائش: ایک ان پٹ آؤٹ پٹ نقطہ نظر

نئی دھلی: پروفیسر شاہد احمد، پروفیسر شعبہ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ادارہ کے ہی ایک سابق طالب علم ڈاکٹر انجلی ٹنڈن کی مشترکہ کوششوں سے منصۂ شہود پر آنے والی کتاب 'ہندوستانی معیشت میں ساختی تبدیلی اور توانائی کے استعمال کی پیمائش: ایک ان پٹ آؤٹ پٹ نقطۂ نظر' کا آج آئی ایس آئی ڈی میں ناگیش کمار، ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ویسٹ ایشیا (ایس ایس ڈبلیو اے) کے ڈائرکٹر اور اقوام متحدہ کے اقتصادی اور سماجی کمیشن برائے ایشیا اور بحرالکاہل (SSWA-UNESCAP) کے صدر کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب 'پائیدار ترقیاتی اہداف کے نفاذ کی حمایت میں پالیسی تجزیہ کے عنوان سے منعقدہ ایک ورکشاپ کے افتتاحی سیشن میں جاری کی گئی۔ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر ٹی سی اے اننت، سابق چیف شماریات دان، حکومت ہند نے لکھا ہے اور اسے بک ویل پبلشرز نے لکھا ہے۔ پروفیسر احمد نے بین الاقوامی تجارت، سرمایہ کاری اور ترقی کے شعبوں میں پہلے سے ہی 5 کتابیں رقم کی ہیں۔ انھوں نے قومی اور بین الاقوامی جرائد میں کثیر الجہتی تجارتی گفت وشنید، علاقائی اقتصادی تعاون اور جنوب تعاون جیسے مسائل پر 94 تحقیقی مقالات تحریر کیے ہیں۔ پروفیسر احمد بطور سینئر ماہر معاشیات اقوام متحدہ کی تجارت اور ترقی کے کانفرنس (UNCTAD) میں بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 نومبر 2019

گلشن کھنہ اور چندر بھان خیال نمبر کا اجرا

سرونج: 30 نومبر کو انتساب پبلی کیشنز کی جانب سے 'گلشن کھنہ' نمبر اور 'چندر بھان خیال' نمبر کا اجرا بڑی ہی دھوم دھام سے کیا گیا۔ پہلے اجلاس میں گلشن کھنہ کی

شخصیت اور فن کو سیمینار میں تمام مقالوں کے ذریعے پیش کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر مختار شمیم نے کی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے حیدرآباد کے ناظم الدین منور نے شرکت کی۔ اس کے بعد دوسرے اجلاس میں چندر بھان خیال نمبر کا اجرا کیا گیا، جس کی صدارت بھی پروفیسر مختار شمیم نے ہی انجام دی اور دونوں اجلاس کی نظامت محمود ملک نے کی۔ ڈاکٹر مہتاب عالم اور محمود ملک نے چندر بھان خیال کی مشہور نظم 'لولاک' پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 'لولاک' میں انھوں نے حضور اکرم کی زندگی کو نظموں میں ڈھالا ہے اور اس کارنامے نے ادبی دنیا میں بہت شہرت حاصل کی۔ 'انتساب' کے دونوں خاص نمبروں کو کتابی شکل بھی دی گئی۔ آخر میں صد بھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: استوتی اگروال، سرونج، 1 دسمبر 2019

'ازہارِ مدینہ' اور 'مقالاتِ فاروقی'

پٹنہ: بزم انقلاب میں پیر کو پروفیسر طلحہ رضوی برق اور دیگر معززین کے دست مبارک سے پروفیسر فاروق احمد صدیقی کے مجموعہ کلام 'ازہارِ مدینہ' اور ان کے دینی وعلمی مضامین کے مجموعہ 'مقالاتِ فاروقی' کی رسم اجرا ادا کی گئی۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا قمرالزماں مصباحی نے کہا کہ ہم نے ان کتابوں کو بہت ہی غور سے پڑھا ہے اور پایا ہے کہ ان میں ہم جیسوں کے لیے بہت روشنی ہے جبکہ ڈاکٹر امجد رضا امجد نے کہا کہ پروفیسر فاروق احمد صدیقی جتنے بڑے عالم، اسکالر، نقاد، محقق اور شاعر ہیں اس سے بھی اچھے انسان اور باعمل انسان ہیں۔ میں نے ان کو سفر وحضر میں یکساں پایا۔ پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اس موقعے پر مصنف موصوف سے اپنی نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط رفاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ فاروق صدیقی اسم بامسمیٰ شخصیت ہیں۔ ان کی شاعری اور ان کے مضامین ومقالات میں بھی یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں، پوری قوت کے ساتھ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے حق کہتے ہیں اور جس کو باطل سمجھتے ہیں، اس کو باطل کہنے میں کوئی دریغ نہیں کرتے۔ اس سے قبل کتابوں اور مصنف کا تعارف پیش کرتے ہوئے احمد جاوید نے کہا کہ پروفیسر فاروقی احمد صدیقی اردو کے مشہور استاد، ناقد ومحقق، کہنہ مشق شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2019

سہ ماہی 'رنگ' کا گوشہ نصیر افسر

رانچی: 17 نومبر کو رانچی اسٹیشن روڈ پر واقع پربھات پرکاشن کے ہال میں سہ ماہی 'رنگ' کے گوشۂ نصیر افسر کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب اجرا کی صدارت معروف بزرگ شاعر حیرت فرخ آبادی نے کی جب کہ قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ جھارکھنڈ ہائی کورٹ کے سابق جسٹس وکرم آدتیہ پرساد جھارکھنڈ انجمن ترقی اردو کے صدر پروفیسر ابوذر عثمانی اور رانچی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر احمد سجاد مہمانِ اعزازی تھے۔ تقریب کی نظامت نصیر افسر نے خود کی۔ سبھی مہمانان کے ہاتھوں سے سہ ماہی 'رنگ' کے گوشۂ نصیر افسر کی رونمائی کی گئی۔ تمام مہمانان نے اپنے اپنے خوبصورت انداز بیان سے سہ ماہی 'رنگ' کے گوشۂ نصیر افسر اور صاحب گوشہ کے ساتھ اس کے ہردلعزیز مدیر جناب شان بھارتی کی بھی پذیرائی کی کہ انھوں نے بڑی جاں فشانی سے یہ خوبصورت گوشہ نکال کر ایک بڑا کام کیا ہے۔ تقریب کے صدر جناب حیرت فرخ آبادی نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ

صاحب گوشہ سے ان کے چار دہائیوں سے بھی زیادہ بڑے اچھے مراسم رہے ہیں۔ حاضرین محفل کی فرمائش پر انھوں نے اپنی بہترین غزلوں سے سامعین کو نوازا۔ پربھات پرکاش کے آفس انچارج جناب راجیش شرما کے اچانک دہلی آفس کی نشست میں شرکت کرنے جانے کی وجہ سے صاحب گوشہ جناب نصیر افسر نے تمام خصوصی، اعزازی مہمانان اور محفل کے ساتھ ساتھ سبھی سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'الحیات' رانچی، 19 نومبر 2019

وفیات:

شوکت کیفی

ممبئی: تھیٹر کی دنیا کی معروف اداکارہ، مشہور شاعر کیفی اعظمی کی بیوہ اور اداکارہ شبانہ اعظمی کی والدہ شوکت کیفی کا 22 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 91 سال کی تھیں اور کافی

عرصے سے علیل تھیں۔ انھوں نے تھیٹر کے ساتھ ساتھ فلموں میں بھی اپنی اداکاری کا لوہا منوایا تھا۔ وہ ملک کے مشہور تھیٹر گروپ اپٹا کے بانی ممبران میں سے ایک تھیں۔ شوکت کیفی نے اپنے شوہر کیفی اعظمی کے ساتھ مل کر اس تھیٹر گروپ کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ اس کے ذریعے کھیلے جانے والے متعدد ڈراموں میں مختلف رول بھی نبھائے۔ انھوں نے اپٹا کے لیے چند اہم ڈرامے تحریر بھی کیے تھے۔ شوکت کیفی تھیٹر کے ساتھ ساتھ فلموں میں بھی سرگرم رہیں۔ تھیٹر اور فلمی حلقوں میں انھیں 'شوکت آپا' کے نام سے شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے متوازی سنیما کہلانے والی بامعنی فلموں میں اہم کردار ادا کیے جن میں امراؤ جان میں ادا کیا گیا ان کا رول یادگار ہے جبکہ بازار اور گرم ہوا جیسی فلموں میں بھی ان کے کردار کو کافی پسند کیا گیا۔ چونکہ ان کا تعلق ممتاز ادبی گھرانے سے تھا اور ان کے شوہر کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے اور مشہور شاعر بھی، اسی لیے زبان و ادب پر ان کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ وہ خود ایک منجھی ہوئی قلمکار تھیں جن کے قلم نے سماجی اہمیت کے حامل متعدد ڈراموں کو تخلیق کیا۔ انھوں نے ممبئی میں اپنی جدوجہد کے دنوں کے بارے میں اپنی آپ بیتی بھی تحریر کی تھی جو کافی مقبول ہوئی۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا بابا اعظمی (معروف سنیما فوٹوگرافر) اور مشہور اداکارہ شبانہ اعظمی ہیں۔ ان کی تدفین سنیچر بعد نماز ظہر چار بنگلہ قبرستان ورسوا میں عمل میں آئی جہاں کیفی صاحب مدفون ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2019

پروفیسر ناز قادری

مظفرپور: معروف ناقد اور ادیب و شاعر پروفیسر ناز قادری کا طویل علالت کے بعد 13 نومبر کو ان کے مکان

قاری منزل چرچ روڈ چندوارہ میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی پہلی نماز جنازہ 15 نومبر بروز جمعہ کو دس بجے دن میں مقری مسجد میں ادا کی گئی۔ اس کے بعد ان کا جنازہ ان کے آبائی گاؤں بروراج میں بعد نماز جمعہ نماز جنازہ کے بعد ان کو گاؤں کے ہی آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم کے انتقال سے ضلع ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر غم کا ماحول قائم ہوگیا۔ مرحوم کا آبائی وطن مظفرپور کے مغربی سمت کے بروراج اسمبلی حلقہ کے بروراج گاؤں میں ہے، جہاں مولوی لیاقت حسین اور بی رشیدۃ النسا کے گھر 9 دسمبر 1940 میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کا پورا نام محی الدین انصاری ناز تھا، بعد میں جب آپ نے شاعری شروع کی تو پھر ناز قادری کے تخلص سے ایک الگ شناخت بنائی۔ گھر میں تعلیمی ماحول تھا اور ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی، اس کے بعد آپ نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں ایم اے کیا، پھر پی ایچ ڈی اور ڈی لیٹ کرنے کے بعد اکتوبر 1969 سے جیوچھ کالج موتی پور سے ملازمت کی ابتدا کی اور ترقی کرتے کرتے بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے جولائی 2004 میں سبکدوش ہوئے۔ آپ پی جی ریسرچ کونسل اور بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین، سنڈیکیٹ ممبر، وشوبھارتی شانتی نکیتن کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر، بہار اردو اکادمی و گورکھپور یونیورسٹی کے ممبر، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد کے بورڈ ایکسپرٹس کے ممبر و گیارہواں پنج سالہ منصوبہ نئی دہلی کے ایکسپرٹس کمیٹی میں شامل رہے۔ وہیں آپ کو بہار و بنگال اور اترپردیش کی اردو اکادمی کی جانب سے متعدد مرتبہ انعامات سے نوازا گیا۔ آپ ایک بہترین ناقد، ادیب اور شاعر کے ساتھ ساتھ اچھے افسانہ نگار و محقق کی حیثیت سے ایک منفرد شناخت رکھتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں سحرالبیان ایک مطالعہ، دریافت، اردو ناول کا سفر، زاویے ہیں۔ نعتوں کے مجموعے کے طور پر چراغ حرا، سلسبیل نور اور غزلوں کے مجموعے صحرا ایک بوند، رنگ شکستہ لمحوں کی صدا شامل ہیں۔ اپنے پیچھے پانچ بیٹے اور تین بیٹیوں سمیت نواسے نواسی، پوتے پوتیوں سے بھرا پورا خانوادہ چھوڑا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی 14 نومبر 2019

حفیظ نعمانی

لکھنؤ: کہنہ مشق صحافی حفیظ نعمانی طویل بیماری کے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ حفیظ نعمانی آخری دم تک اخبارات بالخصوص روزنامہ 'اودھ نامہ' کے لیے پابندی سے مضامین لکھتے رہے۔ وہ 'اودھ نامہ' کے چیف ایڈیٹوریل ایڈوائزر اور سرپرست بھی تھے۔ حفیظ نعمانی کئی دہائیوں سے عریضۂ قلب میں مبتلا تھے مگر انھوں نے

تصنیف و تالیف سے منھ نہیں موڑا، اور یہی وجہ تھی کہ وہ ملک کے دیگر رسائل اور اخبارات ان کے مضامین پابندی سے شائع کرتے تھے۔ حفیظ نعمانی نے کتابیں بھی تحریر کیں اور ان گنت بیش بہا مضامین بھی سپرد قلم کیے، حفیظ نعمانی کا تعلق سنبھل کے علمی اور دینی خانوادے سے تھا اور انھوں نے خود بھی دین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ حفیظ نعمانی متعدد دینی اداروں سے بھی وابستہ رہے اور ان تنظیموں اور اداروں کی انھوں نے رہنمائی بھی کی۔ حفیظ نعمانی جو گزشتہ ماہ سے علیل چل رہے تھے (8 دسمبر) 9 بج کر 40 منٹ پر لکھنؤ کے سہارا اسپتال میں 90 سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ گزشتہ دس پندرہ روز سے ان کی طبیعت ناساز تھی۔ ابتدا میں ڈاکٹر کوثر عثمان کے زیر علاج رہے۔ اس کے بعد سہارا اسپتال میں داخل کیے گئے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ دیگر عوارض بڑھتے چلے گئے۔ حفیظ نعمانی کا آبائی وطن سنبھل تھا۔ وہ محدث

کبیر مولانا منظور نعمانی کے صاحبزادے تھے ایک مدت سے وہ لکھنؤ میں اس طرح آباد تھے کہ اسی مٹی کا حصہ بن گئے۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ حفیظ نعمانی کا انتقال لکھنؤ کی صحافتی اور ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ حفیظ نعمانی کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے قلم سے ادب اور صحافت دونوں کی آبیاری کی۔ ابتدائے عمر سے ہی اردو صحافت سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔ اور انھوں نے مختلف اخباروں میں کام بھی کیا ہے۔ 1955 میں روزنامہ تحریک شروع کیا۔ اسے ان کی صحافت کی پہلی تربیت گاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد 1962 سے 1968 تک ندائے ملت نکالا۔ ندائے ملت کے بعد عزائم کے ادارتی بورڈ میں رہے۔ صحافت سے تعلق نے اس کے بعد ان دنوں تک پہنچا دیا جہاں کم و بیش دس برس تک صحافتی خدمات انجام دی۔ اس کے بعد جدید عمل سے وابستہ رہے مگر یہ عرصہ بہت زیادہ دنوں تک نہیں رہا۔ کم و بیش پانچ برس تک اس سے وابستہ رہے۔ حفیظ نعمانی صحافت کی وجہ سے پابند سلاسل بھی رہے۔ روزنامہ 'ندائے ملت' کا مسلم یونیورسٹی نمبر نکالنے کی پاداش میں انھیں جیل کی سزا کاٹنی پڑی مگر اس مصیبت کو انھوں نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔ ندائے ملت کا یہ شمارہ اگست 1965 کا تھا۔ حفیظ نعمانی بطور کالم نگار بھی ہند و پاک میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ بجھے دیوں کی قطار کی (مرتبہ اویس سنبھلی) مقبول عام ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جیل کی روداد لکھی جو 'روداد قفس' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ ان کے کالموں کا ایک انتخاب 'قلم کا سپاہی' کے نام سے آچکا ہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 9 دسمبر 2019

عابد کرہانی

نئی دهلی: مشہور شاعر مرحوم شمیم کرہانی کے منجھلے بیٹے عابد کرہانی کا 23 نومبر کو گروگرام کے میدانتا اسپتال میں انتقال ہوگیا۔

واضح ہو کہ پچھلے مہینے ان کے جگر کی پیوند کاری (لیور ٹرانسپلانٹ) کا کامیاب آپریشن ہوا تھا لیکن بعد میں گردے اور دوسرے اعضا کے متاثر ہوجانے کے باعث وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوسکے۔ ان کے جسد خاکی کو میدانتا اسپتال سے جور باغ میں واقع درگاہ شاہ مرداں لایا گیا اور میت کی تدفین بارہ بجے دہلی گیٹ کے قبرستان میں کی گئی۔ مرحوم عابد کرہانی انڈین انفارمیشن سروسز میں ایک آفیسر تھے۔ وہ محکمہ اطلاعات ونشریات میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اس دوران ان کو کافی مدت تک ماہنامہ آجکل (اردو) کی ادارت کی ذمہ داری بھی نبھانا پڑی اور بعد میں وہ پریس انفارمیشن بیورو میں شعبۂ اردو کے سربراہ بھی رہے مگر کچھ برس قبل وہ ریٹائرڈ ہوگئے تھے۔ مرحوم عابد کرہانی ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ملنسار شخص تھے۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بڑے بھائی مراد کرہانی، چھوٹے بھائی سلمان کرہانی اور اہلیہ ناہید کرہانی کے علاوہ بہت سے اعزا ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2019

ناظر صدیقی

کانپور: اردو کے ایک اہم اور کہنہ مشق شاعر ناظر صدیقی کا چند دن کی علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ پر 3 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ ناظر صدیقی کلاسیکی روایت کے پاسدار تھے۔

ان کا شمار اردو کے ممتاز شاعروں میں ہوتا تھا۔ ان کی ولادت اگست 1936 میں ہوئی تھی۔ شاعری کے آغاز کے بعد بہت جلد انھوں نے ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرلی۔ ناظر صدیقی کے کلام کے اب تک کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں جن میں سنگ احساس، آئینۂ احساس، دشت احساس اور خاکستر احساس کو ادبی حلقہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے انتقال کی خبر نے کانپور کی پوری ادبی فضا کو غمناک کردیا۔ ان کی تدفین کانپور میں ہی عمل میں آئی جس میں ادیب و دانشور حضرات کے علاوہ شہر کی دیگر شخصیتیں بھی شریک رہیں۔ ان کے ورثا میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 4 دسمبر 2019

حسن نواب حسن

پٹنه: دبستان عظیم آباد کے مشہور ومعروف شاعر حسن نواب حسن کا 7 دسمبر کو مظفر پور میں دل کا دورہ پڑنے سے اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 80 برس تھی۔

پسماندگان میں ایک بیٹا اور پوتا پوتی، نواسے اور نواسیاں ہیں۔ خاندانی ذرائع کے مطابق چند دنوں قبل وہ مظفر پور اپنے نواسے کی شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اچانک رات کے قریب دو بجے دل کا دورہ پڑا، ہاسپٹل لے جایا گیا لیکن جانبر نہ ہوسکے اور انتقال کرگئے۔ وہ 2 نومبر 1940 کو پیدا ہوئے تھے۔ سلسلہ نسب ہمایوں کے قرابت دار داؤد علی خاں کی وساطت سے امام علی رضا سے ملتا ہے۔ والد سرکاری وکیل تھے مگر ذریعہ معاش بنیادی طور پر زمینداری تھا۔ کثیر الاولاد بھی تھے۔ اس لیے زمینداری کے خاتمہ کے بعد وہ طرز رہائش باقی نہ رہ سکا جو دادا ارشاد حسین کے زمانے میں تھا۔ مسٹر حسن پٹنہ کے علاوہ گیا کی متعدد ادبی، علمی اور سماجی انجمنوں کی سرپرستی کرتے ہوئے بے حد فعال رہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب سے اپنا رشتہ ہمیشہ قائم رکھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اردو زبان و ادب کے تعلق سے منعقد ہونے والے سمینار و پروگرام کی زینت بنتے رہے۔ حسن نواب حسن قادر الکلام شاعر تھے۔ غزلوں کے مقابلے نظموں میں ان کی فنی صلاحیت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں فکر کی ندرت، تخیلات کی بلندی، ہیئت کی پابندی اور اوزان وقافیہ میں ڈھلی شاعری دلوں پر دستک دیتی ہے۔ ان کی شاہکار نظموں میں بہار نامہ، پانی اور آنسو، بیٹی کا مقام، ماں، آگ، زخمی پرندہ، ایک لاوارث گونگی لڑکی، مختلف رنگوں کے سانپ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ معاصر شعرا کے درمیان انھوں نے اپنی منفرد پہچان بنائی۔ یہی وجہ ہے ان کے معاصرین بھی ان کے قدرداں رہے ہیں۔ حسن نواب نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کا کلام تواتر کے ساتھ ہندوپاک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 8 دسمبر 2019

شفیع جاوید

پٹنہ: اردو کے معروف ومعتبر افسانہ نگار شفیع جاوید کا دل کا شدید دورہ پڑنے کی وجہ سے 12 دسمبر کو شب انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 84 برس کے تھے۔ وہ ایک لمبے عرصے سے صاحب فراش تھے۔ بعد نماز مغرب بعد ہارون نگر سیکٹر دو کی بڑی مسجد میں نماز جنازہ کے بعد حاجی حرمین پھلواری شریف میں تدفین ہوئی۔ شفیع جاوید کے انتقال سے ادبی دنیا بے حد سوگوار ہے۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے کہا کہ ترقی پسندی کے آخری دور اور جدید افسانہ نگاروں کے پہلے قبیلے کی جو مشترک نسل تھی، شفیع جاوید اسی سے تعلق رکھتے تھے۔ چھ دہائیوں سے زیادہ زمانے تک وہ لکھتے رہے مگر ضبط اور وہ پوشیدہ فن کے پرستار تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر اور لفظوں سے زیادہ سرگوشیوں میں اپنے معنی پیوست کر دینے کے مشتاق تھے۔ لفظوں میں معنی سے زیادہ احساس اور احساس سے زیادہ حزن و ملال اور پھر سب کے اوپر پراسرار کیف کی باریک رِدا ڈال دینا جس سے افسانے میں زندگی اور موت، خوشی اور غم، حقیت اور گمان اور جانی یا انجانی دنیاؤں کا اتصال پیدا ہوجائے۔ یہ عجیب وغریب فن تھا۔ ایسا لگتا ہے، یہ فن شفیع جاوید پر ہی اپنے خاتمے کو پہنچا۔ بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ نصف درجن افسانوی مجموعے کے خالق صوفیانہ مزاج کے حامی اور انفارمیشن اور پبلک ریلیشنز کے سابق ڈائرکٹر شفیع جاوید اپنے ہم عصروں میں آخری کڑی تھے۔ معروف افسانہ نگار عبدالصمد نے کہا کہ ان کے انتقال سے اردو افسانہ نگاری کی دنیا کا آخری بڑا فنکار رخصت ہوگیا۔ ان کے جانے سے ایک ایسے عہد کا خاتمہ ہوگیا جو زبان و بیان اور فن کے دیگر لوازمات مقدم تھے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ شفیع جاوید کا سانحۂ ارتحال ادبی وعلمی دنیا کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ ان کے انتقال سے دبستان عظیم آباد ایک بڑے فنکار اور فکشن نگار سے محروم ہوگیا۔ شفیع جاوید دبستان عظیم آباد کی ادبی روایت کی یادگار تھے۔ انھوں نے اپنی نادر ونایاب تخلیقات سے ادبی سرمایہ کو افتخار بنایا۔ ان کے انتقال پر اظہار تعزیت کرنے والوں میں پروفیسر اعجاز علی ارشد، شفیع مشہدی، ڈاکٹر قاسم خورشید، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت (بہار چیپٹر) کے صدر و سابق وزیر شائل نبی، پروفیسر علیم اللہ حالی، اردو کونسل ہند کے ناظم انوارالہدیٰ، علمی مجلس بہار کے جنرل سکریٹری پرویز عالم، بزم حفیظ بنارسی کے کنوینر مینش کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 دسمبر 2019

سید قائم مہدی ساحر لکھنوی

کراچی: برصغیر ہند و پاک کے علمی خانوادہ 'خاندان اجتہاد' کے چشم و چراغ مشہور ومقبول مرثیہ گو شاعر ساحر لکھنوی کا طویل علالت کے بعد کراچی میں 25 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ ساحر لکھنوی کی پیدائش 5 ستمبر 1931 کو کراچی میں ہوئی تھی جب ان کے والدین کربلائے معلیٰ و دیگر شعائر اللہ کی زیارت کے سفر پر تھے۔ ساحر لکھنوی کا تعلق مجدد شریعت سید دلدار علی غفرانمآب کے چھوٹے بیٹے سید العلما مولانا سید حسین علیین مکاں کی نسل سے تھا۔ وہ نواب سید اصغر حسین فاخر لکھنوی کے پرپوتے اور نواب سید اختر حسین مصور لکھنوی کے فرزند تھے۔ ساحر لکھنوی کے نانا سید محمد ذکی ہاتف لکھنوی بھی خود ایک مشہور شاعر تھے۔ ساحر لکھنوی نے دنیاوی تعلیم میں ایم اے، ایل ایل بی، ڈی آئی ایل ایل کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ساحر لکھنوی ایک بین الاقوامی صنعتی ادارے میں پرسنل اینڈ ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے 1993 تک مصروف کار رہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا سلام سے کی، غزل ساتھ ساتھ چلتی رہی جسے انھوں نے جلد ہی ترک کر دیا اور انتقال سے قبل تک انھوں نے قصیدہ و منقبت، سلام و رباعیات، مرثیہ گوئی اور تاریخ گوئی وغیرہ پر توجہ دی۔ ان کے پسماندگان میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ساحر لکھنوی کا پہلا مرثیہ 'مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک' پہلی بار شائع ہوا جس میں انھوں نے مرثیہ کی تاریخ کو نظم کیا۔ ان کی متعدد مطبوعات نے مقبولیت حاصل کی جن میں 'علم اور علما، فقہ و شمشیر، آیات درد، صحیفۂ مدحت، ایمانی شہ پارے، فن تاریخ گوئی کا تنقیدی جائزہ، یقین کامل، احساس غم، لہورنگ صحرا، خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا لکھنؤ سے ہی کی تھی۔ انھوں نے حسینی شاعر فضل نقوی کو اپنا کلام بغرض اصلاح دکھانا شروع کیا۔ ساحر لکھنوی کا تعلق چونکہ علمی خانوادے سے تھا اس لیے ان کو شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے میں دیر نہ لگی اور بہت جلد وہ رثائی ادب کے فلک پر چھاگئے۔ انھوں نے سیکڑوں مراثی نظم کیے اور متعدد کتابوں کی تصنیف کی۔ بعد نماز مغرب مسجد خیرالعمل میں ان کی نماز جنازہ ہوئی اور کراچی کے وادیٔ حسین قبرستان میں تدفین ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 نومبر 2019

رفیع سرسوی

امروہہ: معروف اور مقبول شاعر سید رفیع الحسن رفیع سرسوی کے اچانک انتقال پر ملال سے شہر کے ادبی حلقوں میں کافی اداسی ہے۔ 24 نومبر کو رفیع سرسوی کا دفن درگاہ عالیہ حضرت حسین شرف الدین شاہ ولایت میں ہوا جس میں امروہہ، سرسی، سانکھنی، نوگاواں سادات اور دہلی سے بڑی تعداد میں لوگوں نے جنازے میں شرکت کی اور ان کو نم آنکھوں سے سپردِ خاک کیا۔ رفیع سرسوی کے بعد ایک تعزیتی جلسہ ڈاکٹر مبارک امروہوی کے مکان محلّہ دربار کلاں میں منعقد ہوا جس میں مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی۔ مقررین نے کہا کہ رفیع سرسوی ایک اچھے شاعر ہی نہیں ایک اچھے انسان بھی تھے۔ سبھی سے پیار ومحبت سے پیش آتے تھے۔ نعت ومنقبت کے بہترین شاعر تھے۔ ان کے انتقال سے ادبی دنیا کو بڑا خسارہ ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 نومبر 2019

سدھیر ڈار

نئی دہلی: کارٹونسٹ سدھیر ڈار کا 26 نومبر کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 87 برس تھی۔ یہ اطلاع خاندان کے ذرائع نے دی ہے۔ الہ آباد میں پیدا ہوئے ڈار نے اپنے کیریئر کا آغاز آکاشوانی سے کیا۔ انھوں نے ریڈیو میں ایک پروگرام کے دوران اسٹیٹس مین کے ایڈیٹر کا ہی کارٹون بنا دیا تھا، جس کے بعد انھیں اخبار میں کام کرنے کا آفر ملا۔ اس کے بعد ان کے کارٹون ہندوستان ٹائمز، دی انڈی پنڈنٹ، دی پائنیر، دہلی ٹائمز، نیویارک ٹائمز سمیت متعدد اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ اس کے علاوہ وہ وزارت سیاحت وزارت خارجہ کے لیے ڈائری بناتے تھے اور انھوں نے ورلڈ بینک کے لیے بیس برسوں تک کلینڈر بھی بنایا۔ کئی ایوارڈ جیت چکے سدھیر ڈار کو ایڈیٹوریل کارٹونسٹ کی دوسری نسل کے طور پر جانا جاتا ہے۔ روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 27 نومبر 2019

الحاج شرافت حسین وزیری

دہلی: مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے امیر مولانا اصغر علی مہدی سلفی نے بھدوہی کی ممتاز و مقتدر دینی، ملی و سماجی شخصیت، معروف شاعر وادیب اور قالین تاجر الحاج شرافت حسین وزیری کے انتقال پر گہرے رنج وافسوس کا

اظہار کیا ہے اور ان کی موت کو بڑا دینی، علمی، ادبی، قومی، ملی اور جماعتی خسارہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ الحاج شرافت حسین وزیری جن کا 30 نومبر کو دہلی کے ایمس میں بعمر 87 سال انتقال ہوگیا، نہایت ہی نیک، دیندار، پرہیزگار اور خصائل حمیدہ سے متصف، پابند شرع اور نہایت ہی مخلص وغیور اور بھدوسی کے دینی وتجارتی خاندان وزیری کے سرپرست تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، جنت الفردوس کا مکین بنائے۔ پسماندگان خصوصاً صاحبزادے ارشد وزیری اور ان کے دیگر آٹھ بھائیوں، اکلوتی بیٹی، داماد، بھتیجوں، دیگر اہل خانہ اور پورے خاندان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے دیگر ذمے داران وارکین نے بھی ان کے ورثا سے اظہارِ تعزیت کیا ہے اور ان کی مغفرت و بلند درجات کے لیے دعا کی۔ ان کی تدفین بھدوسی میں انجام دی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2019

خراج عقیدت:

گوگل کا ڈوڈل کے ذریعے پروین شاکر کو خراجِ تحسین

اسلام آباد: محبت کی خوشبو شعروں میں سمونے والی پروین شاکر کی 67 ویں سالگرہ پر گوگل نے انھیں ڈوڈل کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کیا۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

عظیم شاعرہ پروین شاکر 24 نومبر 1952 کو کراچی میں پیدا ہوئیں، انھیں اردو کے منفرد لہجے کی شاعرہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی کم عرصے میں وہ شہرت حاصل ہوئی جو بہت ہی کم لوگوں کے

نصیب میں لکھی ہوتی ہے۔ انھوں نے انگلش لٹریچر اور زبان دانی میں گریجویشن کیا اور بعد میں انہی مضامین میں جامعہ کراچی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اردو ادب کی عظیم شاعرہ پروین شاکر استاد کی حیثیت سے درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہیں اور بعد ازاں سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں شعرو شاعری کا آغاز کیا، پروین سے پہلے کسی شاعرہ نے نسوانی جذبات کو اتنی نزاکت سے بیان نہیں کیا تھا۔ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو ایک انوکھے تعلق میں باندھ کر سادہ الفاظ میں نسائی انا، خواہش اور انکار کو شعر کا روپ دیا۔

بخت سے کوئی شکایت نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

ان کی شاعری میں روایت سے انکار اور بغاوت بھی نظر آتی ہے، انھوں نے اپنی شاعری میں صنف نازک کے جذبات کی تصاویر بنائیں اور اس کے دکھ اور کرب کو نظموں میں ڈھالا۔ ابتدا میں بینا کے نام سے پہچانی جانے والی شاعرہ کی پہلی کتاب 'خوشبو' 1976 میں شائع ہوئی جبکہ ان کی دیگر مشہور کتابوں میں انکار، صد برگ، خودکلامی اور کف آئینہ شامل ہیں۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ کالم نویسی بھی کی۔ 26 دسمبر 1994 کو اسلام آباد میں ایک ٹریفک حادثے میں وہ 42 سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جاملیں۔ پروین شاکر کو مداحوں سے بچھڑے کئی برس گزر چکے ہی ہیں، مگر ان کی شاعری آج بھی خوشبو کی طرح، 'کو بہ کو' پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔

مر بھی جاؤں تو کہاں، لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 نومبر 2019

علامہ مہدی اعظمی

نوگانواں سادات: ماہر عروض غلام مہدی اعظمی المعروف علامہ مہدی اعظمی کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست ہوئی۔ مشہور شاعر عباس حیدر راقم نوگانوی کے گھر ہوئی اس نشست میں ارباب ادب نے شرکت کی اور علامہ مہدی اعظمی کے فن پر گفتگو کی۔ راقم نوگانوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ مرحوم نے اردو شاعری میں جو اضافہ کیا ہے وہ آنے والی نسلوں کے لیے لائق تقلید سرمایہ قرار پائے گا۔ خاص طور پر علم عروض کے سلسلہ میں علامہ مہدی اعظمی کی شخصیت ممتاز رہی ہے۔ ان کا دیوان سرمایہ عقبیٰ ادب نوازوں سے خراجِ تحسین لے چکا ہے۔ انھوں نے جن اصناف سخن میں غیر معمولی صلاحیتوں کا منوایا ہے، ان میں قصیدہ بھی شامل ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 نومبر 2019

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر.................... بتاریخ.................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

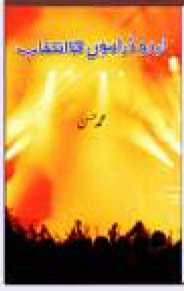

مرتب: محمد حسن

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

قومی تہذیب کا مسئلہ

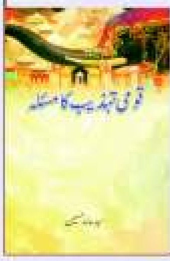

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

اردو املا

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

کلیاتِ سراج

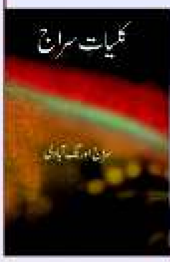

مصنف: سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 732

قیمت: 320 روپے

تفہیمات وترجیحات

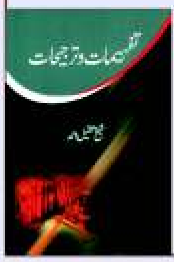

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

اردو ادب میں مضمون کا ارتقا

مصنف: سیدہ جعفر

اشاعت: 2019

صفحات: 558

قیمت: 225 روپے

INTRODUCTORY URDU VOL-I&II

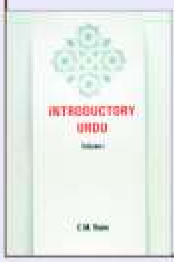

مصنف: سی ایم نعیم

پانچواں ایڈیشن: 2019

صفحات: 345 (جلد 1) 373 (جلد 2)

قیمت: 515 روپے (مکمل سیٹ)

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, January-2020, Vol.22, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/12/2019
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025